اردو شاعری میں
اسلامی تلمیحات
ڈاکٹر عطاء الرحمن صدیقی ندوی
عالمی رابطۂ ادب اسلامی
ندوۃ العلماء لکھنؤ

اردو شاعری میں

اسلامی تلمیحات

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صدیقی ندوی

باراول

۱۴۲۵ھ ——— ۲۰۰۴ء

نام کتاب: .... اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات

مصنف: .... ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صدیقی ندوی ابن مولانا ظل الرحمٰن صدیقی

کمپوزنگ: .... حامد خوشنویس (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ)

صفحات: ۶۳۸

تعداد اشاعت: .... ایک ہزار

طباعت: .... کاکوری آفسٹ پریس، لکھنؤ

قیمت: ....

(نوٹ: اس موضوع پر مصنف کو بمبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی ہے)

نیو مسجد چال روم نمبر ۴ ساتھ جیک سرکل بمبئی ۱۱

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۸۹۴ دوحہ قطر خلیج عرب

فہرست عناوین

شاعری اور اسلام

تلمیحات

اسلامی تلمیحات

قرآنی تلمیحات

انبیاء کے علاوہ دیگر قصص قرآنی کی تلمیحات

تلمیحی نظمیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب...!!

والدہ مرحومہ کی مقدس دعاؤں کے نام

محترمہ والدہ مرحومہ کی بے لوث شفقتوں محبتوں اور ان مقدس تمناؤں کے نام جو انھوں نے میری دینی تعلیم و تربیت سے وابستہ کر رکھی تھیں اور ان دعاؤں کے نام جن کی نادیدہ طاقت و قوت نے مجھے اپنے تعلیمی سفر میں قدم قدم پر کامیابیوں سے ہمکنار کیا اور مشکل وقتوں میں آج بھی ابر رحمت بن کر مجھے اپنی پناہ میں رکھتی ہیں اور ظلم و جہالت کی تاریکی میں میرے لئے مینارۂ نور بن جاتی ہیں۔

محبت و خلوص کے ان قیمتی لمحات کے نام جب دل یکایک ان کی یاد میں تڑپ کر قطرہ قطرہ آنکھوں سے بہہ نکلتا ہے اس رشتۂ تقدس کے نام جس کی تاثیر سے آنکھیں شبنمی ہو کر موتی نچھاور کرنے لگتی ہیں اور میرے جسم کا رواں رواں سراپا احسان بن کر ان کے وجود کی تلاش میں دور خلاؤں میں گم ہو جاتا ہے۔ ان کی اُس بے لوث ایثار و قربانی محنت و مشقت اور صبر آزما طویل جد و جہد کے نام جو میرے وجود کا حصہ بن چکی ہے اور میں اس سے آشنا بھی نہیں......!!!

میرا یہ مقالہ والدہ محترمہ کی دعاؤں کے ساتھ شروع ہوا تھا اور انھیں کے حسن تربیت کا ثمرہ ہے میں اپنی اس علمی و ادبی کوشش و کاوش کو ان کے حسنِ تربیت اور دعاؤں کے نام معنون کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں کاش یہ اعزاز مجھے ان کی حیات میں حاصل ہوا ہوتا اور ان کی دعائیں میرے لئے خوشی و مسرت کا باعث بنتیں اور ان کا دستِ شفقت میرے سر پر کامیابی کا تاجِ زریں بن کر جگمگا اٹھتا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ......!......!!

نذرانۂ خلوص و عقیدت......!

زیرِ نظر مقالہ کی تکمیل پر میں سب سے پہلے بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر ادا کرنا اپنا فرضِ بندگی سمجھتا ہوں کہ اسی کی توفیق سے یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچا اس کے بعد اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں کہ ان ہستیوں کے حضور خلوص و محبت کا نذرانہ پیش کروں۔ جنھوں نے لکھنے پڑھنے کے ابتدائی مراحل سے لے کر پی ایچ ڈی کے اختتامی مرحلہ تک میری رہنمائی فرمائی ہمت افزائی کی اور میرے حوصلوں کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچایا اور مجھے خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھنے کی جرأت عطا کی ان میں سر فہرست عظیم شخصیت میرے مربی قبلہ والد محترم حضرت مولانا ظل الرحمٰن صدیقی ادام اللہ ظلہ ہیں۔ جنھوں نے ہماری تعلیم و تربیت کی خاطر اپنی زندگی کا قیمتی حصہ بے انتہا و بے پناہ جد و جہد میں گذارا اور ہماری تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام فرمایا۔ بمبئی جیسے شہر بے اماں میں محنتیں کیں بے پناہ مشقتیں اٹھائیں بڑی سے بڑی قربانی دی اپنی زندگی کی ہر لذت ہر قیمتی شئے کو ہمارے لئے قربان کر دیا اور تسلسل کے ساتھ ہمیں اپنی دعاؤں کی پناہ میں رکھا ان کی دعائیں ہمارے علمی سفر کی کامیابی کی ضمانت بنتی چلی گئیں اللہ تعالی کا بڑا فضل و کرم اور احسان ہے کہ ہمارے سروں پر ان کی شفقتوں کا سایہ قائم ہے اور جب ہم زمانے بھر کی ستم ظریفیوں سے ٹوٹ کر بکھرنے لگتے ہیں تو مسیحائی کے لئے ان کی طرف دوڑتے ہیں اور ان کا دامن ہمارے لئے وسیع سائبان بن جاتا ہے، ہم اس کی چھاؤں میں قلبی راحت و آرام اور ذہنی سکون و مسرت محسوس کرتے

ہیں ہمارا دل و دماغ ان کی شخصیت سے از سر نو طاقت و قوت حاصل کرتا ہے اور زندگی کی حرارت و توانائی لوٹ آتی ہے اللہ ان کا سایۂ عاطفت تا دیر قائم رکھے اور ان پر صحت و سلامتی اور ایمان و عافیت کا سلسلۂ رحمت دراز فرمائے......ہم سراپا ممنونِ کرم بن کر ان کے قدموں میں سرِ نیاز خم کرتے ہیں کہ سب سے پہلے انھیں کے دستِ شفقت نے ہمیں قلم پکڑنا سکھایا اور ظلمت کدۂ دل و دماغ میں علم کی شمع روشن کی اور شاہراہِ علم پر گامزن ہونے کا حوصلہ عطا کیا قدم قدم پر رہنمائی کے چراغ روشن کیے انگلی پکڑ کر لکھنا سکھایا اور شاہراہ حیات پر چلنا بھی......!!

والد صاحب کی رہنمائی اور والدہ محترمہ نوّر اللّٰہ مرقدھا کی دعاؤں نے سارے تاریک راستے روشن کر دیئے ان کی دعاؤں کی برکت ہے کہ جہالت کے اندھیروں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا اور علم و عقیدے کی گمرہی سے دل و دماغ محفوظ و مامون رہے دونوں کی شخصیت منارۂ نور بن کر میرے دائیں بائیں علم و عمل اور ایمان و عقیدے کی روشنیاں بکھیرتی رہیں اور مرحلۂ علم و عمل میں مجھے کامیابی سے ہمکنار کرتی رہیں اور مرحلۂ حیات میں مجھے تحفظ کا احساس دلاتی رہیں افسوس ہے کہ مقالہ کی تکمیل کے دوران ایک منارۂ نور بجھ گیا اور میں بکھر کر رہ گیا لیکن میرے حق میں ان کی دعائیں زندہ تھیں اِنھیں دعاؤں نے مجھے از سرِ نو تعمیر کیا اور پھر شاہراہ حیات پر گامزن کر دیا لیکن اب یہ شاہراہ حیات ویران و بے نور ہو چکی تھی میری شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں انھوں نے خود اپنا وجود تحلیل کر دیا اللہ ان پر اپنی رحمتوں کا سلسلہ دراز فرمائے......اس موقع پر میں عالمِ بالا میں ان کے حضور شبنمی قطرات کا حقیر نذرانۂ خلوص و محبت پیش کرنا چاہتا ہوں کہ الٰہی اپنی رحمتوں کی بارش فرما ان کے تنِ ناتواں پر، اور اپنے کرم بے حساب سے ان کی روح کو جنت الفردوس میں قرار عطا فرما تیری بارگاہ تو داد و دہش اور عطا و بخشش کی آخری آماجگاہ ہے تیری رحمت سارے جہانوں پر محیط ہے الٰہی آنسو دنیا میں بھی رائیگاں نہیں جاتے

پتھر سے پتھر دل بھی اس شبنم سے موم ہو جاتے ہیں تو تو رؤف بھی ہے رحیم بھی والدہ کی مغفرت فرما کر ان قطرات کو اعزاز عطا فرما...... ان کے درجات بلند فرما...... اتنے بلند کہ ان کی روح خوش ہو کر پایۂ عرش کو چوم لے اور تری عطا و بخشش پر جھوم اٹھے......!! ترے کرم کی بارش سے ان کی تربت سرسبز و شاداب رہے اور سبزہ نورستہ اس باغ کی نگہبانی کرے جسے انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا اور اپنے ہاتھوں کو لہولہان کر کے پروان چڑھایا تھا الٰہی اس گلشن کے پھولوں کو خلوص و محبت کی خوشبو عطا فرما کر ان کی روح کو سرشار فرما......!!!

ہمیں اس مقالہ کے رجسٹریشن کے لئے اپنے کچھ کاغذات نہیں مل رہے تھے جس سے ذہن پریشان سا تھا والدہ نے دیکھا تو فرمایا کہ گھر ہی میں کہیں رکھے ہوں گے ہم دیکھیں گے پھر انھوں نے اپنی بیماری و کمزوری کے باوجود سارا دن بیٹھ کر الماری چھانی اور کاغذات کی فائل تلاش کر کے ہمارے حوالے کی اور بڑی محبت و معصومیت کے ساتھ فرمایا کہ بیٹا سب کچھ تو تم نے پڑھ لیا اب کیسی ڈاکٹری پڑھو گے......!!! مقالہ کی تکمیل کے موقع پر ان کی یہ مشقت اور یہ بات بار بار یاد آ آ کر دل کو تڑپا رہی ہے اور خونِ دل نذرانۂ عقیدت بن کر صفحۂ قرطاس پر بکھر گیا ہے ہم اس موقع پر اپنے پلکوں کے موتی لے کر انھیں نذرانۂ خلوص و عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کا وجود اپنے وطنِ عزیز کی مٹی میں آسودۂ خاک ہے یہ ان کی آخری خواہش تھی جسے اللہ رب العزت نے اپنے کرم سے پورا کر دیا اللہ ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے اور جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری بنادے۔ (آمین)

رہنمائی نے رجسٹریشن کے سارے مراحل آسان کر دیئے اور سرپرستی قبول فرما کر حوصلہ بڑھادیا ڈاکٹر دلوی صاحب کی نگرانی ورہنمائی میں مقالہ کا رجسٹریشن ہو گیا اور کام شروع کر دیا یعنی موضوع پر مطالعہ کا آغاز ہو گیا ابتداء تلمیحی اشعار جمع کرنے کا کام شروع کیا تھا اور کام کی رفتار بھی خاصی امید افزا رہی لیکن معاشیات کی تنگ دو، عائلی ذمہ داریاں، خانگی مسائل، وقت کی قلت، آمد ورفت کی دقتیں، وقت کا ضیاع، لکھنے پڑھنے کے ماحول کی نایابی کے ساتھ ساتھ موضوع کا تنوع، تسلسل، تقاضے اور پھیلتے ہوئے مطالبات مراجع ومآخذ کی تلاش وجستجو اور مواد کی کمیابی، وغیرہ ایسے مسائل تھے کہ کام کی رفتار خاصی متاثر ہوگئی جوں جوں موضوع پر مطالعہ بڑھتا گیا چھان بین کا عمل طویل سے طویل تر ہوتا گیا سینکڑوں صفحات کی ورق گردانی اور کئی گھنٹوں کے استغراق کے بعد جب کبھی کوئی بات بھی کام کی نہ ملتی تو وقت ضائع ہونے کا احساس بڑی شدت سے ابھرتا اور حوصلہ ٹوٹ جاتا لیکن دوسرے دن طلوع ہونے والے نئے سورج کے ہمراہ نئے عزم وحوصلے کے ساتھ لائبریری جا کر امید کا دیا جلا کر بیٹھ جاتے۔ غرض مطالعہ جاری رہا کام کے خطوط ونقوش واضح ہونا شروع ہوئے۔ یاس وآس کی کشمکش اور ٹوٹتے بکھرتے حوصلوں کے درمیان ڈاکٹر دلوی صاحب کی رہنمائی ومسیحائی نے بڑا ساتھ دیا کام کرتے کرتے جب کبھی حوصلہ ٹوٹتا اور ذہن کسی مسئلے میں الجھ جاتا تو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب علمانہ تبادلۂ خیال کرنے سے بڑی راحت ملتی حوصلہ بلند ہوتا مایوسی دور ہوتی اور کام کی راہیں ایک بار پھر روشن نظر آنے لگتیں ڈاکٹر صاحب سے شمسی توانائی حاصل کرنے کے بعد کام میں کچھ تیزی کے آثار پیدا ہو جاتے اس دوران ڈاکٹر دلوی صاحب کی طبعی شرافت بردباری تواضع وانکساری نے بڑا متاثر کیا جب کبھی ان سے فون پر ملاقات کا وقت طلب کیا کبھی نفی میں جواب نہیں ملا کبھی کبھی تو وہ خود ہی لائبریری تشریف لے آتے کام ملاحظہ فرماتے مشوروں سے نوازتے دوبارہ ملنے کی

تاکید کرتے اور جو کام ہو چکا ہوتا اس کی تائید کرنا کبھی نہ بھولتے ان کی اس تائید سے بڑا حوصلہ ملتا اس طرح مقالہ تکمیل کے مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا مگر مقالے کی رفتار سست اور وقت کی رفتار تیز ہو گئی نتیجتاً بھائی صاحبان کی حوصلہ افزائی میں تنبیہ اور یاد دہانی کا عنصر شامل ہو گیا بڑے بھائی جان کا عملی تعاون بھی بڑھ گیا لاتعداد جمع شدہ اشعار کی تلمیحات کے اعتبار سے ترتیب و تعیین اور ہماری قائم کردہ ترتیب کے اعتبار سے ان کی تقسیم اور تبییض کے سلسلہ میں ہم ان کے رہین منت ہیں۔ مقالے کی تکمیل کے مرحلے پر ان شخصیات کے تعاون کا اعتراف و اقرار میرے لئے باعث مسرت بھی ہے اور باعث اعزاز و افتخار بھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کی سرپرستی سے نوازا ہے اس موقع پر میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب اور دونوں برادران بزرگ کی خدمت میں ہدیۂ سپاس و تشکر پیش کرنا اپنے لئے باعث اعزاز سمجھتا ہوں خصوصیت سے ڈاکٹر دلوی صاحب کی سرپرستی میرے لئے واقعی مسرت و اعزاز کی بات ہے ڈاکٹر صاحب کا شمار نقادانِ فن اور ماہرین لسانیات میں ہوتا ہے عصرِ حاضر کے اساطین ادب میں آپ کا اہم مقام و مرتبہ ہے ڈاکٹر دلوی صاحب نے اپنے مراحم خسروانہ سے نوازا اپنا قیمتی وقت میرے لئے فارغ کیا آمد و رفت کی زحمتیں برداشت کیں رہنمائی اور مشوروں سے نوازا اور مجھے منزل مقصود تک پہنچانے میں اپنی حد تک کبھی کسی بات سے دریغ نہیں کیا میں ان سب باتوں کے لئے ڈاکٹر دلوی صاحب کا ممنونِ کرم ہوں اور مشکور و احسان مند بھی۔ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے علمی استفادہ کا جو رشتہ قائم ہوا ہے وہ آئندہ بھی برقرار رہے گا میں اس موقع پر ڈاکٹر صاحب سے عرض کرنا چاہوں گا۔

بگیر ایں سرمایۂ بہار از من
کہ گل در دستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

شکریہ......!

مقالہ کی تکمیل کے مرحلہ پر اپنے حلقۂ احباب کا شکریہ بھی لازم ہے کیونکہ ہر منصوبہ پہلے حلقۂ احباب ہی میں ظہور پذیر ہوتا ہے اس کی تائید وتنقید اور تنقیح وتصدیق جب تک احباب نہ کر دیں منصوبہ معتبر نہیں ہوتا چنانچہ مقالہ کا بنیادی تصور جب حلقۂ احباب میں پیش ہوا تو دوستوں نے ہمت افزائی کی۔ مضمون وموضوع پر تبادلۂ خیال کیا تائید وتنقید سے نوازا۔ گرفت وخوشہ چینی کی۔ کام اور محنت کی دل کھول کر داد دی اور میری مشغولیت کے دوران میری ضروریات کا خیال رکھا کتابیں فراہم کیں مواد کی نشاندہی کی آیات واحادیث کی تخریج میں مدد دی ان مخلص احباب میں بطور خاص عبدالحئی ندوی، رحمت اللہ ندوی، محمد رفیق ندوی، مسعود محمد مدنی، عتیق انظر، ڈاکٹر ابراہیم خطیب ندوی، ڈاکٹر آفتاب عالم ندوی اور عارف الدین کلیم عمری شامل ہیں جنھوں نے گاہے بہ گاہے ہر قسم کے درکار تعاون سے نوازا بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں ان تمام ذمہ داروں کا شکریہ ادا نہ کروں جن کا تعلق مختلف کتب خانوں سے ہے اور جنھوں نے میرے ساتھ خصوصی معاملہ کرتے ہوئے کتابوں کی فراہمی اور مراجعت میں بھرپور مدد بہم پہنچائی میں ان کا بہت بہت ممنون ہوں اسی کے ساتھ کمپیوٹر سیٹنگ اور کتابت میں رہینِ منت ہوں سید مسعود محمد مدنی کا جن کی زیرِ نگرانی خود راقم نے

کمپیوٹر کے طلسماتی رموز و اسرار سے واقفیت حاصل کی اور مقالہ کا بڑا حصہ خود تحریر کیا ٹائپنگ میں ساتھ دینے والوں میں قاضی برادران موسیٰ قاضی اور اشرف قاضی کے علاوہ عبدالرحمٰن فرید ندوی نے بھی آخیر وقت میں بڑا تعاون کیا میں ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اللہ تعالی ان سب حضرات کو بہتر بدلہ عطا فرمائے اور ایمان و عافیت کے ساتھ اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس قصیدہ کا بیت القصید اپنی شریک حیات کا شکریہ ہے لیکن میں انھیں شکریہ سے ماوراء سمجھتا ہوں انھوں نے وقتی طور پر میرے ساتھ تعاون نہیں کیا بلکہ وہ مستقل میری شریک کار ہیں اور میرا کوئی کام ان کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس لئے ان کا بھی شکریہ واجب ہے اور اس واجب کی ادائیگی میرے لئے باعث مسرت ہے.........!

مقدمہ

بر کتاب "اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات"

● مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

الحمد لله رب العالمین، و الصلاة و السلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد، و علی آله و صحبه أجمعین، أما بعد:

اردو زبان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی پیدائش اسلامی ماحول میں ہوئی، اور اس کی تربیت اور نشو ونما بھی اسلامی ماحول میں ہوئی، اور ابتدائی دور میں جس میں الفاظ وتعبیرات ومحاورات کسی زبان میں دوسری زبانوں سے اخذ کئے جاتے ہیں یا ڈھالے جاتے ہیں یا بے تکلف بلغاء کی زبان سے ادا ہونے کے بعد زبان میں داخل کئے جاتے ہیں اس دور میں اس پر علماء، صلحاء اور اسلامی جذبہ رکھنے والوں اور اسلام کے لئے قربانی دینے والے جانبازوں کا سایہ رہا ہے، اس لئے بھی زبان کا مزاج اسلامی بن گیا، اور اس کے بولنے والوں کے ذوق ادبی پر اسلامی ثقافت، تاریخ اور اسلامی رموز کا رنگ غالب رہا، مغربی زبانوں، مغربی ادب جس پر الحاد، مادیت یا مسیحیت کی چھاپ تھی اس سے متاثر ہونے کے بعد بھی اس زبان کے ادب خاص طور پر اس کی شاعری پر وہ اثرات نہیں پڑے جو دوسری زبانوں پر حتی کہ عربی زبان پر جس میں اسلامی علوم وفنون کا

خزانہ محفوظ ہے نمایاں طور پر پڑے۔

اس زبان کی اسلامیت کے محفوظ رہنے کا ایک سبب یہ بھی رہا ہے کہ اسلامی زبان ہونے کی وجہ سے اس میں غیر مسلم ادباء جو اس حیثیت کے ہوں کہ وہ ادب پر اثر انداز ہوں جس طرح عربی زبان وادب میں ہر دور میں پیدا ہوتے رہے، نہیں پیدا ہوئے بعض غیر مسلم ادباء اور شعراء نے اردو زبان سے دلچسپی لی، اور ہر دور میں ان کی ایک معقول تعداد رہی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان کی حیثیت مقلّد کی تھی، انہوں نے اس اسلامی مزاج کو باقی رکھا، یہ چاہے قصہ نگار ہوں یا شعراء یا نثر نگار، ان کی تحریریں مسلم ادباء کی تحریروں یا ادبی کاوشوں سے زیادہ مختلف نہیں تھیں، انہوں نے اردو ادب کے مسلم ادباء وشعراء کو ہی معیار سمجھا، اس کے مقابلہ میں عربی ادب میں غیر مسلم عرب ادباء نے ایک نئے ادب کی بنیاد ڈالی۔

اردو زبان کی نشأۃ کے بارے میں مؤرخ ہند مولانا سید عبدالحی حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ " الثقافة الإسلامية في الهند " میں لکھتے ہیں:

" اعلم أنها كانت لأهل الهند لغة تسمى سنسرت ، و فيها على زعمهم أربعة كتب سماوية ، و لهم لغة أخرى يسمونها بهاشا ، وهي شائعة في محاوراتهم في معظم المعمورة ، و لما ظهر الإسلام في الهند و وفد الناس إليها من بلاد العرب و العجم نشأت في الهند من امتزاج اللغات المتنوعة لغة فسموها أردو و هذه اللغة تدرجت في الارتقاء حتى صارت في أيام شاهجهان في غاية العذوبة و الفصاحه ، و كان الناس في دهلي و نواحيها مائلين إلى الشعر

الفارسي ، لا يرغبون إلى النظم في تلك اللغة، و كان إبراهيم عادل شاه البيجابوري له شغف عظيم بالموسيقى و اللغة الهندية التي يسمّونها بهاشا ، و في عهد ولده محمد عادل شاه البيجابوري كذلك ، و كان له ميل عظيم إلى أردو ، فمال الناس إليه و اشتغلوا بقرض الشعر".

''کہ ہندوستان کی اصل زبان سنسکرت ہے، اور ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق اس زبان میں ان کی چار آسمانی اور مقدس کتابیں ہیں لیکن روزمرہ اور عام بول چال کی زبان دوسری ہے، جو ہندوستان کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہے، اور اس کو بھاشا زبان کہتے ہیں، جب ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی ، اور عرب و عجم سے یہاں مسلمانوں کی آمد ہوئی تو عربی ، فارسی ، ترکی اور ہندی زبانوں کے اختلاط و آمیزش سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی اور اس کو اردو کہا جاتا ہے، یہ زبان بتدریج ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ شاہجہاں کے زمانہ میں یہ فصاحت و بلاغت کے اچھے معیار پر پہنچ گئی، ابتداء میں دہلی اور اس کے اطراف کے لوگوں کا میلان فارسی شاعری کی طرف تھا، اور اردو شاعری میں شعر گوئی کا رجحان نہیں تھا، بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی اور ہندی زبان سے بہت گہرا تعلق تھا، اور اس نے ہندی زبان میں کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں ، اس کے پاس اس کے زمانہ کے علوم و معارف کا بڑا حصہ جمع ہو گیا تھا، اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، یہ حالت ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے محمد عادل شاہ اور پھر ان کے لڑکے علی

عادل شاہ کے زمانہ تک قائم رہی، علی عادل شاہ کو اردو زبان سے بڑی دلچسپی تھی، اس لئے اس کے زمانہ میں لوگ اس زبان کی طرف زیادہ مائل ہوئے اور اس زبان میں اشعار کہنا شروع کیا۔''

محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں اردو کی ابتدائی تاریخ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''عجیب لطف یہ ہے کہ زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، یعنی ۱۸۰۷- ۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبد القادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں، بعد اس کے مولوی اسماعیل صاحب نے بھی بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اردو میں لکھے۔'' (آب حیات صفحہ ۴۴)

محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:

'' ان کی اہم ترین کتاب تقویۃ الایمان ہے، جو انہوں نے اردو زبان میں اس وقت لکھی جب اس زبان کو ابھی گھٹنوں چلنا نہیں آتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جب اردو نثر میں گنتی کی کتابیں تھیں ایک صاحب کمال نے اس میں کیا جادو بھر دیا ہے، اور اس کی مدد سے اپنے خیالات کو کتنی خوبی سے ادا کیا ہے۔ ''(موج کوثر صفحہ ۳۸)

اردو انسائیکلوپیڈیا میں تحریر ہے کہ ابتدائی کتابیں جو اردو زبان میں لکھی گئیں، ان میں معراج العاشقین، شرح مرغوب المطلوب، شرح تمہید ہمدانی اور قرآن شریف کے ترجمے کی کتابیں ہیں۔

اردو شاعری پر امیر خسرو، مرزا مظہر جان جاناں کے اثرات سے تاریخ ادب اردو سے واقفیت رکھنے والا انکار نہیں کر سکتا، حکیم مومن خاں مومن، اور خواجہ میر درد کا

کلام اسلامی تعبیرات اور اسلامی جذبہ سے معمور ہے، خود مرزا غالب کے کلام میں بکثرت اسلامی تعبیرات ملتی ہیں۔

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے متاثر شعراء اور ادباء نے اردو زبان و ادب کو دعوت و اصلاح کا ذریعہ بنایا، اردو میں متعدد شاہنامے کے جہاد کے واقعات منظوم کئے گئے، مولانا عبد الرزاق کلامی کی صمصام الاسلام اور مولانا عبدالحی احقر بنگلوری کی جنان السیر کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، یہ مجموعۂ کلام ہر مسلمان گھر میں مقبول خاص و عام ہے، مولانا حالی کی مسدس حالی کی مقبولیت کا تو ذکر غیر ضروری ہے۔

ترقی پسند ادب کو اسلامی ذہن کے ادباء و شعراء نے اتنا بڑھنے اور عام ہونے کا موقع نہیں دیا، جتنا دوسری زبانوں میں اس کو موقع ملا ہے۔ زبانوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی زبان انسانوں کے کسی زمرہ میں جاری و ساری ہو جاتی ہے تو وہ اس کے افراد کے درمیان صرف آپس میں اپنی حاجت کے اظہار اور ضرورت کی طلب کے لئے ہی نہیں استعمال ہوتی ہے بلکہ ایک کا دوسرے کے لئے اپنے تأثر کے اظہار اور احساس کی ادائیگی کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے، زبان کی یہ منزل اس کو ممتاز ادبی صفت عطاء کرتی ہے، اس میں محاوروں اور تلمیحات سے اسلوب کلام میں زور پیدا کرنے اور کلام کی دلنوازی بڑھانے کا کام لیا جاتا ہے، تلمیحات سے ماضی کی زندگی کے قابل ذکر اور مؤثر واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، جو ایک لفظ یا دو لفظ میں بطور مثال کسی مؤثر واقعہ کی طرف ذہن کو مبذول کر دیتا ہے، اس میں ایک طرف کلام میں اختصار ہوتا ہے اور دوسری طرف واقعہ کی مؤثر جھلک بھی آجاتی ہے، اس سے عام طور پر شعری کلام میں زیادہ سے زیادہ مدد لی جاتی ہے۔

اردو زبان و ادب کو اس سلسلہ کی خصوصیت کئی طرف سے حاصل ہوئی، وہ چونکہ اپنی مشرقی دنیا کی کئی ان ترقی یافتہ اور ادبی خوبیوں سے مالا مال زبانوں سے تشکیل پائی ہے

جن کی قوموں سے اردو استعمال کرنے والوں کا ثقافتی اور دینی تعلق رہا ہے، اس لئے احساسات وتصورات میں یکسانی نے ان کی تلمیحات کو اخذ کیا اور ان کے واقعات کی طرف اشارہ کی غرض سے خود بھی تلمیحات اختیار کیں، اس طرح اردو ادب وزبان اور خاص طور پر اس کی شاعری میں تلمیحات کا اچھا ذخیرہ ہو گیا ہے۔

لیکن کسی بھی زبان کی تلمیحات کے سمجھنے اور ان سے لطف لینے کے لئے اس زبان کے استعمال کرنے والوں کا ان تلمیحات سے واسطہ پڑنا یا بذریعۂ تعلیم ان سے واقفیت پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے، اردو کو ہندوستان میں جس ماحول سے سابقہ ہے اس میں اردو کو وہ صحت بخش اور اس کی اصلی ثقافتی فضا نہیں مل رہی ہے جو سابق میں تا حال ملتی رہی تھی، اس کی وجہ سے اردو کے رائج العام محاوروں اور اس کے ادب وشعر میں جاری وساری تلمیحات کو صحیح طور پر سمجھنا اور لطف لینا بھی کم ہوتا جا رہا ہے، یہ بات کسی بھی زبان کی اپنی اصلی ثقافتی زندگی سے دوری کا باعث بننے والی بات ہے، زبان کوئی بھی ہو دراصل وہ اپنے استعمال کرنے والوں کی ثقافتی زندگی کی ترجمان ہوتی ہے، زبان کی ہیئت ومزاج میں فرق آنے سے اس کے ثقافتی مزاج میں فرق آتا ہے، اور ثقافتی مزاج میں فرق آنے سے اس کو استعمال کرنے والوں میں بہت کچھ فرق آجاتا ہے، اس لئے زبان کی حفاظت اور اس کی اصل خصوصیات کا بقاء وتحفظ ایک ضروری امر ہوتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کو اس رخ پر ذرا خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، اور یہ اس لئے بھی کہ اردو زبان کی بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کی خصوصیات کی حامل زبان رہی ہے، جب دنیا کی دوسری زبانوں پر قومیت کے منفی رجحانات کا بھوت سوار ہو گیا، اردو ادباء وشعراء اور قصہ نگاروں نے عالم اسلامی سے اس کی تاریخ اور اس کے مسائل سے ویسی ہی دلچسپی لی جیسی دلچسپی انہوں نے اپنے مسائل سے لی، اردو شاعری سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، اسی طرح مغربی تہذیب کے رد میں اردو شعراء اور ادباء نے جس قوت اور جذبہ کا مظاہرہ کیا

اس کی مثالیں بھی دوسری زبانوں میں ملنی مشکل ہیں۔

علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی، مولانا شبلی وغیرہ کے نام اس عالمی اسلامی ادب میں نمایاں طور پر لئے جاسکتے ہیں۔

اس پس منظر میں اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات کا کثرت سے پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، لیکن اس کی طرف خصوصی طور پر توجہ نہیں کی گئی تھی، یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس خاص موضوع پر زبان وادب کے شبلی مدرسہ کے ایک فرزند نے توجہ کی، مولوی عطاء الرحمٰن ندوی نے اپنے ڈاکٹریٹ کے لئے اس موضوع کو اختیار کیا۔ مولوی عطاء الرحمٰن ندوی نے دار العلوم ندوۃ العلماء سے فضیلت کی، انہوں نے دوران تعلیم ندوۃ العلماء کے مہیا کردہ علمی وادبی رسائل سے خاصا فائدہ اٹھایا، اور اپنے علمی ذوق و استعداد کو مدد بہم پہنچائی، وہ اس کے بعد بھی اپنی علمی وادبی صلاحیت کو مہمیز دیتے رہے، انہوں نے فضیلت کے بعد یونیورسٹی کے ذرائع سے بھی فائدہ اٹھایا، اور ایم اے و پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں، پی ایچ ڈی کے لئے اپنے مقالہ میں انہوں نے اردو شاعری سے ایسی مثالیں جمع کردیں جن کی طرف بولنے والے توجہ نہیں کرتے، ان کی زبان سے یہ تلمیحات ادا ہوتی ہیں مگر وہ ان کے پس منظر سے واقف نہیں ہوتے، جس طرح امثال کے ساتھ قصہ مربوط ہوتا ہے، اسی طرح تلمیحات کا بھی پس منظر ہوتا ہے، انہوں نے تلمیحات کی تاریخ اور تمہید تحقیق کرکے پیش کی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب ''اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات''، علمی لحاظ سے مفید ہونے کے ساتھ اسلامی جذبہ اور وابستگی میں اضافہ کرنے والی ہے۔

محمد رابع حسنی ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۹/۶/۱۴۲۴ھ
۱۸/۸/۲۰۰۳ء

پیش لفظ

اردو ایک ہندوستانی زبان ہے جس کا سلسلۂ نسب ہندوستان میں مستعمل قدیم آریائی زبانوں سے ملتا ہے یہاں کے قدیم باشندے آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو خود ۱۵۰۰ ق م میں ہجرت کر کے یہاں آئے تھے اور یہیں بودوباش اختیار کرلی تھی ان کے درمیان طبقاتی اور قبائلی نظام رائج تھا ان کے مختلف قبائل ہندوستان کے متفرق علاقوں میں آباد تھے انھیں مختلف قبائل کی زبان مختلف بولیوں کی شکل میں پورے ہندوستان میں رائج تھی۔ کسی خارجی اختلاط کے بغیر طویل عرصہ تک رائج طبقاتی وقبائلی نظام معاشرت کی وجہ سے مقامی طور پر نئی زبانیں بنتی اور بکھرتی رہیں لسانی سطح پر بھی طبقاتی وقبائلی معاشرتی نظام کے مثبت ومنفی اثرات مرتب ہوتے رہے اور صدیوں تک مختلف مقامی بولیوں کی باہمی شکست وریخت کا عمل جاری رہا انہیں ٹوٹتی بکھرتی بولیوں کی آخری شکل ''ہندوستانی'' قرار پائی اسی آخری بولی کا اختلاط جب پہلی بار عربی ایرانی اور ترکی زبانوں سے ہوا تو اردو وجود میں آئی۔ اس طرح اردو ہندوستان کی وہ جدید ترین زبان ہے جس میں عربی ایرانی ترکی اور ہندوستانی ثقافت وکلچر کا عطر کشید ہوکر آ گیا کیونکہ ان نو وارد قوموں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی ان قوموں کے درمیان اردو اتحاد واتفاق کی علمبردار بن کر نمودار ہوئی اور ایک مشترک تہذیب کی بن کر ابھری جس میں ہندوستانی مٹی کی بوباس رچی ہوئی تھی اور یہاں کا رنگ وآہنگ غالب تھا اس

جدید زبان نے یہاں کی مختلف قوموں مختلف مذاہب مختلف زبانوں اور متنوع تہذیب و ثقافت کو ایک لڑی میں پرو کر پورے ہندوستان کی واحد زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔

اردو کا خمیر ہندوستان کی سوندھی مٹی سے اٹھا تھا اس لئے اس کے ادبی سرمایہ میں یہاں کی مقامی خصوصیات کا بڑا وافر حصہ ہے اور آج بھی اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں ہندوستانی الاصل الفاظ کا تناسب کہیں زیادہ ہے اردو کی مختلف اصناف ادب میں اس کا بہت واضح اظہار ملتا ہے اردو کے قصے کہانیاں داستانیں ناول افسانے اور شاعری ہندوستانی ثقافتی سرمائے سے مالا مال ہے انہیں اصناف ادب میں ایک نمایاں حصہ تلمیحات کا بھی ہے جو تمام اصناف ادب میں قدر مشترک بھی ہے اور ان اصناف ادب کا حسن و جمال بھی ہیں۔ تلمیح دراصل خیال کی ادائیگی کا خوبصورت سانچہ ہے جو وسیع مضمون کو مختصر و مؤثر انداز میں ادا کرنے کا اہم ذریعہ ہے اسی لئے اس کا استعمال عموماً شاعری میں زیادہ ہوا ہے کیونکہ شاعری خیال کو مؤثر و مختصر انداز میں ادا کرنے کا فن ہے چنانچہ قدرتی طور پر تلمیح کا بڑا میدان شاعری ہی ہے شاعر اپنے خیال کو مؤثر و بلیغ انداز میں ادا کرنا چاہتا ہے تو تلمیح کا سہارا لیتا ہے کیونکہ تلمیح کے استعمال سے ایک خاص فضا اور خاص تأثر قائم ہو جاتا ہے اسی تأثر و فضا سے فائدہ اٹھا کر شاعر اپنا خیال اپنی بات سننے والے کے دل و دماغ میں اتار دیتا ہے اور سننے والے کو بھی اس کا قبول کرنا آسان ہو جاتا ہے اسی لئے نقادانِ فن تلمیح کے استعمال کو زیادہ بلیغ قرار دیتے ہیں۔ خیال کا ابلاغ اور مضمون کی ترسیل تلمیح کے سہارے آسان، پُرکشش، مؤثر، دلچسپ اور پُر لطف ہو جاتی ہے پروفیسر وحید الدین سلیم کا خیال بالکل درست ہے کہ جس زبان کے پاس تلمیحات کا جتنا ذخیرہ ہوگا وہ زبان اتنی ہی زیادہ مالدار شمار ہوگی اور خوش قسمتی سے اردو زبان کے پاس یہ ذخیرہ اپنی مشترک اصل اور مشترکہ کلچر کی نمائندگی کی وجہ سے بہت زیادہ ہے اسی لئے اردو نہ صرف ایک مال دار زبان ہے بلکہ شاندار بھی ہے۔

جب ہم تلمیحات کی تلاش کے نقطۂ نظر سے اردو زبان کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کے کثیر قومی پس منظر، متنوع مذہبی نظریات، مختلف الجہات جغرافیائی حالات، دیو مالائی تصورات، رنگ ونسل اور قوموں کے عروج زوال سے متعلق لاتعداد تلمیحات نظر آتی ہیں جو اردو شعر وادب میں رچی بسی ہیں انھیں مختلف النوع تلمیحات میں سے ہم نے بطور خاص اردو شاعری میں مستعمل اسلامی تلمیحات کو مستقل موضوع بنا کر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اس کی ضرورت کا احساس بھی شدت سے ابھرتا ہے کیونکہ اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر، اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے نظریات، اردو شاعری میں دیو مالائی تصورات، اردو شاعری میں رامائن ومہابھارت کی روایات وغیرہ پر تو کام ہوا ہے اور مستقل کتابیں موجود ہیں لیکن خالص اسلامی تلمیحات کے موضوع پر کسی جائزے کا سراغ نہیں ملتا حالانکہ اردو شاعری کی تلمیحات کا خاصا بڑا حصہ اسلامی تلمیحات پر ہی مبنی ہے یہ شرح ۶۰ فیصد سے بھی متجاوز ہے اس کے باوجود اب تک یہ گوشہ تشنۂ تحقیق ہی رہا۔ کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی اس کمی اور خلا کے احساس کے تحت یہ موضوع اختیار کیا گیا اور اسلامی تلمیحات کو موضوع بنا کر یہ مقالہ تیار کرنے کی کوشش کی گئی اسی کے ساتھ ساتھ اس جائزے کا اصل اور بنیادی محرک یہ احساس بھی تھا کہ اردو شاعری میں مستعمل اسلامی تلمیحات رطب ویابس کا مجموعہ ہیں صحیح وغلط تصورات آپس میں خلط ملط ہو گئے ہیں بسا اوقات شعراء نے تلمیح سے جو معنی مراد لئے ہیں یا جن مضامین تک رسائی کے لئے اسلامی تلمیحات کا سہارا لیا ہے وہ مشتبہ اور مشکوک ہیں بلکہ کہیں کہیں بالکل غلط بھی ہیں اسی رطب ویابس کی وضاحت وتفصیل اور تعیین وتحقیق ہمارا مطمح نظر ہے اس کے لئے تلمیحات کے حقیقی پس منظر، ان کے صحیح ماخذ ومصدر کی تلاش وجستجو اور مطلوبہ معانی کے جواز وعدم جواز کا ثبوت فراہم کرنا ہماری اس حقیر کوشش کا مقصد اور حاصل ہے انبیاء کرام بزرگان دین نیز قرآن وحدیث سے متعلق تلمیحات میں غلط اور صحیح کی نشاندہی

بھی ایک اہم نقطہ ہے۔

تلمیحات کے موضوع پر اب تک محض فرہنگ سازی اور تشریحی نقطۂ نظر سے کام ہوا ہے ادبی اور فنی حیثیت سے براہ راست تلمیحات کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا فنِ بلاغت اور علم بیان میں استعارہ کنایہ مجاز اور تشبیہات کی رنگارنگی نے تلمیحات کے حسن پر پردہ ڈال رکھا ہے جبکہ کلام کا سارا حسن اور فن محض استعارے کنائے اور تشبیہات تک ہی محدود نہیں ہے۔ تلمیحات کا اپنا الگ ایک حسن ایک کشش ایک تاثر ایک کیف ایک جمال ایک سحر ہے بسا اوقات ایک تلمیحی شعر سارے استعارے کنائے اور تشبیہ پر بھاری ہوتا ہے۔ اور تشبیہی واستعاراتی شعر کے مقابلے میں زیادہ پُرکشش دلچسپ موثر پُر کیف اور زیادہ بلیغ ہوتا ہے استعارے کنائے اور تشبیہات کی حیثیت شعر کے لئے اضافی حسن کی سی ہے جبکہ تلمیح کا حسن اضافی اور خارجی نہیں ہوتا کیونکہ تلمیحی شعر میں حسن وخوبصورتی کے لئے خارجی عناصر یعنی معنی موضوع لہ، معنی مستعار یا وجہ تشبیہ و آلات تشبیہ وغیرہ پر انحصار نہیں ہوتا ایک تلمیحی شعر اپنے حسن وخوبصورتی کے لئے ان بیساکھیوں کا محتاج نہیں ......! اس کا حسن داخلی ہوتا ہے اور اپنے اندرون سے ابھرتا ہے مصنوعی نہیں حقیقی ہوتا ہے۔ فنی حیثیت سے تلمیحات کے باب میں خاصی تشنگی کا احساس پایا جاتا ہے تلمیح کی فنی حیثیت ادبی مقام ومرتبہ اس کا حدود دار بعہ اس کی اقسام تلمیح کے صحیح وغلط یا اچھے اور برے ہونے کا معیار اس کو برتنے کے اصول وضوابط اور کلام کے حسن وقبح پر اس کے اثرات وغیرہ کی بحث اور متعلقہ مسائل دستیاب نہیں ہیں اور تشنگی کا احساس دلاتے ہیں زیر نظر مقالہ کا تیسرا باب معروضی انداز میں اسی کے جائزے کی طالب علمانہ کوشش ہے اور بطور خاص اسلامی تلمیحات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ان تلمیحات کے مثبت و منفی استعمال کے جواز کی بنیادیں تلاش کی جاسکیں اسی لئے حتی الامکان فرہنگ سازی کے بجائے تلمیحات کے اصل مآخذ و مصادر تک رسائی حاصل کر کے شعراء کے

استعمالات کو پیش کیا گیا ہے اور شعراء کے اخذ کردہ مضامین و خیالات کی بنیادیں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان مصادر و مآ خذ میں اگر شعراء کے بیان کردہ معانی و مضامین کے لئے گنجائش نہیں ہے تو اس کی وضاحت کا فریضہ انجام دیا گیا ہے تا کہ غلط اور بے بنیاد باتوں پر تلمیح نہ تراشی جائے اور غلطی کا تسلسل قائم نہ ہو۔ رہی ان تلمیحات کی اسلامیت کی بات تو ہم نے کسی تلمیح کو بزور شمشیر مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی ہے اس میں ہمارا کوئی فائدہ بھی نہیں ہم نے تو ان تلمیحات پر جمے قصے کہانیوں کے گرد و غبار کو صاف کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے ان تلمیحات سے افسانوی رنگ اور اساطیری زنگ کو دور کر کے ان کے حقیقی رنگ و آہنگ کو ابھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ اس عملِ تطہیر کے نتیجہ میں اگر ان تلمیحات کی اسلامیت چمک اٹھی ہے تو یہ ان کا اپنا اصلی چہرا اصلی حسن اور حقیقی رنگ و روپ ہے ہمارے جبر و اکراہ کا نتیجہ یا ردِّ عمل نہیں ہاں البتہ یہ بحث کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیائے سابقین کی تلمیحات ''اسلامی'' کیسے ہو سکتی ہیں کیونکہ یہ تمام انبیاء تو اسلام سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس قبل مبعوث ہوئے تھے بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور معقول بھی لگتا ہے لیکن ان تمام انبیاء سابقین سے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ سارے انبیاء کا دین دینِ اسلام ہی تھا سب نے توحید رب کی دعوت دی اور مرضیات الٰہی کو نافذ کرنے کا مطالبہ کیا احکام الٰہی کی تنفیذ اور توحید رب کی دعوت ہی اصل اسلام ہے اسی دعوت کا آخری نسخہ آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور اس ضمانت و بشارت کے ساتھ لے کر آئے کہ اب یہ دینِ سماوی قیامت تک محفوظ و برقرار رہے گا اس سے پہلے جو ادیان سماویہ آتے تھے ان کے ماننے والے نبی کے انتقال کے بعد دینی احکامات میں حسب خواہش تبدیلی کرلیا کرتے تھے اور دینی تعلیمات تحریفات کا شکار ہو کر اپنی اصل سے بہت دور ہو جاتی تھیں اور بجائے ہدایت کے گمراہی کا سبب بن جایا کرتی تھیں اسی بنا پر

کچھ کچھ عرصہ بعد نئے نبی اور نئے دین کی ضرورت ابھرتی رہتی تھی اور اللہ تعالی کی طرف سے تجدیدِ دین کی خاطر نبی بھیجے جاتے تھے اس حیثیت سے تمام انبیاء سابقین کے حالات ان کی امتوں کی روداد اور ان کی تعلیمات بھی در اصل اسلام کے دائرے میں آتی ہیں اگر چہ ہر نبی کے دین کا نام الگ الگ ہی کیوں نہ ہو اس کے علاوہ ان تمام تلمیحات کا شمار اسلامی دائرے میں اس طرح بھی ہوتا ہے کہ گذشتہ انبیاء کے حالات اور ان کے دین و شریعت کی تعلیمات طویل مدت گذر جانے کی وجہ سے مشتبہ ہوگئی تھیں اس میں قصے کہانیاں، من گھڑت واقعات و روایات کے ساتھ ساتھ سابقہ ادیان کے دینی زعماء علماء اور پادریوں نے اپنی طرف سے طرح طرح کی باتیں شامل کر دی تھیں نیز انبیاء سابقین سے متعلق بے سر و پیر کی بے شمار روایات عوام میں رائج و مقبول ہو گئی تھیں عوام ان پر یقین بھی رکھتے تھے قرآن نے ان انبیاء کے حالات ان کے دین کی تعلیمات کو وحی کے ذریعہ صاف و صحیح انداز میں صحیح پس منظر کے ساتھ بیان کیا اور ان کی شخصیات کا تقدس بحال کیا اور ان کی تعلیمات کی تطہیر کا فریضہ انجام دے کر موجودہ انسانوں کی عبرت و موعظت کے لئے انبیاء سابقین کے حالات بیان کئے عام انسانوں کی رشد و ہدایت کے مقصد کو واضح کرنے کے لئے امم سابقہ کے واقعات کا ذکر کیا عوامی سطح کی خرافات، مصلحت پسندانہ روایات اور معاندانہ نظریات کے اس سیلابِ بلا خیز سے صحیح اور سچی صورت حال کو اخذ کیا اور جو بات عوامی رشد و ہدایت کے مقصد سے قریب تر تھی اس کو بیان کیا ہے۔ کبھی یہ بیان نبی کریم ﷺ کی نبوت و صداقت کی آزمائش کے جواب میں بھی کیا گیا ہے لیکن وہاں بھی رشد و ہدایت کی تکمیل یا وضاحت ہی اصل مقصد رہا ہے مثلاً یوسفؑ کا واقعہ محض اس آزمائشی سوال کے جواب میں نازل کیا گیا کہ حضرت یعقوبؑ کی اولاد مصر کیسے پہنچ گئی وہ تو بلاد الشام کے رہنے والے تھے؟؟!! اس سوال کی وضاحت کے لئے پوری سورہ یوسف نازل کی گئی اور حضور ﷺ

نے وحی الٰہی کے ذریعہ پورا قصہ تفصیل ووضاحت کے ساتھ سنا دیا اور اس تمہید کے ساتھ سنا دیا کہ سوال کرنے والوں کے لئے اس قصہ میں عبرت وموعظت کے بہت سے پہلو ہیں۔

تمام سابقہ انبیاء کی دعوت اور ان کے دین کی وضاحت قرآن وحدیث کا موضوع ہے قرآن وحدیث کے بیان اور دلائل نے ان تمام سابقہ انبیاء کی تلمیحات کو اسلامی تلمیحات کے دائرے میں شامل کر دیا ہے کیونکہ اس سلسلہ میں قرآن کا بیان حرف آخر ہے اسلام کی آمد کے بعد ہی یہ واقعات زیادہ تفصیل وصحت کے ساتھ منظر عام پر آئے اور زبان زد خاص وعام ہوئے اسی کے ساتھ ساتھ یہ ایک مستقل اسلامی عقیدہ ہے کہ تمام انبیاء مبعوث من اللہ ہیں ان کا دین دین حق ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسی علیہ السلام تک سارے انبیاء پر ایمان لانا اسلامی عقیدہ کا جز ہے کسی ایک نبی کا بھی انکار کفر کا موجب ہے اسی طرح تمام انبیاء اور ان کی امتوں کا ذکر قرآن کا جز ہے اور قرآن کے تمام اجزاء پر ایمان بھی اسلامی عقیدہ ہے اس لئے بھی ان تمام انبیاء سے متعلق ساری تلمیحات کا اسلامی تلمیحات کے دائرے میں شمار کیا جانا ضروری ہے یہ ساری تلمیحات اسلامی تلمیحات ہی ہیں ان کے علاوہ بھی جو تعلیمات وعقائد قرآن وحدیث کا موضوع ہیں یا قرآن وحدیث میں ان کا ذکر ہے ایسی تمام تلمیحات بھی اسلامی تلمیحات کے دائرے میں شامل سمجھی جائیں گی جیسے یاجوج ماجوج، اصحاب کہف اصحاب الفیل وغیرہ جن قصص وواقعات کے سلسلہ میں ہمیں قرآن وحدیث سے کوئی رہنمائی ملتی ہو خواہ ان کا تعلق ماضی سے ہو یا مستقبل سے ان واقعات سے اخذ کردہ تلمیحات کو بھی ہم نے اسلامی تلمیحات کے دائرے میں شمار کیا ہے اور ان کے مصادر وماخذ متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اس نقطۂ نظر سے کی ہے کہ مستعمل تلمیحات کے امکانات وسیع سے وسیع تر ہو سکیں اور مضامین شعر کے نئے آفاق روشن

ہوں مستعمل تلمیحات کو ان کے حقیقی پس منظر اور صحیح تناظر میں دیکھا جا سکے اور اس تلمیح سے متعلق غلطیاں اور غلط فہمیاں دور ہوں اور تلمیحات کے مثبت و منفی استعمال کے جواز کی بنیادیں فراہم ہوں۔

ہمارے اس جائزے کی سند اور بنیاد علامہ شبلی نعمانی کی بیان کردہ تعریف ہے، جس میں انھوں نے اہل لغت اور علماء بلاغت کی بیان کردہ نپی تلی محدود تعریف سے بلند ہو کر تلمیح کے لئے نئی اور وسیع بنیاد فراہم کی ہے اور یہی صحیح بھی ہے تلمیح ان کے نزدیک کسی واقعے یا قصے کی طرف محض اشارے کا نام نہیں ہے بلکہ کسی قصے یا واقعے سے استفادہ کرتے ہوئے مضمون پیدا کرنے کا نام تلمیح ہے۔ تلمیح خبر مجرد نہیں اور نہ ہی خبر مجرد کا اشارہ تلمیح ہے۔ تاوقتیکہ اس اشارہ سے کوئی نیا مفہوم نیا مضمون نہ پیدا کیا جائے نیا خیال نہ تراشا جائے تلمیح کا لطف پیدا نہیں ہوتا۔ اشارہ تلمیح نہیں بنتا یوں بھی شعر و شاعری کے لئے خبر مجرد کا اشارہ محض کسی دلچسپی یا کشش کا باعث نہیں ہوتا ہم نے علامہ شبلی نعمانی کے اسی تصور و تعریف کو مشعلِ راہ بنا کر تلمیحات کا اور تلمیحات کے امکانات کا جائزہ لیا ہے اور اسی کی روشنی میں زیر نظر مقالہ ترتیب دیا ہے۔ ہمارا مقالہ علامہ شبلیؒ کے اسی تصور کی تشریح و توسیع کا فریضہ انجام دینے کی طالب علمانہ کوشش ہے۔

ہم نے شاعری کی مذہبی اصناف سخن مرثیہ اور نعت و منقبت سے الگ ہٹ کر عمومی شاعری میں اسلامی تلمیحات کی تلاش و جستجو کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے کیونکہ ان اصناف سخن میں تو اسلامی تلمیحات عام طور پر پائی ہی جاتی ہیں بلکہ یہ اصناف سخن ہی اسلامی تلمیحات پر مبنی ہیں اس لئے بالقصد و ارادہ ہم نے ان اصناف سخن سے قطع نظر کرتے ہوئے عمومی شاعری میں اسلامی تلمیحات کی تلاش و جستجو کی ہے۔ اردو شاعری کئی صدیوں پر محیط ہے اور ماشاءاللہ شاعری کا ذخیرہ بھی سات سمندروں سے زیادہ عمیق و عریض ہے اس لئے ساری شاعری کا احاطہ نہ مقصود تھا نہ عملی طور پر ممکن، اس کے علاوہ ہمارے موضوع

کا تقاضہ بھی شاعری کا احاطہ نہیں بلکہ اسلامی تلمیحات کا احاطہ ہے اس لئے ہم نے شاعری کا احاطہ کرنے کے بجائے حتی الامکان اسلامی تلمیحات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے یہ اردو شاعری کا جائزہ نہیں شعراء کے یہاں مستعمل اسلامی تلمیحات کا جائزہ ہے، ہم نے شاعری سے مثالیں فراہم کر کے مستعمل اسلامی تلمیحات کا جائزہ پیش کیا ہے ہاں البتہ اس کا لحاظ ضرور رکھا ہے کہ شاعری کے ہر دور کی نمائندگی ہو جائے اور اس کا بھی اندازہ ہو جائے کہ ایک تلمیح نے عہد قدیم سے لے کر عہد جدید تک کس طرح سفر طے کیا ہے اور ایک ہی تلمیح نے بدلتے ادوار کے ساتھ شعری امکانیات و معنویات کی کتنی پرتوں کو روشن کیا ہے اور کس کس طرح اجاگر کیا ہے اس لئے برائے کرم اس مقالہ کو شاعری کے احاطے کے پیمانے سے نہ جانچیں بلکہ اسلامی تلمیحات کے جائزے اور احاطہ کی ایک متواضعانہ کوشش و کاوش تصور فرمائیں۔ ہمیں اس کا بھی دعوی نہیں کہ ہم نے تمام اسلامی تلمیحات کا احاطہ کر لیا ہے کیونکہ کوئی شاعر اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیمات وعقائد اور قرآن کریم کی کسی آیت یا حدیث کے کسی جملے کو کس وقت کیسے تلمیح بنا کر استعمال کر لے اس کی کوئی آخری ضمانت نہیں دی جاسکتی یہ میدان بڑا متنوع وسیع اور زرخیز ہے اس لئے حتی المقدور موجودہ مستعمل اسلامی تلمیحات کا احاطہ اور متوقع تلمیحات کی نشاندہی کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ہوسکتا ہے یہ سعی سعی خام ہو لیکن ہم توقع رکھتے ہیں کہ آپ کی علمی و تحقیقی برتری، کشادہ ظرفی اور وسیع النظری اس مسِ خام کو کندن بنا کر جگمگا دے گی اور آپ اپنے فن کیمیا اثر سے استفادہ کا موقع عنایت فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔

کتاب کے اشاعتی مرحلہ پر یہ بات میرے لئے انتہائی مسرت کی ہے کہ گرامی قدر استاذ محترم مخدوم گرامی حضرت مولانا محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ العالی نے کتاب پر مقدمہ تحریر فرما کر اس کی قدر و قیمت میں اضافہ فرما دیا ہے۔ مولانا مدظلہ دارالعلوم میں نقدِ ادب کے استاذ رہے ہیں اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے قافلہ سالار ہیں، دارالعلوم

ندوۃ العلماء کے سرپرست وناظم اعلیٰ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر نشین کی حیثیت سے ملت اسلامیہ ہندیہ کے قائد ورہنما ہیں۔ حضرت مولانا نے اپنی گرانقدر مصروفیات سے وقت نکال کر مقدمہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ یہ اس کتاب کے لئے بجائے خود ایک سند ہے، کیونکہ حضرت مولانا کا علمی، ادبی، فکری، دینیا اور ادبی مقام ومرتبہ متفق ومستند ہے اور یہ میرے لئے یقیناً اعزاز کی بات ہے میں بصمیم قلب مربی گرامی حضرت مولانا کا شکر گزار ہوں اور انتہائی ممنون کرم بھی کہ حضرت مولانا نے مراحم خسروانہ سے نواز کر عالمی رابطۂ ادب اسلامی کی طرف کتاب کی اشاعت کا فیصلہ فرما کر بڑا کرم فرمایا اور مجھے بہت سی الجھنوں اور پریشانیوں سے بچالیا۔ اردو کے ادبی ناشرین کمیاب تو تھے ہی اب نایاب بھی ہورہے ہیں، ایسی صورت حال میں کسی ضخیم ادبی کتاب کی اشاعت جو خیر سے اسلامی کا طغرۂ امتیاز بھی رکھتی ہو کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو صحت وعافیت کے ساتھ اپنے حفظ وامان میں رکھے اور بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔

حضرت مولانا محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہم العالی کے شکریہ کے ساتھ رابطۂ ادب اسلامی کے جملہ اراکین اور نشر وشاعت کے ارکان بورڈ کا بھی شکر گزار ہوں خصوصیت کے ساتھ استاذ گرامی مولانا نذر الحفیظ ندوی صاحب اور جناب اقبال احمد صاحب ندوی کا کہ انھوں نے سعی بلیغ فرما کر کتاب کو زیور طبع سے آراستہ کیا اور معیاری وخوبصورت انداز میں کتاب طبع ہو کر منظر عام پر آسکی۔ امید ہے کہ باذوق قارئین وشائقین ادب اور اہل علم وادب کی بارگاہ میں کتاب پذیرائی کی مستحق قرار پائے گی کیونکہ ارباب نقد ونظر کی قدر افزائی ہی توقیر علم وادب کا باعث ہے اور۔ ع

دل چاہتا ہے حرف کی توقیر دیکھنا

اشاعت کے بعد آزاد کے اس نظریہ پر ماہرین لسانیات اور ادبی محققین نے موافق مخالف نظریات پیش کئے اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اس طرح آزاد کا یہ چھوٹا سا جملہ لسانیاتی تاریخ کی طویل ترین بحثوں کی بنیاد بن گیا حتی کہ ماہرین لسانیات اردو کے آغاز کا تعین کرنے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے ۵۰۰ سال قبل تک جا پہنچے......!! ڈاکٹر شوکت سبزواری رقمطراز ہیں:

"اردو مدھیہ دیش کی اس قدیم زبان کی آخری کڑی ہے مدھیہ دیش کی اس زبان کو اردو کا قدیم ترین روپ دھارنے سے پہلے تین ارتقائی دوروں سے گذرنا پڑا جن میں کا ہر دور کم وبیش ۵۰۰ سال کا ہے پہلا دور ۵۰۰ سال ق م سے شروع ہو کر ولادت مسیح پر ختم ہوا دوسرا دور ۵۰۰ مسیحی پر اختتام کو پہنچا اسے پراکرت دور کے نام سے یاد کرتے ہیں ۵۰۰ مسیحی سے ۱۰۰۰ مسیحی تک کا دور اپ بھرنش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔" (اردو لسانیات صفحہ ۱۶)

اُردو کے سلسلہ میں اس محیر العقول تحقیق کا اصل سبب یہ ہے کہ ماہرین لسانیات نے اردو کا شجرۂ نسب آریائی لسانی خاندان میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اس کے لئے انہیں پہلے خود آریائی زبان کا شجرۂ نسب درست کرنا پڑا اور اردو کے بہانے آریائی زبانوں کی تحقیق وتدقیق کا سلسلہ چل پڑا کہ آریا ہندوستان میں کب آئے تھے کتنے گروہوں کی شکل میں وارد ہوئے ان کی زبان مشترک تھی یا الگ الگ، اگر الگ الگ تھی تو کون کون سی زبانیں تھیں ہندوستان میں کہاں کہاں آباد ہوئے اور آپس میں رابطہ کی زبان کیا رہی کیا کوئی غالب اور مشترک زبان تھی یا نہیں اور تھی تو کس علاقہ کی تھی اور کون سی تھی۔ ماہرین لسانیات نے اس قسم کی بڑی تفصیلات فراہم کی ہیں یہ طول طویل بحثیں اس لئے زور پکڑتی چلی گئیں کہ اس بات کی تحقیق ہوسکے کہ آخر اردو کی تشکیل وتخلیق میں اصل کردار

کس زبان کا ہے اس سلسلہ میں کسی ایک زبان کی تعیین اور فیصلہ آسان بھی نہیں تھا کیونکہ وسیع وعریض غیر منقسم ہندوستان میں بودو باش اختیار کرنے والے آریائی قبائل کی زبانوں میں کسی وحدت کا سراغ نہیں ملتا مختلف زبانیں بنتی اور بکھرتی رہیں اور اس عمل پر صدیاں بیت گئیں زبانوں کی تخلیق وارتقاء کا عمل مختلف سمتوں میں جاری رہا آریائی خاندانوں کی زبانوں کا جائزہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مختلف ادوار میں آریائی خاندان السنہ کی مختلف زبانوں کو عروج حاصل ہوا اور بڑے علاقہ میں وہ واحد زبان کی حیثیت سے بولی بھی جانے لگیں لیکن جس زبان کو بھی عروج واعتبار حاصل ہوا وہ وسطی ہندوستان میں بولی جانے والی زبان ہی رہی ہے کیونکہ وسطی ہندوستان کو آریائی عہد میں بھی سیاسی ومذہبی اہمیت ومرکزیت حاصل رہی ہے اور یہیں کی زبان معتبر ومستند سمجھی جاتی رہی ہے۔

ماہر لسانیات نے جو دعوے کئے ہیں جو نظریات پیش کئے ہیں اور دلائل کا جو انبار لگایا ہے اس میں چند نقاط ایسے ضرور ہیں جو تقریباً متفق علیہ ہیں پہلا یہ کہ اردو آریائی لسانی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے دوسرا یہ کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط اور میل جول کے نتیجہ میں وجود میں آئی ماہرین لسانیات کے نزدیک تیسرا متفق علیہ نقطہ یہ ہے کہ آریائی زبانوں میں مدھیہ دیش کی زبان ہر دور میں معتبر ومستند رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ خود مدھیہ دیش میں بھی ایک مشترک اور غالب زبان مسلسل نہیں رہی ہے بلکہ یہ بھی بدلتی رہی ہے، ہم ماہرین لسانیات کی پیش کردہ تمام تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ اردو کی تخلیق اور تعمیر وتشکیل میں مدھیہ دیش میں بولی جانے والی آخری زبان یعنی مسلمانوں کی آمد سے قبل کی آخری آریائی بولی مغربی ہندی یا کھڑی بولی تھی جو مدھیہ دیش کی مستند ومعتبر زبان تھی لیکن خود مدھیہ دیش کی بھی تعیین ضروری ہے مدھیہ دیش کی حدود کے سلسلہ میں بھی اگرچہ تھوڑا سا اختلاف ہے مگر بیشتر ماہرین لسانیات نے اسے مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب کا علاقہ قرار دیا ہے،

مسعود حسین خاں نے ایک جگہ اس کی وضاحت ذرا تفصیل سے کی ہے۔

"مغربی ہندی کے حدود تقریباً" وہی ہیں جو مدھیہ دیش کے ہیں یہ مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک اور شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیاچل اور بندیل کھنڈ تک بولی جاتی ہے"

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۸۰ بحوالہ اردو زبان کا آغاز ص ۵۲)

آغاز اردو کے مختلف نظریات: ماہرین لسانیات کی پیش کردہ تفاصیل کی روشنی میں کھڑی بولی اور مغربی ہندی اردو کی بنیاد قرار دی گئی ہے کھڑی بولی اور مغربی ہندی کا اختلاف محض لفظی ہے اصلاً دونوں ایک ہی ہیں، اگر ہم بات یہ تسلیم بھی کرلیں کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت تک آریائی زبانوں کی ترقی یافتہ شکل مغربی ہندی وہ آخری بولی تھی جس سے مسلمانوں کا اختلاط ہوا تو گویا ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کے علاوہ دیگر بولیاں اور زبانیں معدوم ہو چکی تھیں حالانکہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت تک کسی لسانی وحدت کا سراغ نہیں ملتا لہٰذا صرف کھڑی بولی، مغربی ہندی کو اردو کی تخلیقی اصل قرار دینا بظاہر مشکل ہے کیونکہ وسطی ہند سے مسلمانوں کا اتصال اپنی آمد کے صدیوں بعد ہوا اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے زبان وادب کی تاریخ کے محققین نے اختلاف کیا ہے اور اردو کے آغاز کے سلسلہ میں مختلف نظریات منظر عام پر آئے ہیں اب تک جن نظریات کو ثابت یا رد کرنے کی بحثیں ہو چکی ہیں ان کا صرف سرنامہ اور عنوان درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ اردو کے آغاز کی بحث کس قدر پیچیدہ کتنی گنجلک اور کیسی متنازع ہے چند عنوانات اس طرح ہیں سندھ میں اردو، بنگال میں اردو، پنجاب میں اردو، گجرات میں اردو، مدراس میں اردو، میسور میں اردو، دکن میں اردو، بہار میں اردو، صوبہ سرحد میں اردو،

بلوچستان میں اردو اور دہلی میں اردو، ان میں سے ہر ایک نظریہ پر طویل ترین بحثیں، مضامین اور مستقل تصانیف وجود میں آچکی ہیں جو دلائل وشواہد، آثار وقرائن تحقیق وتجزیات اور علم ومعلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں لیکن سب ایک دوسرے سے مختلف سمتوں میں رواں دواں ہیں یا متوازی خطوط پر گامزن ہیں اور مسئلہ بدستور لاینحل ہے رسالہ نقوش کے مدیر محمد طفیل نے ادبی معرکے نمبر ستمبر ۱۹۸۱ء میں شائع کیا ہے انھوں نے اس معرکہ پر کہ اردو کب اور کہاں پیدا ہوئی مواد پیش کرتے ہوئے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا ہے:

"محققین نے اردو کو غلط فہمی کی بنا پر ہندی، سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھ کر لاطائل بحثوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا اور اپنے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کی جس سے غلطیوں اور غلط فہمیوں میں اضافہ ہی ہوتا گیا یہ غلط فہمیاں یورپ کے ماہرین لسانیات نے پیدا کی ہیں جن پر ہمارے ملک کے محققین نے تحقیق وتدقیق کی ہے۔" (نقوش ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۹)

نقوش کی اشاعت کے مزید ۱۲ سال بعد ۱۹۹۳ء میں خورشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب "اردو زبان کا آغاز" میں اسی شکوہ کو دہراتے ہوئے لکھا ہے:

"مختلف ماہرین لسانیات نے اردو زبان کے آغاز سے متعلق جو نظریے پیش کئے ہیں ان میں ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کی ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اکثر ایک ہی ماہر لسانیات کی ایک ہی کتاب میں متضاد بیانات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

(اردو زبان کا آغاز ص ۳۸)

قریب ترین عہد کے مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی

متفقہ فیصلہ یا نظریہ سامنے نہیں آسکا ہے دراصل اس بات کی کوشش بھی نہیں کی گئی کہ اب تک کی تمام تر تحقیقات کو سامنے رکھنے کے بعد متفقہ خطوط و نقوش اور مشترک اقدار و نظریات کو لے کر کم از کم نصابی ضرورت اور نصابی سطح کے لئے ہی سہی اردو کے آغاز و ابتداء کا کوئی ایک نظریہ متعین کر دیا جائے۔

اُردو کی جائے پیدائش (سندھ)

اردو زبان کی جائے پیدائش کے باب میں بھی شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف علاقائی عصبیت کا شکار ہے ''اردو سندھی کے لسانی روابط'' میں شرف الدین اصلاحی نے مؤرخین ادب کو چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان کی پیدائش کے متعلق اردو ادب کے مؤرخین تین گروہ میں منقسم ہیں ان میں سے ہر ایک کا نظریہ اردو زبان کی پیدائش کے بارے میں علیحدہ ہے پہلے گروہ کی ترجمانی مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں دوسرا نظریہ قائم کرنے والے پروفیسر نصیرالدین ہاشمی ہیں ان کا کہنا ہے کہ اردو نے پہلے جنوبی ہند میں جنم لیا اور تیسرے خیال کو محمود شیرانی مرحوم نے ادبی دنیا سے روشناس کرایا اور پنجاب میں اردو کی ابتدائی نشو و نما کا حال بیان کیا۔ چوتھا نظریہ بھی ہے کہ اردو زبان نے سب سے پہلے سندھ میں جنم لیا ہے اس صوبے کو جہاں باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے وہاں اردو زبان کو ہندوستان سے روشناس کرانے کی بھی عزت حاصل ہے کیونکہ یہ وہ حصہ ہے جہاں سب سے پہلے عربی اور فارسی زبانیں آئیں اور مقامی زبان سے اختلاط پر ایک نئی زبان پیدا ہوئی جسے اُردو کہتے ہیں۔''

(نقوش ادبی معرکے نمبر ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۶)

اردو زبان کی پیدائش کے سلسلہ میں سندھ، پنجاب، گجرات، میسور، مدراس، دکن دلی وغیرہ ہر خطے کے اہل علم نے اردو کے آغاز کو اپنے اپنے خطے سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے دلائل بھی فراہم کیے ہیں اور یہ محض اتفاق ہے کہ ہر علاقہ کے سلسلہ میں دلائل شواہد آثار وقرائن کا وقیع ووزنی سلسلہ ہے لیکن مختلف علاقوں کے اہل تحقیق کے پیش کردہ دلائل کے باجود پتہ نہیں کیوں یہ بات تسلیم نہیں کی جاتی کہ مختلف وقتوں میں مختلف محاذ پر بیک وقت زبان متاثر ہونا شروع ہوئی اور مختلف علاقوں میں یہ عمل مختلف بولیوں کے باہم اختلاط اور ردوقبول اخذ وعطا کے نتیجہ میں عرصۂ دراز تک یعنی صدیوں تک جاری رہا اور رفتہ رفتہ اس عمل کے نتیجے میں نئی زبان وجود پذیر ہوتی رہی جبکہ یہ تاریخی صداقت بھی موجود ہے کہ مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں کسی ایک راہ سے نہیں ہوئی سندھ گجرات، ملبار اور مدراس کے راستوں سے مسلمان بادشاہ تجار اور بزرگان دین برابر ہندوستان آتے رہے اور مقامی لوگوں کے ساتھ ان کا اختلاط جاری رہا ہاں البتہ یہ حقیقت ہے کہ بڑے وسیع پیمانہ پر اختلاط سب سے پہلے محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے مسلم فاتحین اور اہل سندھ کے درمیان عمل میں آیا اور اس کا سلسلہ ۷۱۲ء سے ۱۰۲۶ء تک قائم و برقرار رہا اس طویل عرصہ میں سندھ اسلامی حکومت کے زیر نگیں رہا حکیم سیّد شمس اللہ قادری بعض فارسی اور انگریز مورخین کے اس بیان کی کہ محمد بن قاسم کے بعد سندھ کی اسلامی حکومت تباہ ہوگئی تھی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عربی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ الواثق باللہ کے زمانہ تک دربار خلافت سے سندھ میں گورنر مقرر ہو کر آتے تھے اور منصورہ ان کا مستقر حکومت تھا۔ جب خلافت بغداد کو انحطاط شروع ہوا تو سندھ میں خلفاء کی حکومت برائے نام رہ گئی اور ملک میں عربوں

کے جو قبائل آباد تھے۔ ان کے سرداروں نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کرلیں یہ حکومتیں کشمیر کی سرحد سے. بحر فارس اور سیستان اور مکران تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے حکمران سلاطین شنسبانیہ کے تسلط تک ملک سندھ پر قابض و متصرف رہے...... سندھ کے فاتحین عرب مسلمان تھے یہ لوگ جب سندھ میں آئے تو اپنی عربی زبان اور عربی تمدن لیتے آئے اور اسے ملک میں اس قدر پھیلایا کہ سندھ شام و عراق کا نمونہ بن گیا سندھ میں کم و پیش پانچ سو سال ان کی حکومت رہی اس عرصہ میں عراق و عرب کے سینکڑوں قبائل نے آکر سندھ میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ اس قدر اختلاط بڑھایا کہ دونوں میں امتیاز کرنا اجنبی کے لئے دشوار ہو گیا۔"

(اردوئے قدیم ص ۴۵ نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء)

پیر سید حسام الدین راشدی لکھتے ہیں کہ:

"تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے سندھ میں ہوئی عربوں کی حکومت سندھ و ملتان پر ۷۱۲ء سے ۱۰۲۶ء تک رہی انھوں نے اپنے نظام خیال کی قوت سے ان علاقوں میں وحدت کا تصور پیدا کر کے معاشرتی زندگی کی رفتار کو نہ صرف تیز کر دیا بلکہ تہذیبی عوامل میں بھی ایک نئی روح پھونک دی اس نئی سیاسی معاشرتی صورت حال نے لسانی سطح پر ایک ایسی زبان کی ضرورت کو ابھارا جس کے ذریعہ اس علاقہ میں رہنے بسنے والی مختلف اقوام ایک دوسرے سے ابلاغ کر سکیں سندھ جس اسلامی لشکر نے فتح کیا اس میں فارسی اور عربی بولنے والے لوگ شامل تھے۔ وہ عمل ، جو عربوں کی فتح نے

سرزمین ایران میں کیا وہی عمل سندھ میں کیا یہ سیاسی تقاضہ بھی تھا اور
وقت کی اہم ضرورت بھی جب مسلمان سندھ اور پنجاب پر قابض
ہوئے تو یہاں بھی ضرورت محسوس ہوئی ...... یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ
مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے اور یہیں ان کی زبان عربی پھر
فارسی کا ہندی سے ارتباط واختلاط شروع ہوالہذا یہ ایک واضح اور یقینی
امر ہے کہ اردو کا اصلی مولد سندھ ہے"

(رسالہ اردو کراچی اپریل ۱۹۵۱ء)

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی محققانہ تصنیف زبان اور علم زبان میں تحریر فرماتے ہیں:

"عربی وفارسی بولنے والے لوگ سب سے پہلے سندھ میں
آباد ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ پونے دوسو سال اس علاقہ پر ان کا تسلط
رہا اس بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی کا قیاس یہ ہے کہ اردو کا ہیولی
سندھ میں تیار ہوا ہوگا لیکن ہمارے پاس اس وقت اُس زمانے کے
تحریری آثار موجود نہیں ہیں اس سلسلے میں شاید ملتان کا علاقہ جو
سندھ اور پنجاب کی سرحدوں پر واقع سے کچھ اہمیت رکھتا ہے یہ
مقام مسلمانوں کی حکومت سندھ کے زمانے میں اور بعد میں بھی
علماء کا بڑا مرکز رہا اور دکنی جو دکن سے آنے والے ابتدائی دور کے
مسلمانوں کے ساتھ اس علاقے میں آئی تھی بعض خصوصیتوں میں
ملتانی سے مشابہت رکھتی ہے شیخ فریدالدین گنج شکر جن کا کچھ اردو
کلام دستیاب ہوا ہے اور اردو کے اولین آثار میں سے ہے ملتان ہی
سے دہلی آئے تھے۔" (نقوش ادبی معرکہ نمبر ۱۹۸۱ء)

پنجاب میں اردو: مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی

ہے کہ اردو کی جائے پیدائش سندھ ہے اسی طرح پنجاب کو اردو کی جائے پیدائش ثابت کیا جاتا ہے اس نظریہ کے سب سے بڑے مدعی اور محقق محمود خاں شیرانی ہیں۔ جنھوں نے بڑی محنت و جانفشانی سے ''پنجاب میں اردو'' نامی کتاب مرتب کی اور زبردست دلائل فراہم کئے ہیں اور ایسی حیرت انگیز تحقیقات پیش کی ہیں کہ ایک عرصہ تک لوگوں نے یہ نظریہ تسلیم کرلیا تھا کہ واقعی اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہی ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ سحر ٹوٹ گیا پروفیسر محمود شیرانی اردو کے آغاز کی بحث کو محمود غزنوی کے عہد سے شروع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم وبیش ایک سو ستر سال تک رہی اس عرصہ میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہونا لازمی بات ہے، سرکاری ضرریات کی بنا پر بھی شاہی عہدیداروں اور ملازمین کے لئے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا آخر غزنویوں کے قبضے میں تمام پنجاب سندھ ملتان ہانسی، سرستی اور میرٹھ تک ان کے قبضے میں تھے بلکہ یوں کہیے دہلی کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے اتنے بڑے علاقے کے مالی وملکی انتظام کے لئے عمال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی چونکہ لاہور ہند کا دارالسلطنت تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اس خطہ کی زبان کو اس عہد کی حکومت اور مسلمانوں نے ترجیح دی ہوگی یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان پنجاب میں آباد رہے انہوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا اور جب پنجاب سے دہلی گئے تب برج بھاشا اختیار کی ایک ناقابل قبول خیال ہے جو درایت کے منافی ہے اس لئے کہ ان کو نہ صرف سرکاری ضروریات کی بنا پر ایسی زبان کی ضرورت تھی بلکہ خود مسلمانوں کی اقوام کو بھی ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کے

لئے اس کی ضرورت تھی تعلیم یافتہ گروہ کے لئے یہ مشکل فارسی نے حل کر دی تھی لیکن ان کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو ان کی آبادی کا جز و اعظم تھا فارسی سے قطعاً نابلد تھا یہ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے انہوں نے اس کا نام ہندی رکھ دیا خود غزنویوں نے شروع ہی سے ہندی زبان کی طرف توجہ دی تھی۔ " (نقوش ادبی معرکہ نمبر ۱۹۸۱ء)

دوسری جگہ مسلمانوں کے پایۂ تخت لاہور سے دہلی منتقل ہو جانے کے پس منظر میں رقمطراز ہیں:

"قطب الدین ایبک کے ساتھ جو لوگ ہجرت کر کے دہلی آگئے ہیں اگر چہ یوں تو ان میں مختلف اقوام شامل تھیں مثلاً ترک (جو بڑے عہدوں پر فائز تھے) خراسانی جو مناصب دیوانی پر سرفراز تھے خلج، افغان اور پنجابی لیکن ان سب سے زیادہ تعداد مؤخر الذکر کی تھی جو فوجی اور دیوانی خدمات کے علاوہ زندگی کے اور پیشوں اور شعبوں پر متصرف تھے، اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے اردو چونکہ پنجاب میں بنی ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو بہر حال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں جس میں خود مسلمان تو میں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانے میں وہ بولتے

رہے۔" (پنجاب میں اردو۔بحوالہ اردو زبان کا آغاز)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور بھی اسی نظریہ کے موئید ہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی وہ فرماتے ہیں کہ:

"سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۲۷ء میں صوبہ پنجاب کو فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کرلیا تھا اور اپنی فاتح فوجیں مستقل طور پر لاہور میں متعین کردی تھیں محمود غزنوی کی اولاد ۱۱۸۷ء تک پنجاب پر قابض رہی اس سال ان کے قدیم اور موروثی دشمن غوریوں نے محمد غوری کی سر کردگی میں (انھیں) شکست دی وہ اس سے پہلے غزنی کو تباہ کر چکے تھے دہلی کا پہلا سلطان قطب الدین ایبک تھا یہ ترکستان کا باشندہ اور محمد غوری کا ملازم تھا اور بعد کو اس کے لشکر کا سپہ سالار اعظم ہو گیا تھا اسی نے ۱۱۹۳ء میں دہلی فتح کی اور ۱۲۰۶ء میں اپنے آقا محمد غوری کی وفات کے بعد سلطان کا لقب اختیار کیا اس تاریخ سے برابر بدیسی لشکر دہلی میں مقیم رہا عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان دہلی میں پیدا ہوئی لیکن یہ حقیقت ہمیں نہیں بھولنی چاہیے کہ تخت دہلی پر ایبک کے متمکن ہونے سے تقریباً دوسو برس پہلے فارسی بولنے والے سپاہی پنجاب میں داخل ہو چکے تھے اور وہاں مستقل طور پر بود و باش اختیار کرلی تھی جس زبان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دہلی میں وجود میں آئی وہ حقیقتاً صدیوں پہلے لاہور میں جنم لے چکی تھی۔"

(نقوش ادبی معرکہ نمبر ص ۱۲۷)

ی مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"یہ بات عجیب ہے کہ اردو اور پنجابی کے اصل تعلق کی نسبت

کسی یوروپی ماہر لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہوا اس کی طرف سب سے پہلے ہندوستانیوں ہی کی توجہ منعطف ہوئی اور ہندوستانی اہل قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے بنیادی تعلق کو سب سے پہلے بے نقاب کیا چنانچہ ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں اس خیال کو نہایت واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی راقم الحروف اردو کے آغاز و ارتقا کے موضوع پر لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھا۔ میرے مطالعہ اور تلاش و جستجو میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہوئی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانہ میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ، گنگ و جمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا برج بھاشا کھڑی بولی اور جدید زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں چنانچہ میں نے اپنے مقالہ میں اس نظریہ کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا اس مقالہ کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلسلے میں جو علمی تحقیقات تھیں ان کو کتابی صورت میں ''ہندوستانی فونی ٹیکس'' کے نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس سے انگریزی زبان میں شائع کیا بعد میں اس نظریے کی مزید وضاحت اور اہل اردو میں اشاعت کے لئے ایک اردو کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' لکھی جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی غرض ۱۹۲۸ء کے بعد اہل اردو اور ماہرین لسانیات کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اردو کے سرزمین پنجاب میں پیدا ہونے اور لسانی نشو و نما حاصل کرنے کا

کسی یوروپی ماہر لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہوا اس کی طرف سب سے پہلے ہندوستانیوں ہی کی توجہ منعطف ہوئی اور ہندوستانی اہل قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے بنیادی تعلق کو سب سے پہلے بے نقاب کیا چنانچہ ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں اس خیال کو نہایت واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی راقم الحروف اردو کے آغاز وارتقا کے موضوع پر لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھا۔ میرے مطالعہ اور تلاش وجستجو میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہوئی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانہ میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ، گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا برج بھاشا کھڑی بولی اور جدید زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں چنانچہ میں نے اپنے مقالہ میں اس نظریہ کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا اس مقالہ کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلسلے میں جو علمی تحقیقات تھیں ان کو کتابی صورت میں ''ہندوستانی فونی ٹیکس'' کے نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس سے انگریزی زبان میں شائع کیا بعد میں اس نظریے کی مزید وضاحت اور اہل اردو میں اشاعت کے لئے ایک اردو کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' لکھی جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی غرض ۱۹۲۸ء کے بعد اہل اردو اور ماہرین لسانیات کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اردو کے سرزمین پنجاب میں پیدا ہونے اور لسانی نشوونما حاصل کرنے کا

نظریہ مستحکم اور مسلم الثبوت ہو گیا۔'' (اردو لسانیات ص ۴۱، ۴۲)

ان اقتباسات کے پیش نظر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سرزمین پنجاب کو اردو کے مولد و منشا ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن ابھی گجرات دکن بنگال میسور مدراس اور دہلی سے اردو کے انتساب تخلیق کا قضیہ باقی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں کے اہل تحقیق کے دعووں کا بھی ذکر کر دیا جائے پھر بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے کہ حقیقت منتظر کی جلوہ نمائی کی آخر کیا شکل ہے۔

دکن میں اُردو:

دکن یعنی جنوبی ہند کے بڑے حصے (کرناٹک، آندھرا پردیش اور مہاراشٹر) میں بولی جانے والی اردو زبان کو دکنی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اصلاً یہ اردو ہی ہے لیکن اپنی بعض خصوصیات تلفظ و ادائیگی لہجے اور بعض قواعد میں یہ شمالی ہند کی اردو سے مختلف اور مستقل بالذات ہے اسی فرق کے اظہار کے لئے اسے باقاعدہ دکنی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ڈاکٹر گیان چند جین دکنی اردو کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''دکنی، اردو کی ایسی بولی ہے جو زمان اور مکان دونوں کے تفاوت کی آفریدہ ہے ادبی دکنی اور شمالی ہند کی اردو میں علاقائی بُعد بھی ہے زمانی بھی دکنی مقدم ہے شمالی اردو مؤخر اردو اور دکنی کا یہی تعلق ہے کہ دکنی اردو کی ایک پارینہ بولی ہے۔''

(مضمون دکنی کے لسانی رشتے ڈاکٹر گیان چند جین مشمولہ دکنی اردو مرتب عبدالستار دلوی ص ۳۶۵)

پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:

> ''دکنی قدیم اردو کا وہ روپ ہے جس کی ادبی نشوونما ابتدائی زمانہ میں دکن اور گجرات میں چودھویں صدی کے نصف آخر سے ستر ہویں صدی کے اواخر کے دوران میں ہوئی یہ زبان بھی جدید ہند

آریائی کی ایک شاخ ہے اوراس کا آغاز بھی ہند آریائی زبانوں
پنجابی، سندھی، مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی، مرہٹی، اڑیا، بنگالی اور
آسامی کے ساتھ ساتھ ہوا لیکن نشو ونما کے اعتبار سے یہ اودھی کی
معاصر ہے دکنی کا سارا سرمایۂ الفاظ ہند آریائی ماخذوں پر مبنی ہے اور
قواعد کا ڈھانچہ بھی آریائی بولیوں سے مطابقت رکھتا ہے''

(مضمون دکنی زبان پروفیسر عبدالقادر سروری مشمولہ دکنی اردو عبدالستار دلوی ص ۳۲۹)

پروفیسر نصیر الدین ہاشمی نے اپنی مشہور تصنیف ''دکن میں اردو'' میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی و تاریخی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ دکن میں مسلمانوں کی آمد کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علاء الدین خلجی اور ملک کافور کے فتوحات دکن کے پہلے کئی
ایک صوفیائے کرام دکن کے مختلف حصوں میں سکونت کر کے اپنے
اخلاق حسنہ کے باعث ہندوؤں میں ہر دلعزیز ہو گئے تھے ان کی تبلیغ
اور ہدایت جاری تھی۔'' (دکن میں اردو)

صوفیاء کرام کی آمد کے بعد سیاسی حالات وانقلابات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مسلمان فاتحین شمالی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے
تو اوّل انھوں نے پنجاب میں قیام کیا مگر اس کے بعد دہلی کی جانب پیش
قدمی کی مسلمانوں کے صدہا خاندان جو ترک اور افغان تھے جن کی زبان
عام طور پر زیادہ تر فارسی تھی پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے اس
زمانے میں یہاں ''جدید ہند آریائی دور کی پراکرت'' زبان بولی جاتی
تھی اسی دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور
اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی......

شمال کے فاتحین نے جب ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کر لی تو یہ نئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی تھی اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رُخ کیا اولاً علاء الدین خلجی پھر ملک کافور نے دکن پر مسلسل حملے کئے ۷۱۰ھ میں راس کماری تک علائی علم پہنچ گیا اس کے بعد ایک بہت بڑا سیلاب محمد تغلق کے زمانے میں اٹھا اور دکن میں جا کر رکا، محمد تغلق نے نہ صرف دکن پر فوج کشی کی بلکہ دیوگڈھ کو دولت آباد سے موسوم کر کے اس کو اپنا پائے تخت بھی قرار دے دیا اس کے باعث نہ صرف فوجی اشخاص بلکہ اہل حرفہ اور تجار بھی دہلی چھوڑ کر دکن آ گئے اگر چہ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے دہلی کو مراجعت کی مگر ایک بڑے گروہ نے یہاں بود و باش اختیار کر لی............

یہ فاتح جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ آزادانہ نشو و نما حاصل کرنے لگی کیونکہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے نہیں تھی............شمال میں اب تک اس جدید زبان کا کوئی نام رائج نہیں تھا مگر دکن میں وہ دکنی کے نام سے موسوم ہوئی۔'' (دکن میں اردو نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۳۲، ۱۳۴)

دکن میں اردو علاء الدین خلجی کے حملوں کے توسط سے پہنچی اور محمد تغلق کے دہلی سے دولت آباد کو پائے تخت بنا لینے اور دہلی کی بہت بڑی آبادی کو دولت آباد منتقل کر دینے کے بعد پروان چڑھی اور تیزی سے پھیلی محمد تغلق زیادہ طویل عرصہ تک یہاں ٹھہر نہیں سکا اور دہلی کی طرف مراجعت اختیار کر لی لیکن اس کی حکومت بھی زیادہ دنوں تک یہاں قائم نہیں رہ سکی صرف اکیس سال بعد اس کے ایک ماتحت افسر ظفر خاں نے بغاوت کر کے اپنی

آزادی کا اعلان کر دیا اور علاء الدین حسن گنگو بہمنی کا لقب اختیار کر کے بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی بہمنی سلطنت تقریباً ساڑھے تین سو سال تک قائم رہی اس سلطنت کے دور میں دکنی اردو خوب پھلی پھولی اور مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی خلجی اور تغلق کے توسط سے زبان اپنے بالکل ابتدائی عہد میں دکن وارد ہوئی تھی اُسے ہندوی کہنا زیادہ مناسب ہوگا جو اردو کی ابتدائی شکل تھی اُردو نے بعد ازاں دہلی میں ''اُردوئے معلیٰ'' کی شکل اختیار کر لی اور اُردو کہلائی جانے لگی۔

گجرات میں اردو:

سید ابو ظفر ندوی نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''تاریخ گجرات'' میں مسلمانوں کی گجرات آمد کا سلسلہ پہلی صدی ہجری سے جوڑا ہے اور اس کے دلائل بھی فراہم کئے ہیں عہد اموی اور عہد عباسی کے مقرر کردہ بعض گورنروں کے نام بھی نقل کئے ہیں اور عربوں کے بعض قبائل کے گجرات میں آباد ہو جانے کا بھی ذکر تفصیل سے کیا ہے سید سلیمان ندویؒ عرب و ہند کے تعلقات میں لکھتے ہیں کہ

> ''ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں عرب اور ایرانی تاجر اور مہاجر گجرات میں وارد ہوئے لسانی نقطۂ نظر سے ان لوگوں کا ورود ہند بہت اہمیت رکھتا ہے ان لوگوں نے کھمبات، راندیر قریب سورت بھروچ (بھاڑھوج)، تھانہ، سوپارا، چیمور وغیرہ شہروں میں اقامت اختیار کر لی تھی تھانہ چیمور میں یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں آباد تھے۔

(عرب و ہند کے تعلقات سید سلیمان ندوی)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی گجرات کے حدود اربعہ کی تعیین کرتے ہوئے گجرات میں مختلف قوموں کی آمد کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

> ''عہد قدیم میں ملک گجرات کی جغرافیائی حدود اور لسانی

ہوتا ہوگا اور تجارتی وسماجی اغراض کی بنا پر ایک ملواں ٹوٹی پھوٹی بازاری بولی بھی رواج پا گئی ہوگی یہ بولی عربی فارسی اوراپ بھرنش کے گجرات میں رائج روپ کے تانے بانے سے تیار ہوگئی۔"

(گجری اور دکنی اردو، ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ص ۲۱ ر مشمولہ دکنی اردو عبدالستار دلوی)

"علاء الدین خلجی کی فتح گجرات کے بعد فارسی زبان کے اثر نے تیزی سے اپنے قدم جمانے شروع کیے یہ سلسلہ تقریباً ایک سو سال تک جاری رہا علاء الدین خلجی نے سارے علاقہ کو سو سو مواضعات میں تقسیم کر کے انتظامی حلقے بنادیئے اور ہر حلقے پر ایک ایک ترک افسر جو شمال سے بھیجا گیا تھا مقرر کیا یہ ترک افسر امیر صدہ کہلاتے تھے اپنے اپنے حلقہ کے حقیقی حکمراں تھے اس انتظامی ضرورت کے تحت بے شمار ترک خاندان اپنے متوسلین کے ساتھ گجرات کے طول وعرض میں آباد ہو گئے اور انھیں کے ساتھ اردو زبان کی جڑیں بھی جو معاشرتی اور اور انتظامی سطح پر ابلاغ کا واحد ذریعہ تھی گجرات کے سارے علاقے میں پھیل گئیں......

۱۳۹۷ء میں سلطنت دہلی کے دوسرے بادشاہ ناصر الدین محمود شاہ تغلق نے بھی گجرات کی طرف ہجرت کی......غرض کہ امیران صدہ کے نظام نے گجرات کے پرامن ومستحکم معاشی حالات نے اور حکمران گجرات کے فراخ دلی علم پروری اور اپنے دین کو پھیلانے کے جذبے نے ایسے سازگار حالات پیدا کر دیئے کہ مسلمانوں نے من حیث القوم اردو کو اپنی زبان تسلیم کر لیا۔"

(مراۃ احمدی عامر مرزا محمد حسن خاں۔ بحوالہ نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء)

برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔اس وقت بھی ہر قطعے میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت خواص کی زبانوں کے لئے باعث برکت تھی دفعۃً زمانے کے شعبدہ باز نے ایک اور رنگ بدلا یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا اس نے پھر ملک ومذہب کو نیا انقلاب دیا اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔''

(آب حیات مولانا محمد حسین آزاد)

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

''ایرانی بہن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گزرا جو یہاں دوسو برس کے بعد گذرا اور اس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی بہر حال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں رائج الوقت فارسی بولتے تھے ہندوؤں سے ہندی کے الفاظ ملا جلا کر گزارہ کر لیتے تھے......ادھر سنسکرت تو دیو بانی یعنی زبان آسمانی تھی اس میں ملیکش کو دخل کہاں؟ البتہ برج بھاشا نے اس بن بلائے مہمان کو جگہ دی دھرم وان ہندو سالہا سال تک ملیکش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفر رہے مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا لین دین کرنا تھا لفظوں کے بولے بغیر گذارا نہ کر سکے دو قوموں کے ارتباط

میں اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی اسباب ہیں۔

("آب حیات" مولانا محمد حسین آزاد)

اس سے آگے دو قوموں کے درمیان ارتباط و اختلاط کے اثرات و اسباب گنائے ہیں اور مقامی بھاشاؤں پر مسلمانوں کے عربی و فارسی اثرات کا جائزہ لیا ہے اس کے بعد اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ خود مسلمانوں نے اور ان کی زبان نے مقامی طور پر کیا اثرات قبول کیے اس کے بعد لکھتے ہیں اور یہی بیت القصید ہے۔

"اس عہد میں مسلمانوں کی زبانوں کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا جن کے باپ دادا کئی پشت یہیں کی خاک سے اٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے انھیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سر رشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی ہوتی ہوگی تازہ ولایت آدھی اپنی آدھی ان کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے ان زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں وہی امیر خسروؔ کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ ۷۰۰ھ میں یہاں مسلمان خاص بھاشا بولتے ہوں گے بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا رفتہ رفتہ شاہ جہاں کے زمانے میں اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ

وہاں رہنے لگے اہل سیف، اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں اردوے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے (چنانچہ) وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا اسے فقط شاہ جہاں کا اقبال کہنا چاہیے کہ یہ زبان خاص وعام میں اردو کی طرف منسوب مشہور ہوگئی۔" (آب حیات مولانا محمد حسین آزاد)

علاقہ دہلی کو اردو کی جائے پیدائش ثابت کرنے والوں میں ایک بہت ہی اہم نام مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعو حسین خاں کا ہے۔جنھوں نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" جیسی تحقیقی کتاب لکھ کر اردو زبان کی ابتدائی تاریخ منضبط کرنے کی کوشش کی ہے وہ قدیم آریائی زبانوں کی شکست وریخت سے وجود میں آنے والی نئی زبانوں کا جائزہ لینے کے بعد فرماتے ہیں:

"آریوں کی آمد سے لے کر مسلمانوں کی فتوحات تک ہندوستان میں جس علاقہ کی زبان کا راج رہا وہ مدھیہ دیش (مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب) کی کسی نہ کسی بولی پر مبنی تھی عہد قدیم میں ویدک زبان اسی علاقہ میں پورے طور سے نکھرتی ہے۔رگ وید کے آخری اشلوک جمنا کی وادی میں تصنیف کیے گئے۔"

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص۹۹ ڈاکٹر مسعود حسین خان)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"۱۰۰۰ء میں جب ترک پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت شورسینی اپ بھرنش اپنے شباب پر تھی سنسکرت اور پراکرت کے ساتھ ساتھ راجپوتوں کے درباروں میں اس نے بھی

ایک خاص مرتبہ حاصل کرلیا تھا ہندوستان کی جدید بولیوں کے بیج
اسی کے اندر سے پھوٹنا شروع ہو گئے تھے ۔

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۰۱ / ڈاکٹر مسعود حسین خان)

دوسری جگہ اسی شورسینی اپ بھرنش سے مغربی ہندی اور کھڑی بولی کی پیدائش ثابت کرتے ہوتے لکھتے ہیں:

شورسینی اپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا جو ۱۰۰۰ء کے قریب ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے جب کوئی زبان کسی وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے تو اس کی یکسانیت باقی نہیں رہتی اور وہ جزوی اختلافات کے ساتھ کئی بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے مغربی ہندی بھی کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ایسی ہی بولیوں میں تقسیم ہوگئی تھی بندیلی ، ہریانی ، برج بھاشا (جس میں قنوجی بھی شامل ہے) اور کھڑی بولی جسے گریرسن ہندوستانی کا جدید نام دیتا ہے"

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۹ / ڈاکٹر مسعود حسین خان)

یہی کھڑی بولی جسے گریرسن ہندوستانی کا نام دیتا ہے آگے چل کر اردو کے نام سے موسوم ہوتی ہے اسی بنا پر بعض ماہرین لسانیات نے ''مغربی ہندی'' کو اردو کی اصل قرار دیا ہے یہ صرف تعبیر کا فرق ہے کیونکہ کھڑی بولی دراصل مغربی ہندی کی ہی ایک ذیلی شاخ ہے اسی کھڑی بولی کے بارے میں مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

اب رہی کھڑی بولی جس کی شکل ہم قدیم ہندی کے ادب میں پہچانتے آئے ہیں پہلی بار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ایک نئے عروض اور نئے رسم الخط میں ڈھلتی ہے لیکن یہ بھی مسلمانوں کے دہلی میں اچھی طرح متمکن ہو جانے کے بعد ہوتا ہے۔

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۳۰ از ڈاکٹر مسعود حسین خان)

پروفیسر مسعود حسین خاں اپنی تحقیقات اور تلاش کردہ آثار و قرآئن اور دلائل کی روشنی میں بہت ثابت قدمی کے ساتھ اپنے نظریہ پر قائم ہیں اور بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''زبان دہلوی (کھڑی بولی) کا ارتقاء اگر ایک طرف اردو کی شکل میں خسرو اور دیگر صوفیائے اکرام کے ہاتھوں ہو رہا تھا تو دوسری طرف لشکریوں اور سادھوؤں کے ذریعہ پنجاب یہ و دکن اور پورب کے علاقوں میں بھی رواج پا چکی تھی جس کی شہادت ہمیں نامدیو، کبیر داس، اور گرونانک کے کلام سے ملتی ہے سلاطین دہلی کا جو لشکر بنگال سے لے کر دکن تک سیلاب کی مانند بڑھتا ہے اس میں پروئیس جو جس بلاک کے مطابق پنجابیوں سے زیادہ ہر بانہ علاقہ کے جنگی اور اکھڑ لوگوں کی تعداد تھی............دہلی کی زبان لشکریوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے جن جن گوشوں میں جاتی ہے وہاں وہ ایک باوقار بولی کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے جس طرح دکن میں اردو ادب سب سے پہلے پروان چڑھتا ہے۔ شمال ہند میں بھی زبان دہلوی ہندی شعراء نامدیو، کبیر اور گرونانک کے کلام میں ممتاز ادبی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ شہر دہلی اس وقت تک ہندوستانی تہذیب و تمدن کا مرکز بن چکا تھا سیاسی مرکز ہونے کی وجہ سے خسرو نے اپنے فارسی کلام میں اسے بار ہا ''حضرت دہلی'' کے لقب سے یاد کیا ہے بالخصوص سلطان المشائخ کے بعد سے تو ''حضرت دہلی'' یا ''دہلی شریف'' مرجع خاص و عام بن گئی تھی۔''

(تاریخ زبان اردو ڈاکٹر مسعود حسین خان، بحوالہ نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۱۸)

ڈاکٹر شوکت سبزی واری لکھتے ہیں:

ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں سب متفقہ طور سے اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں اردو اس کی ادبی شکل ہے اس زبان کو یہ نام بعد میں اس وقت دیا گیا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی زبان سے ترقی کر کے اس نے ادب وشعر کی زبان کا درجہ پایا مسلمانوں کے ہمرکاب یہ زبان دہلی سے نکل کر ملک کے دور دراز حصوں تک پہنچی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس کا اقتدار بڑھا اور اس کی حدیں وسیع ہوئیں۔

(داستان زبان اردو، بحوالہ نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۲۲)

آگے فیصلہ کن انداز اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اردو دہلی اور میرٹھ کی زبان ہے اس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں مولانا محمود شیرانی کو بھی ماننا پڑا کہ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے وہ دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی زبان کا مولد وہی ہوتا ہے جہاں بلا شرکت غیرے بولی جائے پنجاب، اودھ، دکن، بہار، گجرات بمبئی وسط ہند جہاں کہیں اردو کا سکہ چلتا ہے اردو کے پہلو بہ پہلو دوسری زبانیں بھی ہیں کہیں اردو تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے بول چال کی زبانیں اور ہیں کہیں اردو کے ساتھ دوسری زبانیں بھی بولی جاتیں ہیں کہیں شہر کی زبان اردو ہے دیہات کے باشندے مقامی زبان بولتے ہیں لیکن یوپی کے مغربی اضلاع میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں صرف اردو

ہے جو شہروں اور دیہاتوں میں عام طور سے بولی جاتی ہے اور یوپی کے
مغربی اضلاع میں ہندو مسلمان سب اردو بولتے ہیں وہ ہندو کی زبان
بھی ہے اور مسلمان کی بھی دوسرے مقامات میں صرف مسلمان کی
زبان ہے مسلمان اردو بولتے ہیں ہندو مقامی زبان استعمال کرتے
ہیں مثلاً تامل کے علاقے میں مسلمانوں کے گھروں میں اردو بولی
جاتی ہے بازار اور ہاٹ میں بدستور تامل کا سکہ چلتا ہے ۔

(داستان زبان اردو ص ۹۳/۹۴ بحوالہ نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۲۲)

مسعود حسین خاں نے بھی یہی فیصلہ صادر فرمایا ہے اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے:

''نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور
حضرت دہلی اس کا صحیح مولد و منشاء'' (مقدمہ تاریخ زبان ص ۳۰۶)

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات بہت وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ اردو کی
اصل جائے پیدائش دہلی اور اطراف دہلی کا علاقہ ہے۔

مختلف نظریات کے درمیان تطبیق کی کوشش

ماہرین لسانیات اور زبان وادب کے مؤرخین کے درمیان صرف سید سلیمان
ندوی نے مسئلہ کا متفقہ حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مختلف آراء و نظریات کے
درمیان باہم تطبیق واشتراک کی شکل پیدا کی ہے سید سلیمان ندوی رسالہ معارف ۱۹۳۳ء
میں رقمطراز ہیں:

''موجودہ معیاری اردو، دہلوی زبان دوسری زبانوں سے مل
کر بنی ہے آج کل بعض فاضلوں نے ''پنجاب میں اردو'' بعض اہل
دکن نے ''دکن میں اردو'' اور بعض عزیزوں نے ''گجرات میں اردو''

کا نعرہ بلند کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی
میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان
سب کا نام اردو رکھ دیا گیا۔" (ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۹۳ء ص ۱۰)

اپنے اسی نظریہ کو دوسری جگہ اس انداز میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی
نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی لیکن تہذیب اور
سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا۔ (نقوش سلیمانی ص ۹ سید سلیمان ندوی)

مختلف نظریات کے درمیان باہم تطبیق کی یہ ایک ممکنہ شکل تھی جو سید صاحب نے پیش کی حالانکہ سید صاحب خود ان نظریہ ساز لوگوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں اردو کے آغاز کی بنیادیں تلاش کرنے کی دعوت دی تھی لیکن اس کے باوجود وہ تطبیق کی یہ شکل پیدا کر رہے تھے کہ مسئلہ کا کوئی ایک حل نکلے مگر سید صاحب کی اس کوشش کو ماہرین لسانیات نے تسلیم نہیں کیا حالانکہ ان میں سے تقریباً سبھی کے نزدیک یہ بات متفق علیہ ہے کہ اردو دو قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور باہمی اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہوئی اور ظاہر ہے کہ یہ اختلاط کسی ایک گوشہ میں نہیں ہوا بلکہ مختلف علاقوں میں مختلف سطحوں مختلف محاذوں پر مختلف وقتوں میں مختلف قوموں کے درمیان وجود پذیر ہوا اور صدیوں تک یہ سلسلہ چلا اور چلتا رہا مگر پھر بھی سید صاحب کا پیش کردہ نظریہ تطبیق قابل تسلیم نہیں ہے اور ستم یہ ہے کہ دوسرا کوئی قابل تسلیم قابل فہم حل بھی نہیں پیش کیا جاتا نتیجہ یہ ہے کہ اردو کا نقطۂ آغاز آج بھی جنت گمشدہ کی طرح پُرکشش مگر مجہول ہے۔

اُردو زبان کے آغاز اور اس کی جائے پیدائش کے سلسلہ میں تازہ ترین کتاب ڈاکٹر خورشید احمد صدیقی نے ترتیب دی ہے اس کا سن اشاعت ۱۹۹۳ء ہے اس میں انھوں نے اردو کے آغاز اور مولد و منشا سے متعلق تمام ماہرین لسانیات کے قائم کردہ

نظریات کا تنقیدی جائزہ لے کر حقیقت واحدہ کی تلاش کی کوشش کی ہے ڈاکٹر خورشید حمرا صاحبہ کی کثرت میں وحدت کی تلاش اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ ہماری ادبی تاریخ میں پہلی بار وسیع پیانہ پر آغاز بان سے متعلق تمام نظریات ورجانات کو موضوع بنا کر ایک مقصد ایک منزل کی تلاش وجستجو کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے اب تک کے مختلف نظریات کا جائزہ لے کر ماہرین لسانیات کے درمیان متفقہ اور مشترکہ نقاط کو تلاش کر کے ایک جامع حل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی ڈاکٹر خورشید حمرا صاحبہ نے متفقہ اور مشترکہ نقاط کو تلاش کر کے ان کا تنقیدی جائزہ لیا اور جزوی ولفظی اختلافات کو ختم کر کے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ خود ماہرین لسانیات کے بیانات وتحقیقات کے درمیان موجود تھا ڈاکٹر خورشید صاحبہ نے اسی کو تحلیل تحقیق اور تنقیح کے ساتھ پیش کیا ہے اور بڑی حد تک قابل قبول بنا دیا ہے ایک عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ آغاز زبان سے متعلق تمام نظریات کو یکجا کر کے ان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے ڈاکٹر خورشید حمرا صاحبہ کی کتاب نے اس ضرورت کو پورا کیا اور ایک ادبی خلا کو پُر کرنے کوشش کی ہے وہ کتاب کے آغاز میں ابتدائیہ کے زیر عنوان لکھتی ہیں:

> ''زیر نظر تصنیف میں ہم نے اردو زبان کے آغاز کے مسئلے کا ایک ایسا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو سب کے لئے قابل قبول ہو ہم نے کثرت میں وحدت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مختلف نظریوں کے تضادات کو ختم کردے۔''
>
> (اردو زبان کا آغاز ص۹ ڈاکٹر خورشید حمرا)

مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''اردو زبان کے نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ حقیقت کہیں انھیں کے درمیان پوشیدہ ہے چنانچہ اس حقیقت کی

تلاش شروع کی اس تلاش کے دوران معلوم ہوا کہ ہر ایک نے جزوی حقیقت کو پیش کیا ہے کسی نے صرف پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیا کسی نے صرف دوآبہ گنگ وجمن کو جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی جائے پیدائش مدھیہ دیش ہے۔ جس میں مشرقی پنجاب دوآبہ گنگ وجمن اور مغربی یوپی شامل ہیں ۔''

(اردوزبان کا آغاز ص ۱۳؍۱۴ ڈاکٹر خورشید حمرا)

خورشید صاحبہ نے اپنی کتاب ''اردوزبان کا آغاز مختلف نظریے اور حقائق'' میں ص ۳۴ پر اس لسانی وحدت کا ذکر جو انھوں نے دریافت کی ہے ان الفاظ میں کیا ہے:

''مختلف ماہرین لسانیات کے بیانات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مغربی ہندی مدھیہ دیش کی خاص زبان ہے اور ہندوستانی، مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں سے ایک ہے چونکہ اردو ہندوستانی کی شاخ ہے اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو مدھیہ دیش کی زبان ہے اور یہ مدھیہ دیش میں ہی پیدا ہوئی اور یہاں سے مسلم حکمرانوں کے ساتھ پہلے دہلی اور دکن وغیرہ پہنچی جہاں اس نے ترقی کے مراحل طے کئے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مدھیہ دیش اس کا صحیح مولد ومنشا ہے اور مغربی ہندی اس کا اصل منبع اور سرچشمہ۔''

(اردوزبان کا آغاز ص ۳۴ - ڈاکٹر خورشید حمرا)

آگے چل کر صفحہ ۳۹ پر لکھتی ہیں:

''ہم نے اپنی اس تصنیف میں جو دعویٰ کیا ہے کہ اردو مدھیہ دیش میں پیدا ہوئی اور مغربی ہندی سے پیدا ہوئی اور اس کی پیدائش

کا زمانہ ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک مقرر کیا جا سکتا ہے تو ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق تقریباً ان سبھی ماہرین لسانیات کے بیانات سے ہوتی ہے جنھوں نے اردو کے آغاز و ارتقا کو اپنا موضوع بنایا ہے۔"

(اردو زبان کا آغاز ص ۳۹ / ڈاکٹر خورشید حمرا)

اُردو کا عہد پیدائش

اُردو کی پیدائش کے سلسلہ میں تین بنیادی سوال ہیں اردو کی تخلیقی اصل کیا ہے؟ اردو کہاں پیدا ہوئی؟ اور تیسرا سوال ہے اردو کب پیدا ہوئی یعنی اس کا زمانہ پیدائش کیا ہے دو سوالوں کے جواب فراہم کرنے کی حد تک خورشید صاحبہ کا دعویٰ کسی حد تک تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن تیسرے سوال کا جواب فراہم کرنے میں انھیں کامیابی نہیں ملی ہے کیونکہ سندھ میں اردو اور پنجاب میں اردو کے دعویداروں نے جس زمانہ میں اردو کی تلاش و جستجو کی ہے وہ ۱۰۰۰ء سے قبل کا زمانہ ہے سندھ میں مسلمانوں کی آمد اور قیام کا عرصہ ۷۱۲ء سے ۱۰۲۶ء تک تین سو سال پر محیط ہے اور ان کا دار السلطنت ملتان تھا یہیں یہ نکتہ بھی ابھرتا ہے کہ ملتان کا شمار مدھیہ دیش کے قائم کردہ حدود سے باہر ہے اسی کے ساتھ یہ بحث بھی جڑی ہوئی ہے کہ ۱۲۰۰ء کے بعد سے فورٹ ولیم کالج کے زمانہ قیام تک کا جو عرصہ ہے کیا اردو کی تخلیق میں ان چھے صدیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے خورشید حمرا صاحبہ نے اردو کے لئے جو عرصہ تخلیق مقرر کیا ہے وہ دراصل مغربی ہندی اور اس کی ذیلی شاخوں کی تشکیل و ارتقاء کا دور ہے جسے ڈاکٹر محی الدین زور نے وسطی ہند کی آریائی زبان قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

''وسطی ہند آریائی زبان کا عام نام مغربی ہندی ہے۔''

(ہندوستانی لسانیات ص ۷۱، بحوالہ اردو زبان کا آغاز ص ۲۳)

اسی مغربی ہندی کی پیدائش کے بارے میں مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''شورسینی اپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا جو ۱۰۰۰ء کے قریب ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔''

(مقدمہ تاریخ زبان اردو، بحوالہ اردو زبان کا آغاز ص ۳۳)

اسی مغربی ہندی کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

''اردو ہندوستانی اپ بھرنش کے اس روپ سے ماخوذ ہے جو گیارھویں صدی کے آغاز میں مدھیہ دیش میں رائج تھا۔''

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۲۰، بحوالہ اردو زبان کا آغاز ص ۳۳)

مذکور بالا اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ شورسینی اپ بھرنش سے مغربی ہندی ۱۰۰۰ء میں وجود پذیر ہوئی اور ترقی کے مراحل طے کرنے کے بعد خود ایک زبان کی حیثیت اختیار کر لی ڈاکٹر شوکت سبزواری نے یہ بھی طے کر دیا کہ گیارھویں صدی تک اب بھرنش کے مختلف روپ رائج تھے ان ہی میں سے کسی ایک روپ سے اردو نکلی ہے اور یہ بات طے ہے کہ وہ روپ مغربی ہندی ہے اور براہ راست مغربی ہندی اردو کی تخلیقی اصل نہیں ہے کیونکہ وہ خود دیگر پانچ بولیوں میں تقسیم ہو گئی تھی جیسا کہ مسعود حسین خاں صاحب لکھتے ہیں:

''جب کوئی زبان کسی وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے تو اس کی یکسانیت باقی نہیں رہتی اور وہ جزوی اختلافات کے ساتھ کئی بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے مغربی ہندی بھی کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ایسی ہی بولیوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔''

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۸۴)

ماہرین لسانیات کے مذکورہ بالا تمام اقتباسات خود خورشید حمرا صاحبہ نے نقل فرمائے ہیں ان سے ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء کے درمیان اردو کی پیدائش کے بجائے مغربی ہندی کی پیدائش اس کی ترقی اور دیگر پانچ بولیوں میں اس کی تقسیم پھر ان بولیوں کا ارتقاء تو ثابت ہوتا ہے یہ

ثابت نہیں ہوتا کہ ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء کے درمیان اردو کی تخلیق ہوئی اردو کی تخلیق تو مغربی ہندی کی ایک ذیلی شاخ کھڑی بولی سے عمل میں آئی جسے ہندوستانی کا نام بھی دیا گیا ہے جو بہت بعد میں وجود میں آئی خود ڈاکٹر خورشید صاحبہ نے اسے اردو کے بجائے کھڑی بولی اور ہندوستانی قرار دیا ہے مسعود حسین خاں کی تردید کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

"ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ پروفیسر جیولز بلاک کے مذکورہ بالا اقتباسات سے (جنھیں مسعود حسین خاں نے اپنی تائید میں نقل کیا ہے) جس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ اور شمالی دوآبے سے تعلق رکھنے والے لشکریوں کے ذریعہ جو زبان دکن پہونچی وہ مغربی ہندی اور اس سے پیدا ہونے والی کھڑی بولی یا ہندوستانی زبان تھی جو ابھی خام تھی اور جس کا ارتقاء ابھی مکمل نہیں ہوا تھا"

(اردو زبان کا آغاز ص ۲۳)

مذکورہ بالا اقتباس سے ڈاکٹر خورشید صاحبہ کے اپنے الفاظ میں اس بات کی تعیین ہو جاتی ہے کہ ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء کے درمیان جو زبان پیدا ہوئی وہ مغربی ہندی اور کھڑی بولی اور ہندوستانی تھی اور وہی دکن بھی گئی اور خام حالت میں نامکمل شکل میں کیونکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ علاؤالدین خلجی نے ۱۳۱۴ء میں دیوگیر پر حملہ کیا اور کئی حملوں کے بعد دیوگیر فتح ہوا کچھ عرصہ بعد خود محمد تغلق نے دہلی سے اپنا پائے تخت منتقل کر کے دولت آباد (دیوگیر) بسالیا یہ سارا قصہ ۱۲۰۰ء کے بعد کا ہے یعنی دکن ہجرت کے وقت مغربی ہندی کا دور دورہ تھا اور اس کی ذیلی شاخ کھڑی بولی یا ہندوستانی کا مرحلۂ آغاز تھا جو ناپختہ اور خام شکل میں دکن منتقل ہو گئی تھی، علاء الدین خلجی اور اس کے لشکری اور پھر کئی سال بعد محمد تغلق اور اہل دہلی جنھوں نے اسی کے حکم سے دولت آباد ہجرت کی تھی اپنے ساتھ جو زبان لے گئے وہ مغربی ہندی تھی اور اس کی ذیلی شاخ کھڑی بولی تھی جو بالکل ابتدائی مرحلہ میں

ناپختہ اور خام تھی اور اس نے بھی جنوب پہنچ کر اردو کا نام نہیں پایا بلکہ اسے ہندی کہا گیا اور ایک عرصہ بعد وہاں کی مقامی بولیوں کے اثرات سے مل کر جو زبان بنی اسے دکنی کہا جانے لگا لہذا صرف ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء کے درمیانی عرصہ کو اردو کا زمانہ پیدائش قرار دینا کیسے صحیح ہوگا............!!!؟

اُردو کی تخلیقی اصل

اس کے علاوہ ۱۲۰۰ء کے بعد سے فورٹ ویم کالج کے زمانۂ قیام تک چھ سو سال کا طویل عرصہ ہے جس میں کئی قومیں آئیں گئیں حکومتیں تبدیل ہوئیں اور پائے تخت دولت آباد دکن (گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ) گجرات، آگرہ منتقل ہوتا رہا اور تقریباً چار سو سال بعد دوبارہ از سر نو دہلی پائے تخت بنی خود گجرات اور دکن میں کئی سلطنتیں قائم ہوئیں اور طویل عرصہ تک قائم رہنے کے بعد اکبر کے عہد میں ختم ہوئیں جس نے ایک نظام حکومت کے تحت پورے ہندوستان کی وحدت کا تصور پیدا کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم شیر و شکر کر دیا تھا اس کے بعد بہادر شاہ ظفر تک کے مغل فرمانروا اور اس طویل ترین عہد کی زبانوں، تہذیب ثقافت علم و حکمت شاعری دانشوری دانائی اور علماء صوفیاء کی طویل ترین جدوجہد کا اردو کی تخلیق و تشکیل میں کیا کوئی کردار نہیں ہے؟؟ اگر ہم ان چھ صدیوں کو بالکل نظر انداز کر دیں تب تو اردو کی تخلیق کا زمانہ صرف ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک مانا جاسکتا ہے ورنہ بصورت دیگر یہ دعویٰ یقیناً غلط ہے اس عرصہ میں تو شور سینی اپ بھرنش سے وجود میں آنے والی ہند آریائی زبانوں کی تخلیق کے عمل کا آغاز ہوا اور مغربی ہندی اور اس کی ذیلی شاخیں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں اس طرح مغربی ہندی کی ذیلی شاخوں میں آریائی بولیوں کی وہ آخری نسل (آخری کڑی) نمودار ہوئی جسے اردو کی تخلیقی اصل کہا جاسکتا ہے بلکہ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ آریائی خاندان السنہ کی یہ آخری کڑی دکنی کی اصل بنی اور دکنی کے دوبارہ پلٹ کر شمال جانے کے بعد وہاں اردو کی حسین

ناپختہ اور خام تھی اور اس نے بھی جنوب پہنچ کر اردو کا نام نہیں پایا بلکہ اسے ہندی کہا گیا اور ایک عرصہ بعد وہاں کی مقامی بولیوں کے اثرات سے مل کر جو زبان بنی اسے دکنی کہا جانے لگا لہذا صرف ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء کے درمیانی عرصہ کو اردو کا زمانہ پیدائش قرار دینا کیسے صحیح ہوگا............!!!؟

اُردو کی تخلیقی اصل

اس کے علاوہ ۱۲۰۰ء کے بعد سے فورٹ ویم کالج کے زمانۂ قیام تک چھ سو سال کا طویل عرصہ ہے جس میں کئی قومیں آئیں گئیں حکومتیں تبدیل ہوئیں اور پائے تخت دولت آباد دکن (گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ) گجرات، آگرہ منتقل ہوتا رہا اور تقریباً چار سو سال بعد دوبارہ از سر نو دہلی پائے تخت بنی خود گجرات اور دکن میں کئی سلطنتیں قائم ہوئیں اور طویل عرصہ تک قائم رہنے کے بعد اکبر کے عہد میں ختم ہوئیں جس نے ایک نظام حکومت کے تحت پورے ہندوستان کی وحدت کا تصور پیدا کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم شیر و شکر کر دیا تھا اس کے بعد بہادر شاہ ظفر تک کے مغل فرمانروا اور اس طویل ترین عہد کی زبانوں، تہذیب ثقافت علم وحکمت شاعری دانشوری دانائی اور علماء صوفیاء کی طویل ترین جدوجہد کا اردو کی تخلیق و تشکیل میں کیا کوئی کردار نہیں ہے؟؟ اگر ہم ان چھ صدیوں کو بالکل نظر انداز کر دیں تب تو اردو کی تخلیق کا زمانہ صرف ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک مانا جاسکتا ہے ورنہ بصورت دیگر یہ دعویٰ یقیناً غلط ہے اس عرصہ میں تو شورسینی اپ بھرنش سے وجود میں آنے والی ہند آریائی زبانوں کی تخلیق کے عمل کا آغاز ہوا اور مغربی ہندی اور اس کی ذیلی شاخیں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں اس طرح مغربی ہندی کی ذیلی شاخوں میں آریائی بولیوں کی وہ آخری نسل (آخری کڑی) نمودار ہوئی جسے اردو کی تخلیقی اصل کہا جاسکتا ہے بلکہ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ آریائی خاندان السنہ کی یہ آخری کڑی دکنی کی اصل بنی اور دکنی کے دوبارہ پلٹ کر شمال جانے کے بعد وہاں اردو کی حسین

وجمیل خوبصورت شکل نمودار ہوئی اسی لئے اردو کی پیدائش کے زمانہ کا تعین صرف ۱۰۰۰ء سے
۱۲۰۰ء تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں کی سندھ آمد اور دہلی پہنچنے تک کا درمیانی عرصہ تقریباً پانچ سو سال ہے
اس عرصہ میں اگر ہم اردو کا وجود سندھ یا پنجاب تسلیم کرلیں تو دہلی پہنچتے پہنچتے نہ صرف یہ کہ
اردو زبان کی تخلیق پر پانچ صدیاں مکمل ہو جاتی ہیں بلکہ یہ ایک طویل علاقے سے گذر کر دہلی
پہنچتی ہے اس طویل عرصہ میں بحیثیت زبان اس کی کچھ شکل وصورت واضح ہونا چاہئے تھی
لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصہ میں اردو زبان آب وگل کے مرحلہ سے آگے نہیں بڑھی
ہے چند نامانوس متفرق الفاظ اور دیگر مختلف زبانوں کے الفاظ پر مشتمل عجیب الخلقت صوفیانہ
ملفوظات اس کا سرمایہ ہے اس سے اردو زبان کی تخلیق پر استدلال بلکہ اصرار صحیح نہیں ہوگا
یوں بھی چند متفرق الفاظ اور غیر مرتب جملوں سے استشہاد نہیں کیا جاسکتا مشہور ماہر
لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> ''زبان کے سرمایۂ الفاظ کو لے کر اردو کی اصل کا سراغ لگانا بے سود
> بھی ہے اور گمراہ کن بھی اس سے جویائے حقیقت بہک سکتا ہے خواہ
> علم وفضل کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو'' (اردو لسانیات ص ۹)

اردو کا ارتقائی عہد

مسلمانوں کی آمد اور ان کی ابتدائی پانچ صدیوں کی حکمرانی کے دوران مقامی
لوگوں کے ساتھ ان کے ارتباط واختلاط کے نتیجے میں ہمیں یہ مان کر چلنا چاہیے کہ یہ دور
مقامی بھاشاؤں میں ٹوٹ پھوٹ کا دور ہے پشتو، ترکی، فارسی، عربی وغیرہ اجنبی زبانوں
کے ساتھ تصادم کا دور ہے اسی تصادم اور باہمی شکست وریخت سے مقامی زبانوں کی تجدید
کے عمل کا آغاز ہوا اور ان کی مختلف شکلیں نمودار ہونا شروع ہوئیں زبان کی انھیں نئی شکلوں

و جمیل خوبصورت شکل نمودار ہوئی اسی لئے اردو کی پیدائش کے زمانہ کا تعین صرف ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں کی سندھ آمد اور دہلی پہنچنے تک کا درمیانی عرصہ تقریباً پانچ سو سال ہے اس عرصہ میں اگر ہم اردو کا وجود سندھ یا پنجاب تسلیم کرلیں تو دہلی پہنچتے پہنچتے نہ صرف یہ کہ اردو زبان کی تخلیق پر پانچ صدیاں مکمل ہو جاتی ہیں بلکہ یہ ایک طویل علاقے سے گذر کر دہلی پہنچتی ہے اس طویل عرصہ میں بحیثیت زبان اس کی کچھ شکل وصورت واضح ہونا چاہیے تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصہ میں اردو زبان آب وگل کے مرحلہ سے آگے نہیں بڑھی ہے چند نامانوس متفرق الفاظ اور دیگر مختلف زبانوں کے الفاظ پر مشتمل عجیب الخلقت صوفیانہ ملفوظات اس کا سرمایہ ہے اس سے اردو زبان کی تخلیق پر استدلال بلکہ اصرار صحیح نہیں ہوگا یوں بھی چند متفرق الفاظ اور غیر مرتب جملوں سے استشہاد نہیں کیا جاسکتا مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> ”زبان کے سرمایۂ الفاظ کو لے کر اردو کی اصل کا سراغ لگانا بے سود بھی ہے اور گمراہ کن بھی اس سے جویائے حقیقت بہک سکتا ہے خواہ علم وفضل کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو“ (اردو لسانیات ص ۹)

اردو کا ارتقائی عہد

مسلمانوں کی آمد اور ان کی ابتدائی پانچ صدیوں کی حکمرانی کے دوران مقامی لوگوں کے ساتھ ان کے ارتباط واختلاط کے نتیجے میں ہمیں یہ مان کر چلنا چاہیے کہ یہ دور مقامی بھاشاؤں میں ٹوٹ پھوٹ کا دور ہے پشتو، ترکی، فارسی، عربی وغیرہ اجنبی زبانوں کے ساتھ تصادم کا دور ہے اسی تصادم اور باہمی شکست وریخت سے مقامی زبانوں کی تجدید کے عمل کا آغاز ہوا اور ان کی مختلف شکلیں نمودار ہونا شروع ہوئیں زبان کی انھیں نئی شکلوں

میں مسلمانوں کی زبان جو خود ایک نہیں تھی بلکہ عربی فارسی اور ترکی کا آمیختہ تھی مقامی بولیوں پر اثر انداز ہونا شروع ہوئی مختلف زبانوں کی اثر آفرینی واثر پذیری کے اس دور میں کسی ایسی نئی زبان کی باقاعدہ تخلیق کا دعویٰ کرنا جو ہندوستان کی سرزمین پر پہلے سے موجود نہیں تھی بلکہ نئی اقوام کے اختلاط سے رفتہ رفتہ وجود میں آرہی تھی صحیح نہیں ہوگا یہ پورا عرصہ زبان کے لئے زمین ہموار کرنے اور فضا ساز گار بنانے کا عہد ہے اور یہ کام اس عہد میں بخوبی انجام پاتا رہا کیونکہ یہ تمام عہد خود ہندوستانی بولیوں کے لئے بھی نئی تشکیل وترتیب کا عہد ہے یہی وہ دور ہے جس میں خود آریائی زبانوں میں باہم تعمیر وتشکیل اور تجدید وارتقاء کا عمل جاری تھا جس میں مسلمانوں کی زبانیں عربی، ترکی، پشتو اور فارسی وغیرہ بھی ہندوستان سے باہر سے آکر شریک ہوگئیں اور انھیں کی شرکت سے قدیم آریائی زبانوں میں کچھ نئی خصوصیات، نئی لطافتیں اور نئے پہلو پیدا ہوگئے نئے لب ولہجہ کا اضافہ ہوگیا قدیم ہند آریائی بولیاں جس سے نا آشنا تھیں اور ایک بڑی وجہ ان زبانوں کے اثر کی یہ بھی رہی ہے کہ یہ زبانیں نسبۃً ترقی یافتہ تھیں تہذیب وتمدن کا وسیع سرمایہ اور شعر وادب کا بہترین ذخیرہ ان کے ساتھ تھا اس طرح ان زبانوں کی شمولیت سے پراکرت، برج بھاشا، اپ بھرنش اور مغربی ہندی نے صدیوں کے اختلاط کے بعد نئے نئے روپ اختیار کئے اور عربی وایرانی بناؤ سنگھار کے بعد ہندوستانی اور ترکی حسن کی آمیزش سے جو شکل اختیار کی تو خود یہاں کے مقامی باشندے اس پر انگشت بدنداں اور حیران رہ گئے ہم مسلمانوں کی فتح سندھ سے قطب الدین ایبک کی فتح دہلی تک کے عہد میں ارتقاپذیر ہونے والی زبانوں کو "اُردو" کہنے پر اصرار نہ کریں اور اس عہد کو ہم اردو کا ارتقائی عہد یعنی (proto Urdu) مان لیں تو بہت بڑا مسئلہ حل ہوسکتا ہے بعض ماہرین لسانیات نے اور خود اس دور کے صوفیاء وبزرگان دین نے جو اس زبان کے اوّلین معمار ہیں اپنی زبان کے لئے ہندی، ہندوی اور ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اپنی زبان کو مقامی زبان قرار دیا ہے یعنی ہندوستان

کی زبان (ہند+ی=ہندی) ہندی کی ''ی'' یائے نسبتی سمجھی جائے گی کیونکہ گجرات کی گجری کو بھی ہندی سے تعبیر کیا گیا ہے ان اہل زبان کا اپنی زبان کے لئے مذکورہ ''تسمیہ'' خود اس بات کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ ایک نئی زبان وجود میں آچکی تھی جسے مقامی زبانوں سے ممتاز کرنے کی خاطر ہندی یا ہندوی کہا جانے لگا تھا محمود شیرانی نے اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے بطور شکوہ اس کا اظہار کیا ہے جب کہ یہ شکوہ کی بات نہیں وہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر عجیب رہا ہے وہ ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں عام اس سے پنجابی ہو یا برج ہو یا پوربی اردو ہو یا مارواڑی اور بنگالی۔''

(نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۱۰)

یہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر اس ملک ہندوستانی زبانوں کے لیے طرزِ تعبیر ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کا سرمایہ چند ناقص جملے، متفرق الفاظ، اور مختلف زبانوں کے الفاظ کا مرکب بزرگوں کے ملفوظات اور صوفیانہ مستانہ نعرے ہیں جنھیں دلیل میں پیش کیا جاتا ہے یہ سرمایہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اسے صاف وشستہ اردوئے لطیف کے مقابل رکھا جاسکے اسی لئے اگر ہم اصل اردو اور قدیم اردو کے درمیان ہندی ہندوی یا ہندوستانی کو حد فاصل مان لیں اور اردوئے لطیف سے پہلے ہندی بمعنی ہندوستانی اور ہندوی کا عہد تسلیم کرلیں تو بظاہر کوئی حرج نہیں ہے یوں بھی علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کے دکن منتقل ہوجانے سے شمالی ہند میں ایک خلا نمودار ہوجاتا ہے پائے تخت کے دہلی سے دکن منتقل ہوجانے کا جو عہد ہے وہی عہد ہندی، ہندوی اور ہندوستانی کی ترویج واشاعت کا عہد ہے اسی عرصہ میں دکن میں یہی بولی دکنی کی شکل میں پروان چڑھتی ہے اور شمالی ہند میں ہندوی وہندوستانی کی شکل میں تدریج وارتقاء کے مراحل سے گذرتی ہے اس طرح ایک بہت بڑا اختلاف دور کیا جاسکتا ہے خصوصاً اس صورت میں جب کہ ماہرین لسانیات اور محققین تاریخ

کی زبان (ہند+ی=ہندی) ہندی کی "ی" یائے نسبتی سمجھی جائے گی کیونکہ گجرات کی گجری کو بھی ہندی سے تعبیر کیا گیا ہے ان اہل زبان کا اپنی زبان کے لئے مذکورہ "تسمیہ" خود اس بات کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ ایک نئی زبان وجود میں آچکی تھی جسے مقامی زبانوں سے ممتاز کرنے کی خاطر ہندی یا ہندوی کہا جانے لگا تھا محمود شیرانی نے اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے بطور شکوہ اس کا اظہار کیا ہے جب کہ یہ شکوہ کی بات نہیں وہ لکھتے ہیں:

> "مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر عجیب رہا ہے وہ ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں عام اس سے پنجابی ہو یا برج ہو یا پوربی اردو ہو یا مارواڑی اور بنگالی۔"

(نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۱۰)

یہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر اس ملک ہندوستانی زبانوں کے لیے طرزِ تعبیر ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کا سرمایہ چند ناقص جملے، متفرق الفاظ، اور مختلف زبانوں کے الفاظ کا مرکب بزرگوں کے ملفوظات اور صوفیانہ مستانہ نعرے ہیں جنھیں دلیل میں پیش کیا جاتا ہے یہ سرمایہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اسے صاف وشستہ اردوئے لطیف کے مقابل رکھا جا سکے اسی لئے اگر ہم اصل اردو اور قدیم اردو کے درمیان ہندی ہندوی یا ہندوستانی کو حد فاصل مان لیں اور اردوئے لطیف سے پہلے ہندی بمعنی ہندوستانی اور ہندوی کا عہد تسلیم کرلیں تو بظاہر کوئی حرج نہیں ہے یوں بھی علاءالدین خلجی اور محمد تغلق کے دکن منتقل ہوجانے سے شمالی ہند میں ایک خلا نمودار ہوجاتا ہے پائے تخت کے دہلی سے دکن منتقل ہوجانے کا جو عہد ہے وہی عہد ہندی، ہندوی اور ہندوستانی کی ترویج واشاعت کا عہد ہے اسی عرصہ میں دکن میں یہی بولی دکنی کی شکل میں پروان چڑھتی ہے اور شمالی ہند میں ہندوی وہندستانی کی شکل میں تدریج وارتقاء کے مراحل سے گذرتی ہے اس طرح ایک بہت بڑا اختلاف دور کیا جا سکتا ہے خصوصاً اس صورت میں جب کہ ماہرین لسانیات اور محققین تاریخ

زبان وادب نے اور خود اس دور کے اہل زبان نے اپنی زبان کے لئے یہی نام تجویز کیے ہیں تو پھر ہمیں اس پر بے جا اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوی اور ہندوستانی دراصل اردو ہی ہے جب کہ اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہے کہ دہلی کی خام زبان اپنے ابتدائی عہد میں ہی دکن منتقل ہوگئی تھی اور نئی بولی کی حیثیت سے اس کی اصل تشکیل، تراش خراش اور تحسین وتجمیل دکن ہی کی رہین منت ہے دکن منتقل ہو جانے کے بعد ساڑھے تین سو سال تک شمالی ہند سے اس کا اختلاط نہیں ہوسکا اور یہ زبان عوامی سطح پر جنوب کے اثرات میں پنپتی رہی حتی کہ بہمنی سلطنت نے اس کی سرپرستی فرمائی لیکن خود بہمنی سلطنت کی بنیادی زبان مراٹھی تھی اور عوامی سطح پر اس کا اختلاط کنٹر اور تیلگو سے ہوا اس لیے دکن میں جو زبان پروان چڑھی اس کا لب ولہجہ تبدیل ہوگیا اور اسے دلی کا نام دیا گیا۔

نئی زبان کا تسمیہ اردو

دکنی سلطنت کے زوال کے بعد جب یہ زبان دوبارہ شمال واپس آئی تو رفتہ رفتہ ہندی، ہندوی، ہندوستانی زبان دہلوی اور دکنی کے مرحلہ سے گذر کر سلاطین مغلیہ کی سرپرستی میں شاہی زبان بنی اور عہد شاہجہانی میں اردو کہلائی اس وقت تک اردو کے لفظ سے بھی کوئی آشنا نہیں تھا اردو کو اردو کا نام یعنی کھڑی بولی سے پیدا ہونے والی نئی زبان کا تسمیہ کئی صدیوں بعد عہد شاہجہانی میں عمل آیا محمد حسین آزاد اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں اردوے شاہی اور دربار
> میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے (چنانچہ) وہاں کی بولی کا نام
> اردو ہوگیا اسے فقط شاہ جہاں کا اقبال کہنا چاہیے کہ یہ زبان خاص
> وعام میں اردو کی طرف منسوب مشہور ہوگئی۔“ (آب حیات)

علاء الدین خلجی کی فتح دکن اور محمد تغلق کے دیوگیر کو (دولت آباد) پائے تخت بنالینے کے

بعد تک اس جدید زبان کا کوئی ایک نام رائج نہیں تھا اور دکن میں بھی اسے اردو نہیں کہا گیا نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''شمال میں اب تک اس جدید زبان کا کوئی نام رائج نہیں تھا مگر دکن میں وہ دکنی کے نام سے موسوم ہوئی............دکن میں یہ زبان ہندی اور دکنی کے نام سے موسوم رہی ہے قدیم سے قدیم دکنی شعراء اور مصنفین نے اس کو ہندی اور دکنی کے نام ہی دیئے ہیں۔''
>
> (نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۳۴)

دیگر ماہرین لسانیات کے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ نئی زبان کا تسمیہ ''اردو'' عہد مغلیہ اور بالتحدید عہد شاہجہانی میں عمل میں آیا جسے خود ماہرین لسانیات نے اور اس وقت کے اہل زبان نے ہندی، ہندوی، ہندوستانی، لاہوری اور زبان دہلوی کا نام دیا ہے اور جنوب میں نشو ونما پانے کے بعد بھی اس نئی زبان کو اردو نہیں کہا گیا بلکہ ہندی اور دکنی سے موسوم کیا گیا یہ الگ بات ہے کہ آگے چل کر مزید تہذیب وتربیت کے بعد اسی سے اردو وجود میں آئی اور خود دکنی کے لئے دکنی اردو کی اصطلاح وضع کر لی گئی تا کہ دونوں زبانوں کے درمیان جو فرق، فصل اور بُعد زمانی ہے اس کا اظہار بھی ہو، اس طرح اس جدید آریائی زبان نے جو کھڑی بولی کی آخری شکل اختیار کر چکی تھی کافی بڑے علاقے کا سفر کر کے ایک وسیع تر علاقہ کا احاطہ بھی کر لیا اور اس پر مزید کئی صدیاں بھی بیت چکی تھیں اور اب یہ کھڑی نہیں رہ گئی تھی بلکہ ہندوستانی، دہلوی اور دکنی بن کر خاصی مُہذب حسین وجمیل صحت مند اور خوبصورت شکل اختیار کر چکی تھی کیونکہ اس طویل عرصہ کے دوران یہ صوفیاء و اولیاء کی ترجمان سادھوؤں سنتوں کی پسندیدہ اور شعراء ادبا کی محبوب و منظور نظر بن چکی تھی اور شعرا نے اس کی نوک پلک درست کر کے اسے عوام میں بھی ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور اس کی شاعری کا چرچا شروع ہو چکا تھا پھر سلاطین مغلیہ کی سرپرستی نے اسے فارسی کے

شانہ بشانہ درباروں کی زینت بنالیا اور وہ جادو جگایا کہ فارسی کی چمک دمک دھیرے دھیرے ماند پڑ گئی اور درباروں، قلعوں، دیوان خانوں، شہزادوں اور شاہی بیگمات کی سرپرستی نے اسے آسمان پر پہنچا دیا اور یہ پورے ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار پائی اور اسی کے توسط سے سارا ہندوستان لسانی وحدت کا گہوارہ بن گیا اور دونوں قومیں ہندو اور مسلمان باہم شیر وشکر ہوکر ملک کی جدید تعمیر وتشکیل میں شریک ہوگئیں اس طرح ہندوستان کی نئی تاریخ مرتب ہونا شروع ہوئی آریائی قومیں اور آریائی زبانیں رفتہ رفتہ پس منظر میں گم ہوتی چلی گئیں اور ہندوستان کے افق پر ہند ایرانی تہذیب کا نیا سورج جگمگانے لگا اور اردو نے جو اَب تک گفتگو کی زبان اور صوفیاء اولیاء کے وعظ ونصیحت کی عوامی بولی تک محدود تھی اب زبان وادب کا نیا سفر شروع کیا اور یہاں سے اردو واقعی اردوئے لطیف کی شکل میں پروان چڑھنا شروع ہوئی، اردو اتنے وسیع علاقہ اتنی قوموں اور اتنی حکومتوں اور اتنی متنوع زبانوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھی کہ اس کی پیدائش کا کوئی ایک متعین وقت اور زمانہ طے نہیں کیا جاسکتا خود ماہرین لسانیات نے بھی کسی زمانہ کی قطعی تعیین نہیں کی ہے زبان کی تخلیق کا عمل لمحاتی یا ساعاتی نہیں ہوتا زبان بیک جنبش لب وجود میں نہیں آتی یہ رفتہ رفتہ دھیرے دھیرے مرورِ ایام کے ساتھ تشکیل پاتی رہتی ہے اور خود اپنی شکل متعین کرتی رہتی ہے اردو نے بھی اپنی تراش خراش تزئین وتحسین لطافت ونزاکت خوبصورتی ونفاست شیرینی وحلاوت اور مزاج ومذاق کی تشکیل کے لئے عربی ایرانی ترکی سندھی پنجابی وہندوستانی قوموں تہذیبوں حکومتوں اور سندھ، پنجاب، وسطی ہند، دکن اور گجرات کے وسیع علاقوں کا سفر کرکے زمانہ کا سرد وگرم چکھ کر اپنا وجود تشکیل دیا تھا ملتان سے لے کر کشمیر تک اور وسطی ہند سے گجرات وکرناٹک تک کا وسیع وعریض علاقہ اور وہاں کی مقامی بولیاں اردو کی تشکیل وترتیب میں شامل رہی ہیں۔

اُردو کے تشکیلی عناصر

اُردو کی تشکیل میں فارسی کا اثر

اردو کی ابتدائی تراش خراش اور پرورش و پرداخت فارسی کے زیر سایہ ہوئی اور اپنے ارتقائی سفر میں یہ زبان مغل فرمانرواؤں کی نوزاشات کی رہین منت رہی ہے خود انھوں نے اس زبان کو اپنالیا تھا چنانچہ درباروں میں فاری کے شانہ بشانہ اس نے ترقی کی منزلیں طے کیں اس لئے ادبی حیثیت سے ابتداءً فارسی کے زیر اثر رہی فارسی چونکہ ایک مکمل ادبی زبان تھی اس لئے اردو نے بھی اس کے ادب سے فائدہ اٹھایا، حکمران وقت علم وفن کے قدر دان اور شعر و سخن کے دلدادہ تھے ان کے دربار میں مختلف مما لک کے ادباء شعراء اور علماء کا جمگھٹ رہتا تھا علمی وادبی گفتگو شعر و شاعری اور بحث ومباحثے ہوتے تھے بادشاہ وقت شعراء وادبا کو نوازتے تھے خطابات دیئے جاتے تھے حکومت وقت کی زبان چونکہ فارسی تھی یہ ساری علمی وادبی محفلیں فارسی ہی ہیں آراستہ کی جاتی تھیں لہذا اردو قدرتی طور پر ان سے متاثر ہوتی رہی اور ان خصوصیات کو جذب بھی کرتی رہی خود چونکہ ابھی شعروادب کے ابتدائی مرحلے میں تھی اس لئے فارسی کے ادبی سرمایہ سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اس کی اپنی لفظیات میں پہلے ہی سے عربی، ترکی اور فارسی الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا چنانچہ اس مخصوص شاہی ماحول اور درباری پس منظر کی وجہ سے اس کے ادب میں بھی عربی وفارسی کا اثر نمایاں

اُردو کے تشکیلی عناصر

اُردو کی تشکیل میں فارسی کا اثر

اردو کی ابتدائی تراش خراش اور پرورش و پرداخت فارسی کے زیر سایہ ہوئی اور اپنے ارتقائی سفر میں یہ زبان مغل فرمانرواؤں کی نوزاشات کی رہین منت رہی ہے خود انھوں نے اس زبان کو اپنالیا تھا چنانچہ درباروں میں فاری کے شابہ بشانہ اس نے ترقی کی منزلیں طے کیں اس لئے ادبی حیثیت سے ابتداءً فارسی کے زیر اثر رہی فارسی چونکہ ایک مکمل ادبی زبان تھی اس لئے اردو نے بھی اس کے ادب سے فائدہ اٹھایا، حکمران وقت علم وفن کے قدر دان اور شعروسخن کے دلدادہ تھے ان کے دربار میں مختلف مما لک کے ادباء شعراء اور علماء کا جمگھٹ رہتا تھا علمی وادبی گفتگو شعروشاعری اور بحث ومباحثہ ہوتے تھے بادشاہ وقت شعراء وادبا کو نوازتے تھے خطابات دیئے جاتے تھے حکومت وقت کی زبان چونکہ فارسی تھی یہ ساری علمی وادبی محفلیں فارسی ہی ہیں آراستہ کی جاتی تھیں لہذا اردو قدرتی طور پران سے متاثر ہوتی رہی اوران خصوصیات کو جذب بھی کرتی رہی خود چونکہ ابھی شعروادب کے ابتدائی مرحلے میں تھی اس لئے فارسی کے ادبی سرمایہ سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اس کی اپنی لفظیات میں پہلے ہی سے عربی، ترکی اور فارسی الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا چنانچہ اس مخصوص شاہی ماحول اور درباری پس منظر کی وجہ سے اس کے ادب میں بھی عربی وفارسی کا اثر نمایاں

ہو گیا اور اردو اسی راستہ پر چل پڑی، محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گذر چکا تھا اور ان کے معتقد باقی تھے وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ اور تشبیہ کا رنگ بھی آیا۔" (ماخوذ نقوش ادبی معرکہ نمبر ص ۲۰۸ / ۱۹۸۱ء)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اردو زبان اول لین دین نشت و برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہوگئی ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی اسی طرح کوئی زبان بے شاعری کے نہیں رہ سکتی محمد شاہی دور تھا اور عیش وعشرت کی بہار تھی اِن شرفاء کو خیال آیا ہوگا جس طرح ہمارے بزرگ اپنی فارس کی انشاء پردارزی میں گلزار کھلاتے تھے اب ہماری یہی زبان ہے ہم اس میں کچھ رنگ دکھائیں چنانچہ وہی فارس کے خاکے اردو میں اتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے کہنے لگے۔" (ماخوذ نقوش ادبی معرکہ نمبر ص ۲۰۸ / ۱۹۸۱ء)

اردو زبان اپنے ارتقائی دور میں ہی درباروں تک رسائی حاصل کر چکی تھی اور اسے شاہی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی چنانچہ ابتداءً اس کے شعر و ادب کی تشکیل میں فارسی ادب کی روح سرایت کرنے لگی اور خود فارسی ادب اس وقت عربی سے متاثر تھا اس لئے اردو بیک وقت عربی اور فارسی دونوں سے متاثر ہوئی پرفیسر وحید الدین سلیم لکھتے ہیں:

''یہی جدید ایرانی ادب جو نہ عربی ادب ہے نہ ایرانی ادب بلکہ ایک نئے نام ''عربیرانی'' کہلانے کا مستحق ہے ہندوستان کے مغربی حملہ آوروں کے ذریعہ ہندوستان پہنچا غزنوی، غوری، تغلق، خلجی، سادات، لودھی، سوری اور مغل خاندان جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں ہندوستان پر حکومت کی ان کی زبان فارسی تھی ان کی زبانوں میں بھی یہی ''عربیرانی'' ادب جاری تھا ہندی بھاشا پر فارسی زبان کا اثر پڑنے سے رفتہ رفتہ اردو زبان پیدا ہوئی جب فارسی کو چھوڑ کر یہاں کے شعراء نے اردو زبان میں طبع آزمائی کی تو قدرتی طور سے اسی ''عربیرانی'' ادب کا خاکہ اتارا گیا یہ شعراء حاکم اور فاتح قوم کے تھے مغلوب و مفتوح قوم کی زبان یعنی ہندی و سنسکرت کی طرف ان کی توجہ مائل نہیں ہوئی۔'' (افادات سلیم ص ۱۱۹)

اردو ہندوستانی الاصل ہونے کے باوجود فارسی سے متاثر رہی یہ جہاں اس وقت کا ایک سیاسی تقاضہ اور مطالبہ تھا یا فاتح قوم کی نفسیات تھی وہیں ایک فطری و طبعی تقاضہ بھی تھا لسانیات کے فطری و طبعی اصول کے تحت اردو نے فارسی سے خاصا استفادہ کیا کیونکہ اردو ابھی ارتقائی مرحلے میں تھی جبکہ فارسی پورے عروج پر پہنچی ہوئی ایک مکمل زبان تھی چنانچہ اردو نے اس سے استفادہ کیا اور اپنے دامن کو وسیع کیا اور یہ کوئی عیب نہیں ابتدائی اور ارتقائی مرحلے میں جذب و انجذاب اور اخذ و قبول زبان کی خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہے پروفیسر عبدالستار دلوی ''دکنی اردو'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''ابتداء ہی سے اردو فارسی سے ذخیرۂ الفاظ اور صرفی خصوصیات سے متاثر رہی ہے الفاظ کی جمع کا یہ قاعدہ (الف نون کے لاحقہ سے جمع بنانا) دکنی اردو میں اسی کا نتیجہ ہے......فارسی لغت محاروں اور امثال کا

اردو زبان پر جدید ہندی کے مقابلے میں گہرا اثر ہے یہ اثر بے کم و کاست دکنی پر بھی ہے، جس طرح اردو فارسی اسلوب اور روزمرہ سے سیراب ہوتی رہی اسی طرح یہ اثر دکنی پر بھی نمایاں ہے"

(دکنی اردو پروفیسر عبدالستار دلوی ص ۱۰)

اردو نے فارسی سے جو استفادہ کیا ہے اس کی ایک حیثیت ادبی ماخذ کی بھی ہے ابتدائی دور کے اردو شعراء و ادباء نے فارسی ادب اور فارسی شاعری کو ادبی ماڈل اور ادبی نمونے کی حیثیت سے بھی سامنے رکھا اس لئے فارسی کی ادبی روایات اور اسالیب بیان بھی اردو میں ہو بہو منتقل ہو گئے ہندوستانی شعراء کو اپنے خیال کی ادائیگی کے لئے فارسی کے ادبی سرمائے سے کافی مدد ملی اور انھوں نے بے تکلف اس کا استعمال بھی کیا اور کرنا بھی چاہیے تھا اس کی بڑی وجہ وہ جدید ہندوستانی تہذیب بھی تھی جس نے آریائی تہذیب کے بعد جنم لیا تھا جس کی تشکیل ہند ایرانی عناصر نے مل کر کی تھی سید نعیم الدین دکنی ادب پر ایرانی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زمانہ قدیم ہی سے اردو زبان و ادب میں اوزان و اصناف سخن کے ساتھ اردو ادیبوں نے نہ صرف فارسی الفاظ و اصناف کو اپنایا بلکہ فارسی ادب کے معیار تک پہنچنے کے لئے اپنی تخلیقات کو ایرانی اسالیب و تخیلات سے سنوارنے کی کوشش کی، بات یہ تھی کہ ابتداء ہی سے عربی کے ساتھ ساتھ فارسی کا مقبول ادب ہماری تعلیم کا جزو رہا چنانچہ ایک خاص قسم کی ثقافتی و ادبی فضا سے مانوس و معمور ذہن کو بیشتر جمالیاتی تسکین کا سامان رومی کے پہلوی قرآن، سعدی کی گلستان اور جامی کی بہارستان ہی میں ملا، قدرتی طور پر ادبی تخلیقات پیش کرتے ہوئے اپنی سرزمین پر مضبوطی سے قدم جمائے رکھنے اور اپنا منفرد اسلوب رکھنے کے باوجود قدیم دور کے ترکی

ادیبوں کی طرح اردو ادیبوں کی نظریں بھی زیادہ تر اپنے محبوب فارسی نمونوں ہی کی طرف گئیں، یعنی انھوں نے قصیدے میں خاقانی، انوری اور عرفی، مثنوی میں فردوسی، نظمی اور جامی اور غزل میں سعدی، خسرو، حافظ اور نظیری کو پیش نظر رکھا۔ (دکنی ادب اور ایرانی روایات مضمون مشمولہ دکنی اردو پروفیسر عبدالستار دلوی ص ۸۵)

اُردو کی تشکیل میں ہندوستانی عناصر

اسی طبعی وفطری ادبی ضرورت کے تحت اردو نے فارسی کی ادبی روش اختیار کی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ اردو ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی فضا سے بے نیاز ہوکر ایرانی فضا میں سانس لینے لگی یہ تو اردو کے حق میں خودکشی کے مترادف تھا چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی یہیں پلی بڑھی پھولی پھلی یہاں کی ایک ایک چیز کو اس نے آنکھوں سے لگایا دل میں بسایا سروں پر بیٹھایا اور کلیجہ سے لگایا اسی کے سہارے وہ آگے بڑھتی رہی بحیثیت ترقی یافتہ زبان کے اس نے فارسی سے استفادہ ضرور کیا لیکن ہندوستانی ماحول سے منہ نہیں موڑا اور بے نیازانہ ادبی روش اختیار نہیں کی ڈاکٹر اقبال احمد لکھتے ہیں:

> "اردو شعراء نے ایرانی اسالیب وتلمیحات کے ساتھ ساتھ خالص ہندوستانی الفاظ تلمیحات وتصورات کو بھی اپنایا انھوں نے فارسی اصناف سخن کے ساتھ ساتھ ہندی اصناف سخن مثلاً کبت، بارہ ماسہ اور دوہے کو بھی استعمال کیا ہے اور تقریباً ہر صنف سخن میں ہندی تصورات وتلمیحات سے کام لیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب میں ایرانیت وہندیت شیر وشکر ہوگئی ہیں" (اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ڈاکٹر اقبال احمد خان ص ۳۱۶)

اردو نے نہ صرف ایرانیت وہندیت کو شیر وشکر بنا کر جذب کر لیا بلکہ اسلامی،

عربی ترکی ایرانی اور فارسی ادبیات کو بھی اپنے رنگ میں رنگنے کی کامیاب کوشش کی یہی وجہ ہے کہ مرثیہ کے تمام تر اسلامی و عربی پس منظر نیز عربی و ایرانی ادبی روایت ہونے کے باوجود اردو میں اس کی فضا اس کی زبان اس کا اسلوب بیان اور محاکات خالص ہندوستانی ہیں اسی طرح مثنوی بھی ایک ایرانی صنف سخن ہے جسے اردو نے مکمل طور پر ہندوستانی بنالیا ہے یہی بات دیگر اصناف سخن پر بھی صادق آتی ہے اردو نے انھیں ایران سے اخذ کر کے ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی ادب میں نگینے کی طرح جڑ دیا اردو نے اپنی ادبی عمارت کی بنیاد ہندوستان کی سرزمین پر قائم کی اور یہیں کی مٹی سے قائم کی اردو اپنی اصل کے اعتبار سے خالص ہندوستانی ہے کیونکہ نسل کے اعتبار سے ہند آریائی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے اس کی تعمیر و تشکیل سرزمین ہند پر ہوئی اس نے اپنا ادبی سرمایہ یہیں سے اخذ کرنا شروع کیا یہاں کی مقامی روایات، معاشرتی اقدار، ماحول، موسم، تہذیب تمدن، مذہبی تصورات ہندو فلسفہ اور دیومالائی کرداروں نے اردو کی لفظیات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا مقامی، سادھو، پیر، فقیر، اولیاء، پنڈت اور شعراء اس کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرتے رہے یہاں کے قدرتی حسن، پھل پھول اور پیڑ پودوں نے اردو کے دامن خیال کو رنگین و پر بہار بنادیا مقامی دریاؤں نے اس کے مزاج میں سیلانیت و روانی پیدا کی مقامی پرندے طوطا، مینا مور کوئل اور پپیہا اس کے لہجہ میں نغمگی گھولتے رہے اور ہندوستانی موسیقی سے اس نے جذب و درد اور سوز و گداز حاصل کیا مقامی بازاروں نے اس کی یک رنگی میں نیرنگی کا جلوہ پیدا کیا بھگتی اور تصوف کی تحریک نے اس کے مزاج میں بھائی چارگی، انسانیت رواداری اور مساوات کے جذبات کو ابھارا اور قدیم ہندو ثقافت و کلچر نے اسلامی ایرانی تہذیب کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ و آہنگ اختیار کر لیا جسے دور جدید کے نقاد اور مورّخ نے آریائی تہذیب کے مقابلے میں ہندوستانی کلچر کا نام دیا اور یہاں کی تہذیب گنگا جمنی تہذیب کہلائی

جانے لگی یہاں کی بو باس اور مقامی خصوصیات اردو کی گھٹی میں شامل ہو گئیں اور لہو کی گردش کی طرح اردو زبان کی عمومی مقبولیت میں یہی عنصر کام کرتا رہا اس طرح اردو کے توسط سے ہندوستانی افق پر ایک جدید تہذیب کا ظہور ہوا جس میں قدر مشترک خود اردو تھی اردو قومی وحدت کی علامت بن کر نمودار ہوئی اردو چونکہ ہند آریائی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے اس لئے قدرتی طور پر اس کے الفاظ میں ہند آریائی زبانوں سے اخذ کردہ الفاظ کی تعداد بھی زیادہ ہے مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی فرہنگ آصفیہ میں اس کی صراحت کی ہے کہ ان کی فرہنگ کے ذخیرۂ الفاظ میں ۵۰ فیصد الفاظ ایسے ہیں جو خالص ہندی کے یا ہندی اور پنجابی کے ہیں اور تقریباً ۲۳ فیصد الفاظ ہندی اور عربی یا ہندی اور فارسی کا مرکب ہیں اس طرح ۲ فیصد الفاظ خالص ہندوستانی ہیں بقیہ الفاظ عربی، فارسی اور ترکی کے ہیں اردو شاعری کے جو ابتدائی نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان میں بھی ہندوستانی الفاظ اور اصناف سخن کا استعمال کثرت سے ملتا ہے اور ہندی بحروں کا استعمال بھی زیادہ ہے چنانچہ مسعود سعد مسلمان نے اپنا ایک دیوان مرتب کیا تھا جس کی زبان ہندوی تھی اس کے بعد خواجہ فریدالدین گنج شکر کے ملفوظات کی زبان بھی مقامی ہندوی ہے اور امیر خسرو جو فارسی کے شاعر تھے باقاعدہ فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی زبان میں اور ہندی اصناف میں بھی شعر کہتے تھے انھوں نے خود اس کی صراحت کی ہے ان سے منسوب اُردو شاعری کے ابتدائی نمونے اس کے بہترین ترجمان ہیں ملک محمد جائسی کی پدماوت اس کی سب سے بہترین دلیل ہے سولہویں صدی میں جو خالص ہندی میں نظم کی گئی ہے۔

محمد حسین آزاد اسی نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سولہویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا ہے اس نے پدماوت کی داستان نظم کی ہے اس سے عہد مذکور

کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے اس کی بحر بھی ہندی رکھی ہے اور ورق کے ورق الٹتے چلے جاؤ فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا۔'' (آب حیات بحوالہ نقوش ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۹۳)

ڈاکٹر اقبال احمد خاں لکھتے ہیں:

''قدیم اردو کی دستیاب شدہ منظومات میں سب سے پرانی نظم ''کدم راؤ پدم راؤ'' اسی عہد ۱۴۲۱ء۔ ۱۴۳۴ء کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی اس کے مصنف فخر دین نظامی بیدری ہیں اس نظم کا مزاج پوری طرح ہندوی ہے اس میں سنسکرت کے الفاظ کافی تعداد میں ہیں زبان بے حد کٹھن ہے البتہ بحر فارسی ہے۔''

(اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ڈاکٹر اقبال احمد خاں)

''مسلمانوں نے ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی معاشرت کی تقریباً ہر چیز سے دلچسپی لی مثلاً انھوں نے یہاں کی کوک شاستر کا بھی مطالعہ کیا چنانچہ قریشی بیدری نے جس کا تعلق محمود شاہ بہمنی عہد سے ہے اس نے اپنی زبان کو صرا حتاً دکنی کہا ہے۔''

(اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ڈاکٹر اقبال احمد خاں)

''اسی صدی کے اوائل میں (۱۵۰۳ء) میں اشرف بیابانی نے ''نوسرہار'' لکھی جو ہندی تلمیحات و تشبیہات سے مملو ہے اگرچہ اس کا موضوع خالص اسلامی یعنی حادثہ کربلا ہے۔''

(اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ڈاکٹر اقبال احمد خاں)

اردو کے اس تشکیلی وارتقائی دور میں نہ صرف ہندوستانی الفاظ و تعبیرات اس کا

جز بن رہے تھے بلکہ اس وقت کی ہندوستانی تہذیب معاشرت اور مروج ہندوستانی اصناف سخن بھی اس کے ادب کا حصہ بن رہی تھیں یہ سلسلہ نہ صرف خاصہ طویل ہے بلکہ بلا انقطاع مسلسل ہے اور شمال سے جنوب تک کا احاطہ کئے ہوئے ہے دکن میں جہاں اردو کی ابتدائی صورت گری ہوئی اور باقاعدہ ادب کی تشکیل ہوئی وہاں یہ سلسلہ خاصہ مضبوط پائیدار طویل اور مسلسل ہے اگر اس میں گجرات کی اردو یعنی گجری کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ سلسلہ سلسلۃ الذہب بن جاتا ہے اور اس میں صوفیانہ تقدس بھی پیدا ہوجاتا ہے شیخ بہاء الدین باجن جن کی پیدائش گجرات کی ہے اور ابتدائی دور کے صفِ اوّل کے شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے ان کے تخلص باجن ہی سے ہندی ہندیت اور ہندوستانیت نمایاں ہے ڈاکٹر اقبال احمد خاں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت نے اپنے پیر شیخ رحمت اللہ کے ملفوظات اپنی فارسی تصنیف ''خزائن رحمت اللہ'' میں جمع کردیئے ہیں اس کے ساتویں خزانے میں باجن کے دہرے اور جکریاں بھی ملتی ہیں ''جکری'' ذکری کی گجراتی شکل ہے جس میں ذکر خدا اور رسول بیان کیا جاتا ہے ہیئت کے لحاظ سے یہ گیت ہی کی شکل معلوم ہوتی ہے باجن نے ہندوستانی راگ راگنیوں کو پیش نظر رکھ کر ہندی روح سے بھرپور بڑے میٹھے اور سریلے اشعار لکھے ہیں۔'' (اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ڈاکٹر اقبال احمد خاں ص۱۲)

اسی سلسلہ اور پس منظر میں قاضی محمود دریائی کی جکریاں شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا کلام ''جواہر اسرار اللہ'' اور خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' میراں جی کی ''خوش نامہ'' شاہ برہان الدین جانم کی ارشاد نامہ اور دیگر تصانیف اور دکنی کے دور عروج میں خود شاہان بہمنیہ کا کلام اور ان کے دور کے شعراء پھر عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے شعراء اور ان کے شعری و ادبی کارنامے اس بات کے شاہد عادل ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تقریباً

سارے شعراء مسلمان ہی نہیں صوفیاء واولیاء ہیں اور ان کا موضوع خالص اسلامی ہے لیکن ان کا اسلوب بیان ہندی اور ہندوستانی ہے اردو زبان وادب نے ہندوستانی عناصر کو کبھی بھی اور کسی بھی سطح پر فراموش نہیں کیا نہ لفظیات کی سطح پر نہ معنویات کی سطح پر نہ ترکیبات وتصریفات کی سطح پر اور نہ ادبیات وشعریات کی سطح پر کسی کے یہاں لفظیات ہے تو کسی کے یہاں ہندی روایات، کسی کے یہاں ہندی تلمیحات ہیں تو کسی کے یہاں دیومالائی تصورات کسی نے ہندی تشبیہات واستعارات کو پیش کیا ہے تو کسی نے ہندوستانی سماجیات کی تصویر کشی کی ہے اور کسی نے ہندو مذہبیات کی ترجمانی کی ہے ہندوستانی زندگی اور سماجیات و ادبیات کا شاید ہی کوئی گوشہ کوئی رخ ایسا ہوگا جسے اردو نے نظر انداز کیا ہو یا اردو زبان نے اس سے اثر نہ قبول کیا ہو شاید یہی وجہ ہے کہ سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی مشہور کتاب ''انڈو ایرین اینڈ ہندی'' میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''صرف رسم خط کو چھوڑ کر یہ سارا ادب بالکل ہندو روایات کا منت کش تھا۔''

(ہند آریائی اور ہندی مترجم وحید الزماں بحوالہ اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ڈاکٹر اقبال احمد خاں ص ۴)

اُردو زبان اور قومی یکجہتی

اردو زبان اپنے تشکیلی دور سے لے کر دور عروج تک اور دور عروج سے لے کر موجودہ دور تک کسی بھی سطح پر ہندوستانی ماحول معاشرے اور مشترک مزاج اور سماج سے بے نیاز نہیں ہوئی ہے اردو شروع ہی سے سب کے ساتھ مل کر اور سب کو ساتھ لے کر چلتی رہی ہے اس کے مزاج اور خمیر میں یہ بات شامل ہے اس کے تشکیلی عناصر ہی ہندو مسلم ہندی اور ہندوستانی ہیں یہ اخوت ومحبت کی زبان ہے اور اتحاد واتفاق کی علامت بھی، وطن دوستی، وطن پرستی مساوات، رواداری اور قومی یکجہتی کی ضمانت بھی، اس کا ادب اس کی شاعری اسی کی ترجمان ہے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

"اردو ابتداء ہی سے ہندوستان کی ملی جلی تہذیبی زندگی کی آئینہ
دار رہی ہے، لسانی سطح پر ہندوستانی اور ہند ایرانی فضا میں اس نے
سانس لینا شروع کیا اور ادبی اعتبار سے بھی ہندوستانی طرز فکر اور
اسلوب واصناف کے ساتھ ایرانی روایات اور طرز اسلوب سے اپنے
دامن کو وسیع کیا۔" (مقدمہ دکنی اردو عبدالستار دلوی ص ۱۰)

سید مجاور حسین لکھتے ہیں:

اردو شاعری کا مزاج، اس کا خمیر رنگا رنگی کے تصور سے بنا تھا
اس لئے اردو نے جب آنکھیں کھولیں تو سیاسی سرپرستی سے محروم ہو کر
عوام کی گود میں پرورش پائی اسی لئے اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے
جو عناصر نظر آتے ہیں ان کی بنیاد جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے
شعور کے فکری اساس پر ہی ہے یہ بنیاد بہت پہلے پڑ چکی تھی بہت سے
تاریخی عوامل تھے جن کا لازمی نتیجہ اردو زبان کی شکل میں ظاہر ہونا چاہیے
تھا اور جو ظاہر ہوا۔" (اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر سید مجاور حسین ص ۹۵)

زبان وادب پر بھکتی اور تصوف کی تحریک کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ پہلو بہت اہم ہے کہ اس دور کے صوفی ہوں یا ہندو سنت وہ
اپنے خیالات کے اظہار کے لئے جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ وہی
زبان ہے جسے صحیح معنوں میں مشترکہ کلچر کا نمائندہ کہنا چاہیے۔"

(اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر سید مجاور حسین ص ۱۱۷)

اُردو ہندوستانی مزاج اور ماحول سے کسی بھی سطح پر بے نیاز نہیں رہی خواہ وہ ابتدائی دور ہو یا جدید اردو شاعری کا دور ہو جدید اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالستار دلوی رقمطراز ہیں:

"اردو میں جدید شاعری اصطلاحی معنوں میں نظیر اکبر آبادی اور بعد میں انجمن پنجاب کی اس تحریک سے شروع ہوتی ہے جس کے ائمہ آزاد اور حالی ہیں تاہم غیر اصطلاحی معنوں میں جدید شاعری کا نقطۂ آغاز ولی کی شاعری ہے اور ولی سے لے کر جدید اردو غزل از سرتاپا اپنے مزاج طرز فکر علامات اور تشبیہات کے لحاظ سے غیر مذہبی اور خالص ہندوستانی ماحول کی پروردہ ہے اردو کا شاعر ذات الٰہی کے بجائے بت کافر کو پوجتا ہے قشقہ کھینچ کر ترک اسلام کر کے دیر میں پناہ ڈھونڈتا ہے ہندی کی ادبی روایتوں کے برخلاف شیخ اور ملا کے در پے ہوتا ہے اور زاہد کا جامۂ احرام پھاڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے، اردو شاعری میں بھی یہاں کی تلمیحیں، یہاں کی اصطلاحیں یہاں کے پھول اور پتے یہاں کی بسنت ہولی، دیوالی، کرشن، رام جلسے جلوس، پان اور مسّی، یہاں کی سبزیاں مرچوں کی دھانس، کھپریل، ہل غرضیکہ ساری ہندوستانی، مذہبی سماجی اور نیم سماجی، تہذیبی، نیم تہذیبی، ساری علامتیں اور سارے اشارے جاری وساری ہیں"

(مقدمہ دکنی اردو پروفیسر عبدالستار دلوی ص ۱۶ ر ۱۷)

اُردو زبان کی تخلیق، آغاز تدریجی ارتقاء اور اس کی فارسیت وہندوستانیت کی تمہیدی بحث کو ہم یہاں ختم کرتے ہیں اردو زبان کی ہندوستانیت اور اردو کے قومی یکجہتی کے کردار کی مزید وضاحت اور تفصیل کے لئے ڈاکٹر اقبال احمد خاں کی تصنیف "اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر" اور سید مجاور حسین کی کتاب "اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر" کے مطالعے کی درخواست کرتے ہیں جو اپنے اپنے موضوع پر بھرپور مواد کی حامل ہیں۔

''اردو میں جدید شاعری اصطلاحی معنوں میں نظیر اکبر آبادی اور بعد میں انجمن پنجاب کی اس تحریک سے شروع ہوتی ہے جس کے ائمہ آزاد اور حالی ہیں تاہم غیر اصطلاحی معنوں میں جدید شاعری کا نقطۂ آغاز ولی کی شاعری ہے اور ولی سے لے کر جدید اردو غزل از سرتاپا اپنے مزاج طرز فکر علامات اور تشبیہات کے لحاظ سے غیر مذہبی اور خالص ہندوستانی ماحول کی پروردہ ہے اردو کا شاعر ذات الٰہی کے بجائے بت کافر کو پوجتا ہے قشقہ کھینچ کر ترک اسلام کر کے دیر میں پناہ ڈھونڈتا ہے ہندی کی ادبی روایتوں کے برخلاف شیخ اور ملا کے درپے ہوتا ہے اور زاہد کا جامۂ احرام پھاڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے، اردو شاعری میں بھی یہاں کی تلمیحیں، یہاں کی اصطلاحیں یہاں کے پھول اور پتے یہاں کی بسنت ہولی، دیوالی، کرشن، رام جلسے جلوس، پان اور مِسّی، یہاں کی سبزیاں مرچوں کی دھانس، کھپریل، ہل غرضیکہ ساری ہندوستانی، مذہبی سماجی اور نیم سماجی، تہذیبی، نیم تہذیبی، ساری علامتیں اور سارے اشارے جاری وساری ہیں''

(مقدمہ دکنی اردو پروفیسر عبدالستار دلوی ص ۱۶ ر ۱۷)

اُردو زبان کی تخلیق، آغاز تدریجی ارتقاء اور اس کی فارسیت و ہندوستانیت کی تمہیدی بحث کو ہم یہاں ختم کرتے ہیں اردو زبان کی ہندوستانیت اور اردو کے قومی یکجہتی کے کردار کی مزید وضاحت اور تفصیل کے لئے ڈاکٹر اقبال احمد خاں کی تصنیف ''اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر'' اور سید مجاور حسین کی کتاب ''اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر'' کے مطالعے کی درخواست کرتے ہیں جو اپنے اپنے موضوع پر بھرپور مواد کی حامل ہیں۔

شاعری اور اسلام

اسلام خدا کا آخری پیغام ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کی ہدایت صلاح وفلاح بھلائی وکامیابی کے لئے رب کائنات نے نازل فرمایا ہے اسلامی شریعت اور اسلامی نظام فکر چند عبادات وعقائد تک محدود نہیں بلکہ یہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے اور کامیاب زندگی گذارنے کا واضح اور متعین اسلوب ہے اسلامی شریعت انسان، خدا اور کائنات کے بارے میں واضح نظریات پیش کرتی ہے اور ان کے باہمی رشتوں، حقوق اور مطالبات کی مکمل وضاحت کرتی ہے چنانچہ اسلام صرف عبادات وعقائد کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ ایک مستقل نظام فکر نظام حیات اور دستور زندگی ہے انسانی زندگی کے جتنے گوشے ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے مستقل اور مکمل رہنمائی اسلام میں موجود ہے اور یہی رہنمائی دنیا وآخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے زمانہ اس پر مہر تصدیق ثبت کر چکا ہے۔

اسلام کا بنیادی محور انسان، خدا اور کائنات ہے یعنی انسان کا انسان سے کیا رشتہ ہے انسان کا اس کائنات سے کیا رشتہ کیا مطالبہ ہے اور انسان کا اس کائنات کے خالق سے کیا رشتہ ہے اور ان تمام رشتوں کا باہمی تقاضہ اور مطالبہ کیا ہے؟! بنیادی طور پر اسلامی تعلیمات کا محور اور مخاطب انسان ہے کیونکہ انسان ہی اس کائنات کی ایک نامی قوت اور فعال عنصر ہے جسے خالق کائنات نے اپنا خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا ہے تاکہ وہ اس کی مرضیات احکامات اور تعلیمات کو نافذ کرے اور کائنات کو اس کے حکم کے مطابق برتے اور چلائے

اس کے لئے انبیاء اور رسولوں کی بعثت کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا تھا لیکن حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کے بعد سے آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ موقوف ہوگیا تھا اور دنیا چھ سو سال تک آسمانی ہدایت سے محروم ہوکر کفر و جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتی رہی چنانچہ رحمت خداوندی نے ایک مرتبہ پھر نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر انسانوں کو اپنی ہدایات واحکامات کی روشنی سے سرفراز فرمایا اور کتاب ہدایت نازل فرما کر رہتی دنیا تک کے لئے اس کو محفوظ و مامون فرمادیا اور اس کی صراحت فرمادی کہ اب انسانوں کے لئے آسمانی ہدایت کی تکمیل ہوگئی اور وحی ورسالت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا کتاب ہدایت قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ فرما کر ساری دنیا کے انسانوں کو اسی ضابطۂ حیات سے روشنی حاصل کرنے کا مکلف و پابند بنادیا اس طرح زندگی اپنی تمام تر وسعتوں، ضرورتوں تقاضوں اور اپنے تحرکات وفعالیت کے تمام گوشوں کے لئے ہدایت ربانی کی دست نگر بن گئی اور انسان اس آسمانی ہدایت کا مکلف و پابند، لہٰذا جب بھی انسان نے رب کائنات کے مقرر کردہ حدود وقیود سے آزاد ہوکر محض اپنی عقل کے سہارے اپنے لئے کوئی نظام فکر تشکیل دینے کی کوشش کی تو ٹھوکر کھائی ضلالت وگمراہی کی تاریکیاں اس کا مقدر ٹھہریں اور وہ انتشار وتباہی کی دلدلوں میں دھنستا چلا گیا۔

حضور اکرم ﷺ کی بعثت انسانی زندگی کی تاریخ کا خوبصورت اور اہم ترین موڑ ہے آپ ﷺ نے کفر وضلالت کی تاریکیوں میں گم کردہ راہ انسانوں کے لئے ہدایت ربانی کی شمع روشن فرمائی انسانوں کو جہالت کے قعر مذلت نکال کر علم واخلاق کی روشن شاہراہ پر گامزن ہونے کا ہمت وحوصلہ عطا فرمایا، ظلم وبربیت کی خون آشام وادی سے نکال کر عدل وانصاف کے صاف وشفاف چشموں سے سیراب ہونے کا موقع فراہم کیا معاشرتی ذلت وپستی اور طبقاتی کشمکش سے نجات دلا کر باہمی اخوت ومحبت کے جذبے سے سرشار ونہال

کردیا شمس وقمر اور بقر وحجر کی بے روح وبے لذت پرستش کے بندھنوں سے آزاد کرا کر رب
کائنات کی معراج ومعرفت عطا کردی اور انسانوں کی غلامی سے آزاد فرما کر عالمگیر امن وآشتی
کا علمبردار بنادیا انسانی معاشرہ کو پاکیزگی وبلند اخلاقی کا درس دے کر عالمی انسانی برادری
کی تشکیل فرمائی اور "الخلق عیال اللّٰہ" کا زریں اصول پیش کیا (ساری مخلوق اللہ کا کنبہ
ہے) اسلام کی لازوال تعلیمات نے انفرادی واجتماعی اخلاق کا بے مثال نمونہ پیش کیا
آفاقی سطح پر انسانی سیرت وکردار کی تعمیر اسلام کا بنیادی مقصد ہے ایسی تعمیر جس میں انسان
آزاد وخودسر مخلوق نہیں بلکہ (خلیفۃ اللّٰہ فی الارض) زمین پر اللہ کا خلیفہ بن کر ساری
دنیا میں امن وسکون اور عدل ومساوات کا ذمہ دار ونمائندہ بن جاتا ہے اسلام جو معاشرہ تعمیر
کرنا چاہتا ہے اس میں خدا کی خلافت اور حاکمیت کا تصور بنیادی ہے صالح انسانی قدروں
کی تخلیق وتعمیر اور غیر صالح اور غیر انسانی اقدار سے پاک وصاف انسانی معاشرہ کی تخلیق
اسلام کا بنیادی مقصد ہے اسلام زندگی کے آداب سکھاتا ہے خواہ ان کا تعلق انسان کی
انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی یا بین الاقوامی امور سے اسلام کے نزدیک ہر قسم کے
معاشرتی امور واقدار میں خدائے واحد کی حاکمیت کا تصور اصل اور بنیادی ہے زندگی کے
تمام اصول وضوابط کو اسلام اسی پیمانہ سے جانتا اور پرکھتا ہے اور اسی تصور کی ہمت افزائی اور
توسیع واشاعت کا علمبردار ہے، اسلامی معاشرہ کی بنیاد رضائے رب توحید الٰہی مساوات
انسانی کے اصولوں پر استوار ہوتی ہے اور زندگی صالح مقاصد کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے
زندگی کی تمام قدروں کے لئے اسلام کا یہی پیمانہ اور یہی نقطۂ نظر ہے چنانچہ زبان وادب
اور شعر وسخن کے لئے بھی اسلام یہی بنیاد فراہم کرتا ہے ادب زندگی کا سب سے بہتر عنوان
اور سب سے مؤثر ترجمان ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ ادب آداب زندگی سے عبارت
ہے اور آداب زندگی کا معلم بھی ہے خیر وصلاح اور نفاست وطہارت کا عکس جمیل بھی،
شعور وجداں اور دل ودماغ کی غذا بھی، انسانی جلال وجمال کا آئینہ بھی، اور انسانی

معاشرہ کے خط وخال سنوارنے کا ذریعہ بھی ہے معاشرتی درد وکرب کی تصویر بھی ہے اور درد کا درماں بھی چنانچہ اسلام میں جس طرح زندگی کے مختلف گوشوں کے لئے رہنمائی ملتی ہے ادب کا دائرہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

پروفیسر ہارون الرشید لکھتے ہیں:

''اسلام دین فطرت ہونے کی حیثیت سے شاعری کی اہمیت اور انسانی تہذیب وتمدن میں اس کے مرتبہ کو تسلیم کرتا ہے لیکن دوسرے افعال ومحرکات کی طرح اسے بھی ایک خاص حد میں رکھنا چاہتا ہے اس لئے کہ اچھی سے اچھی چیز بھی جب اپنا توزان کھو بیٹھتی ہے اور افراط وتفریط کا شکار ہو جاتی ہے تو اس میں بھی مضر اثرات پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے اسلام نے "**خیر الامور اوسطھا**" (تمام امور میں میانہ روی خیر کا باعث ہے) کا اصول پیش کیا ہے اور ہمیں اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے استعمال میں توزان برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے''

(اردو ادب اور اسلام / پروفیسر ہارون الرشید ص ۵۴)

ادب اپنی جملہ اقسام کے ساتھ اسلامی نظام فکر کا ایک مستقل موضوع ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں اس سلسلہ میں خاصی رہنمائی موجود ہے نبی کریم ﷺ نے خود بنفس نفیس اس سے دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے دور جاہلیت کے بعض شعراء کا کلام سماعت فرمایا اور اس کے حسن وقبح پر اظہار خیال بھی فرمایا ہے ناپسندیدہ عناصر پر گرفت فرمائی اور پسندیدہ عناصر پر تعریفی کلمات ادا فرمائے ہیں اور محض اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ دور جاہلیت کے بعد آپ ﷺ کے عہد مبارک میں وجود میں آنے والے ادب کے لئے حدود وقیود متعین فرما کر ادبی تنقید کی بنیاد فراہم کی ہے مولانا عبید اللہ کوٹی ندوی رقمطراز ہیں:

''آپ ﷺ نے ادب کے بارے میں محدود تصورات کے

بجائے آفاقی نظریات عطا فرمائے جس کی وجہ سے ادب جاہلیت کا
بھی تحفظ ہوا، اور جاہلیت کے ممتاز شعراء کے بارے میں اپنے خیالات
کا بھی اظہار فرمایا، آپ ﷺ کے سامنے مختلف ادبی اصناف پیش کیے
گئے جن کو آپ ﷺ نے دلچسپی سے سنا کہیں لفظی اور کہیں معنوی
اصلاح تو فرمائی مگر اصناف ادب وغیرہ امور میں ذوق وخیال کو پوری
آزادی بھی دی کوئی بندش نہیں لگائی البتہ ادب صالح کے حدود کا
تعین فرمایا کے ادب تعمیر سے ہٹ کر تخریب کی سرحدوں میں داخل
نہ ہو جائے۔"

(نقد ادب کے اسلامی اقدار رعبید اللہ کوثی ندوی سہ ماہی کاروان ادب، مارچ ۱۹۹۵ء ص ۱۷۰)

شعر وادب کے کے سلسلہ میں حضور ﷺ سے بہت سی احادیث منقول ہیں جن
سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان وادب کی تحسین وتزئین مطلوب ومستحسن ہے اور شعر وسخن اسلام
میں شجر ممنوعہ نہیں بلکہ اسلام اس کی تحصیل اور اس کے مؤثر ومفید استعمال کی ہمت افزائی کرتا
ہے درجہ ذیل احادیث اس کی روشن مثالیں ہیں۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا "**فیمـا الجمـال ؟!**"
حسن کس چیز میں ہونا چاہیے ؟! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**فـــي
اللسان يريد البيان**" اسے زبان وادب میں ہونا چاہیے۔

(العمدة ر ص ۱۶۱ ر بحوالہ کاروان ادب جنوری ۱۹۹۵ء)

دوسری جگہ ارشاد گرامی ان الفاظ میں منقول ہے:

"**تـعـلـمو الشعر فانه يعرب السنتكم**" شعر وسخن کی تعلیم
حاصل کرو اس سے تمھاری زبان شستہ وپاکیزہ ہو جائے گی۔

(مسند الفردوس رجامع الصغیر ر بحوالہ کاروان ادب، جنوری ۱۹۹۵ء)

''شعروسخن سے کیف ونشاط حاصل کرنے کی ترغیب بھی زبان نبوت سے ثابت ہے ایک مرتبہ حضور ﷺ کی ایک مجلس میں قرآن کریم کی آیات کی تلاوت اور شعروسخن کا سلسلہ جاری تھا حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اس پر حضور ﷺ نے تعجب کے ساتھ دریافت فرمایا: یارسول اللہ ﷺ قرآن بھی اور شعروسخن بھی ......!! آپؐ نے جواب ارشادفرمایا'' روحوا القلوب ساعة فساعة" کبھی کبھی دلوں میں نشاط وسرور بھی پیدا کرلیا کرو۔''

(ابوداؤد عن انس۔کاروان ادب رجنوری ۱۹۹۵ء)

''نبی کریم ﷺ کبھی کبھی شعراء عرب کے بہترین اشعار سنانے کی فرمائش بھی کرتے تھے اور صحابہ کرام بہترین اشعار سناتے بھی تھے حضرت عمرو بن شرید ؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک روز رسول اللہؐ کے پیچھے سواری پر سوار ہوا آپؐ نے مجھ سے فرمایا "امیہ ابن ابی الصلت" کے کچھ شعر یاد ہیں میں نے عرض کیا ہاں، آپؐ نے فرمایا سناؤ میں نے ایک شعر سنایا آپؐ نے فرمایا اور سناؤ میں نے پھر ایک شعر پڑھا آپؐ نے فرمایا اور سناؤ اس طرح میں نے سو شعر سنائے'' (مسلم بحوالہ اردو ادب اور اسلام ، پروفیسر ہارون الرشید ص ۵۳)

ایک مرتبہ حضرت حسان بن ثابت ؓ سے بھی آپ ﷺ نے دور جاہلیت کا ایک قصیدہ سنانے کی فرمائش کی اور دور جاہلیت کے سرمایۂ شعر کی نقل وروایت کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا:

"یاحسان انشدنی قصیدة من شعر الجاهلیه فان الله قدوضع عنا آثا مها فی شعر ها وروایتها"

"اے حسان مجھے دور جاہلیت کا کوئی قصیدہ سناؤ اللہ تعالیٰ نے جاہلی شاعری کی روایت اوراس کے گناہوں کو ہم سے دور کردیا ۔"

(دلائل الاعجاز ص ۱۶ رکاروان ادب رجنوری ۱۹۹۵ء)

نبی کریم ﷺ کے اس طرز عمل کے بارے میں مولانا عبداللہ کوئی ندوی لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ؐ کی طرف سے یہی طرز عمل ادب جاہلی کے تحفظ کا سبب بنا، ادب جاہلی کے کے بارے میں رسول اللہ ؐ کا یہی طرز عمل اسلام کے ادبی نقطۂ نظر کی وسعت اس کی بے تعصبی اوراس کی آفاقیت کی دلیل ہے۔"

(نقد ادب کے اسلامی اقدار رعبیداللہ کوئی ندوی رکاروان ادب جنوری، ۱۹۹۵ء ص ۱۷۸)

نبی کریم ﷺ نے دور جاہلی کے کئی مشہور شعراء کے بارے میں اپنی رائے ظاہر فرمائی اوران کی شعر گوئی پر مختصر تبصرہ بھی فرمایا اس کے ظاہری اور معنوی حسن وقبح کی نشاندہی بھی فرمائی، نبی کریم ؐ نے صرف دوسروں ہی سے اشعار نہیں سنے بلکہ آپ ؐ خود بھی کبھی کبھی اشعار پڑھتے تھے اور زبان نبوت سے ادا ہونے والے اشعار میں کبھی کبھی تقدیم تاخیر بھی ہوجاتی تھی تو بعض صحابہ کرام اس کی تصحیح بھی کردیا کرتے تھے ایسے موقع پر آپ ؐ ارشاد فرماتے "میں شاعر نہیں" حضرت ابوبکر ؓ اور خود حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے ایسے واقعات منقول ہیں۔

ایک بار آنحضرت ﷺ نے عباس ؓ بن مرداس سلمی سے پوچھا کہ کیا یہ شعر تمہارا ہے "اتجعل نهبي ونهب العبيد = وبين الا قوع وعينيه" حضرت عباس نے آخری فقرہ کو یوں موزوں بنایا "بين عينية والاقزع" اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میں شاعر نہیں" حضرت عائشہ کی روایت کے مطابق آنحضرت کو شعر سے رغبت نہ تھی کبھی بنی قیس کے کسی شاعر کا ایک آدھ شعر پڑھ لیتے لیکن

ان میں بھی تقدیم وتاخیر کا عمل ہوتا، حضرت ابو بکرؓ ہمیشہ فرماتے کہ یا رسول اللہ فلاں شعر یوں ہے پھر آپ وہی فقرہ دہراتے ''میں شاعر نہیں'' ایک بار حضرت عائشہؓ نے بھی طرفہ کے ایک مصرعہ کو موزوں بنادیا، آنحضرتؐ نے جب یہ مصرعہ پڑھا "ویأ تیك من لم تزود بالاخبار" حضرت عائشہ نے مصرعہ کو موزوں پڑھا ویأتیك بالاخبار من لم تزود۔''

(شعر ادب پر اولین ماورائی تنقید وتہدید ر پروفیسر حبیب الحق ندوی رکاروان ادب جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء ص ۲۵)

نبی کریم ﷺ نے شعر وشاعری کی تعریف بھی فرمائی اور بعض صحابہؓ کرام کو (جو شاعر تھے) شعر گوئی کے لئے حکم بھی فرمایا ان کی تائید بھی فرمائی اور ہمت افزائی بھی نبی کریمؐ کے دور مبارک میں صحابہؓ کرام شاعری کا چرچہ بھی کرتے تھے اور باقاعدہ شاعری بھی کرتے تھے اور شاعر الرسول اور شاعر الاسلام کے خطاب سے بھی سرفراز تھے۔

ابوداؤد میں حضرت صخر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ آنحضرت نے فرمایا: ان من الشعر لحکماوان من البیان لسحرا.. بعض شعر حکیمانہ اور بعض بیان جادوئی اثر رکھتے ہیں۔

آپؐ امیه ابن ابی الصلت کا شعر سن کر فرمایا کرتے تھے:

"آمن شعره وکفر قلبه" اس کا شعر تو مومن ہے مگر دل کافر ہے'' یہ روایت بخاری اور ابوداؤد دونوں میں مروی ہے۔

(شعر ادب پر اولین ماورائی تنقید وتہدید ر پروفیسر حبیب الحق ندوی رکاروان ادب جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء ص ۲۵)

رسول اللہ ﷺ نے معلقات کے ایک شاعر لبید کا مصرعہ ألاکل شیٔ ماخل الله باطل نقل کرتے ہوئے اپنی بھرپور پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا:

" اصدق کلمة قالهاالشاعر کلمة لبید "لبید کی یہ بات شاعر کے منہ

سے نکلنے والی سب سے سچی بات ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم جاہلی شعراء میں سے عنترہ، امرؤالقیس، اعشیٰ، زہیر بن ابی سلمیٰ طرفۃ العبد کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے امرؤالقیس کے بارے میں آپ کی رائے آپ کا تبصرہ بہت ہی جامع اور مانع ہے ایک مرتبہ حضورؐ سے امرؤالقیس کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ماقبل اسلام کا سب سے بڑا اور مانا ہوا شاعر تھا آپؐ نے فرمایا تھا أشعر الشعراء قائدھم الی النار ......بہترین شاعر ہے اور شعراء کو جہنم کی طرف لے جانے والا قائد بھی ہے

یہ بہت جامع تبصرہ ہے اس میں اس کے شاعر ہونے میں کلام نہیں کیا گیا بلاشبہ وہ بہت بلند پایہ شاعر تھا اس کی شاعری بحیثیت فن اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی لیکن اس کی کج فکری پریشان خیالی عریانیت وفحاشی شراب نوشی اور لذت اندوزی جھوٹ اور مکر وفریب کی ترجمان بھی تھی فنی عروج مکمل تھا لیکن خیال وفکر کی پستی نے اسے اشعرالشعراء ہونے کے باوجود جہنمی شعراء کا قائد بنادیا اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی نظر میں محض فنی عروج شاعری کے لئے معراج کمال نہیں ہے بلکہ فنی عروج کے ساتھ ساتھ خیال کی بلندی پاکیزگی اور صلاح وفلاح تعمیر سیرت وکردار بھی عین مطلوب ہے اچھا شعر وہی ہوسکتا ہے جس کا تخیل بھی بلند خوبصورت اعلیٰ پاکیزہ اور صداقت پر مبنی ہو اسلام کی نظر میں محض لفظی شعبدہ بازی اور تخیل کی قلابازی یا معانی سے عاری فنی بازیگری کی کوئی اہمیت نہیں اسلام کے نزدیک فن ترسیل معانی کا ذریعہ ہے فن وادب مقصد نہیں وسیلہ ہے اسی لئے فن برائے فن اور ادب برائے ادب کا نظریہ قابل قبول نہیں ہے اسلام ادب میں لفظوں کی بازیگری کا قائل نہیں ہے بلکہ لفظ ومعانی کے بامقصد اتصال اور نتیجہ خیز فنی اظہار کو فن کا عروج تسلیم کرتا ہے لفظ اور معنی کے اتصال سے وجود میں آنے والی اکائی کی اہمیت کا قائل ہے ایسی اہمیت جو شاعر اور فنکار کے ذاتی ذہنی وجود سے بلند ہو کر قاری کو اور ایک انسان کو ذہنی فکری بلندی کی طرف لے جائے تعمیر کی طرف بڑھنے کا حوصلہ عطا کرے انسانیت کی اعلیٰ اقدار،

اخلاقیات کی دلکش ترجمانی اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دے اس کے شعور ووجدان میں رقت، دل سوزی ودل گدازی کا رس گھول دے، مکروفریب، جھوٹ، عریانیت، فحاشیت، لذت کوشی، کام جوئی، بادہ کشی شہوانیت، برانگیختگی، عشق بازی، جنگ وجدل، منافرت، عصبیت اور مشرکانہ خرافات کی ترجمان نہ ہو مختصر یہ کہ لفظیاتی ومعنیاتی جمالیات سے آراستہ وپیراستہ ہو ایسی شاعری ایسا ادب عین مطلوب ہے اور قرآن وحدیث خود ایسے ادب کے بے مثال ولازوال نمونے ہیں قرآن کریم فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہی نہیں معیار فصاحت وبلاغت ہے نزول قرآن کے وقت عربی شاعری اور خطابت اپنے پورے عروج پر تھی بڑے بڑے شعراء وخطباء کا طوطی بول رہا تھا بہترین شعراء عرب کے بہترین قصائد کا انتخاب بطور اعزاز وعظمتِ فن خانہ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیا جاتا تھا اور یہ عظمت فن کی آخری دلیل تھی لیکن جب قرآن کریم نازل ہوا عرب کے بڑے بڑے شعراء دنگ رہ گئے کئی شعراء نے تو شعر گوئی ترک کردی اور قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت کی شہادت دی قرآن کریم کے نزول کے بعد عربی شعروادب میں ایک انقلاب آ گیا۔ طلوع اسلام سے زبان وادب کے نئے آفاق روشن ہوئے ذہن وفکر کے لئے نئے موضوعات میسر آئے اسلام کی اعتقادی اخلاقی اور روحانی تعلیمات نے عربی شاعری کو ایک نیا موڑ دیا شرک وبت پرستی، تعصب ونفرت قبائلی فخر وغرور اور جنگ وجدال کے خلاف آواز بلند کی اور نئی معاشرتی قدریں وجود میں آئیں اسلام اور بت پرستی کے ٹکراؤ سے ایک ہنگامہ خیز فضا پیدا ہوئی جو شعر وشاعری کے لئے سازگار ثابت ہوئی اور ایک نئے قسم کی شاعری وجود میں آئی حضورؐ کی تعلیمات کی ترویج واشاعت سے شاعری کے اسلوب اور منہج میں خوش گوار تبدیلی آئی خود حضورؐ کے اقوال واحادیث نے بھی اس جدید شاعری میں نئے معانی ومفاہیم پیدا کئے اسلام نے شاعری کو لہو ولعب اور ذہنی عیاشی کے بجائے تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کیا شاعری

کی براہ راست مذمت نہیں فرمائی بلکہ اس کے روایتی اسلوب کو بدل کر نئی ادبی قدروں کے فروغ کے لئے استعمال فرمایا اسلام نے بت پرستی کے بجائے توحید الٰہی کے تصور کو فروغ دیا اور لفظ و معانی دونوں اعتبار سے شاعری کی تحسین و تزئین پر زور دیا کذب کے مقابلہ میں صداقت کو شاعری کا حسن قرار دیا اسلام کی آمد سے پہلے جاہلی شاعری میں یہ مقولہ معیار شاعری تھا کہ " اکذب الشعرا عذبہ "شعر صداقت سے جتنا دور ہوگا اتنا ہی لطیف وخوشگوار ہوگا اسلام نے اس کا بالکل عکسی پیمانہ مقرر کیا کہ "أصدق الشعر اعذبہ" شعر صداقت سے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی حسین وخوبصورت ہوگا حضور ﷺ نے ابن رواحہ کو جو اسلامی شاعر تھے الفاظ کی بازی گری سے منع فرمایا :

"اياك والسجع ياابن رواحة"

اے ابن رواحہ الفاظ کی بے مقصد قافیہ پیمائی سے بچو۔

(مسند ابویعلی، البیان والتبیین کاروان ادب جنوری ۱۹۹۵ء)

آپؐ نے پر تکلف مسجع، مقفی زبان کے استعمال کرنے والوں پر لعنت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا : "لعن الله الذين يشققون الخطب تشقيق الشعر "اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر لعنت فرماتا ہے جو شاعری کے انداز میں خطبہ دیتے ہیں ایک دوسرے کی کردار کشی پر مبنی ہجو کی آپؐ نے شدت سے مخالفت فرمائی اور ایسے ہجو یہ قصیدے کی نقل وروایت پر پابندی عائد فرمادی اسی طرح فحش اشعار پر مشتمل قصیدے کی روایت کو بھی منع فرمایا بے موقع اور بے ضرورت مداحی اور اس میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ کو بھی ناپسند فرمایا آپؐ نے شاعری کی کسی مخصوص ہیئت اور صنف کو پسند و ناپسند کا معیار نہیں ٹھرایا بلکہ اس کے ذریعہ پیش کی جانے والی فکر اور قدروں کو پسند و ناپسند کا معیار ٹھہرایا شاعری اور زبان وادب کے سلسلہ میں آپؐ کی تعلیمات بھی عربی شاعری کی جدید تنقید کا معیار قرار پائیں اس طرح نبی کریمؐ نے ادبی تنقید میں بھی نئی بنیادیں فراہم فرمائیں جو اس سے پہلے تک

ناپید تھیں غرض کسی بھی اعتبار سے فی نفسہ فن وادب کا کوئی اسلوب قابل مذمت نہیں ٹھہرایا
نبی کریمؐ کی فراہم کردہ ادبی قدروں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسلام اور شاعری میں تضاد اور تنافر
ہے صحیح نہیں ہوگا شاعری اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں ہے تاوقتیکہ وہ سفلیات و سطحیات
کی ترجمان نہ بنے فی نفسہ شاعری کی مذمت قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے یہی وجہ
ہے کہ ہر دور میں وقت کے اہل اللہ نے شاعری کو نہ صرف اپنایا ہے بلکہ شعری وادبی قافلہ
کی قیادت کی ہے بڑے بڑے صوفی اور اولیاء اللہ اپنے وقت کے مانے ہوئے مستند شاعر
گذرے ہیں اگر اسلام میں شاعری شجر ممنوعہ ہوتی تو اہل اللہ کا طرز عمل قطعاً مختلف ہوتا
اسلام شاعری کی مطلق مذمت نہیں کرتا نہ حرام قرار دیتا ہے اور نہ مکروہ سمجھتا ہے ہاں شاعری
کے غلط اور بے جا استعمال اور بے مصرف اشتغال کی مذمت بہر حال مسلم ہے بے مقصد اور
لایعنی شاعری ہر حال میں قابل مذمت ہے اسلام کا یہ اصول شاعری کے ساتھ خاص نہیں
تمام اشیاء کے لئے ایک بنیادی اصول ہے چنانچہ اس وضاحت وتفصیل کی ضرورت ہے کہ
احادیث نبوی اور قرآن کریم میں شعر وشاعری کی مذمت کا بنیادی محور کیا ہے اور قرآن کریم
نے شاعری اور شعراء کے لئے جو سخت اسلوب اختیار کیا ہے اس کا مرکزی نقطہ کیا ہے؟؟!!

یہ بحث اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مذہبی تاریخ میں شعراء اور انبیاء کا ذکر تقابل
کے طور پر ملتا ہے انبیاء کرام اور شاعری یا شعراء اور انبیاء کا تقابل عجیب بے جوڑ سی بات لگتی
ہے چہ نسبت خاک را با عالم پاک جبکہ یہ ایک تاریخی صداقت بھی ہے کہ کوئی نبی شاعر
نہیں ہوا اور نہ کسی شاعر کو نبوت سے سرفراز کیا گیا پھر آخر کیا وجہ ہے کہ نبوت کے پس
منظر میں شاعری کی بازگشت سنائی دیتی ہے، دراصل یہ سطحی عوامی سوچ کا نتیجہ ہے عوامی
سطح پر ہر دور میں شاعر کو ایک عظمت واہمیت حاصل رہی ہے اس کے کلام کی تاثیر کی وجہ
سے اور فکری وتخیلاتی بلند پروازی کی وجہ سے معاشرہ میں شاعر کچھ مافوق الفطرت
حیثیت کا حامل رہا ہے یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی نبی مبعوث ہوا لوگوں نے اسے ساحر

ناپید تھیں غرض کسی بھی اعتبار سے فی نفسہ فن وادب کا کوئی اسلوب قابل مذمت نہیں ٹھہرایا نبی کریمؐ کی فراہم کردہ ادبی قدروں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسلام اور شاعری میں تضاد اور تنافر ہے صحیح نہیں ہوگا شاعری اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں ہے تاوقتیکہ وہ سفلیات وسطحیات کی ترجمان نہ بنے فی نفسہ شاعری کی مذمت قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں وقت کے اہل اللہ نے شاعری کو نہ صرف اپنایا ہے بلکہ شعری وادبی قافلہ کی قیادت کی ہے بڑے بڑے صوفی اور اولیاء اللہ اپنے وقت کے مانے ہوئے مستند شاعر گذرے ہیں اگر اسلام میں شاعری شجر ممنوعہ ہوتی تو اہل اللہ کا طرز عمل قطعاً مختلف ہوتا اسلام شاعری کی مطلق مذمت نہیں کرتا نہ حرام قرار دیتا ہے اور نہ مکروہ سمجھتا ہے ہاں شاعری کے غلط اور بے جا استعمال اور بے مصرف اشتغال کی مذمت بہر حال مسلم ہے بے مقصد اور لایعنی شاعری ہر حال میں قابل مذمت ہے اسلام کا یہ اصول شاعری کے ساتھ خاص نہیں تمام اشیاء کے لئے ایک بنیادی اصول ہے چنانچہ اس وضاحت وتفصیل کی ضرورت ہے کہ احادیث نبوی اور قرآن کریم میں شعر وشاعری کی مذمت کا بنیادی محور کیا ہے اور قرآن کریم نے شاعری اور شعراء کے لئے جو سخت اسلوب اختیار کیا ہے اس کا مرکزی نقطہ کیا ہے؟؟!!

یہ بحث اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مذہبی تاریخ میں شعراء اور انبیاء کا ذکر تقابل کے طور پر ملتا ہے انبیاء کرام اور شاعری یا شعراء اور انبیاء کا تقابل عجیب بے جوڑ سی بات لگتی ہے چہ نسبت خاک را با عالم پاک جبکہ یہ ایک تاریخی صداقت بھی ہے کہ کوئی نبی شاعر نہیں ہوا اور نہ کسی شاعر کو نبوت سے سرفراز کیا گیا پھر آخر کیا وجہ ہے کہ نبوت کے پس منظر میں شاعری کی بازگشت سنائی دیتی ہے، دراصل یہ سطحی عوامی سوچ کا نتیجہ ہے عوامی سطح پر ہر دور میں شاعر کو ایک عظمت واہمیت حاصل رہی ہے اس کے کلام کی تاثیر کی وجہ سے اور فکری وتخیلاتی بلند پروازی کی وجہ سے معاشرہ میں شاعر کچھ مافوق الفطرت حیثیت کا حامل رہا ہے یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی نبی مبعوث ہوا لوگوں نے اسے ساحر

یا شاعر سمجھنے کی حماقت ضرور کی اور بطور خاص نبی کریمؐ کی بعثت کے زمانے میں تو شاعر کی ایک خاص اہمیت تھی اسے بڑا مقام و مرتبہ حاصل تھا اس کے کلام کو بیت اللہ کی دیواروں پر آویزاں کیا جاتا تھا زمانہ جاہلیت میں عوامی سطح پر تین طبقے کے لوگوں کو ایک قسم کی عزت و عظمت حاصل تھی کاہن، ساحر اور شاعر، ان کی عظمت میں قدر مشترک ان کا علم وفن تھا شاعری منتہائے کمال پر فائز تھی چنانچہ جب نبی کریمؐ نے لوگوں کے سامنے وحی الٰہی یعنی کلام اللہ کو پیش کیا تو اولاً سادہ لوح عوام نے اسے شاعری پر محمول کیا اور سمجھدار و معاملہ فہم سرداران قبائل نے بھی عوام الناس کو یہ یقین دلانے کی شعوری کوشش کی کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ خدا کا کلام نہیں بلکہ کاہنوں اور شاعروں کا کلام ہے اور محمدؐ بھی ایک شاعر اور کاہن ہیں اللہ کے فرستادہ نبی اور رسول نہیں ہیں لہٰذا ان کی بات مان کر اپنے باپ دادا کا موروثی دین ترک کرنے کی ضرورت نہیں شاعر اور کاہن تو نئی نئی باتیں کہتے ہی رہتے ہیں اس طرح شعوری اور غیر شعوری طور پر وحی الٰہی کو شاعری کے مماثل قرار دینے کی کوشش کی گئی اور حضورؐ کی شخصیت اور منصب نبوت و رسالت کو بے اثر اور بے معنی بنا دینے کی شرارت کا ارتکاب کیا گیا اس پردہ میں دراصل حضورؐ کی رسالت کا انکار کیا جا رہا تھا اور یہ کلام الٰہی کے انکار کی کوشش تھی نبی کریمؐ کی شخصیت پر کہانت اور شاعری کا الزام درحقیقت نبوت اور وحی الٰہی کا انکار تھا چنانچہ قرآن کریم نے پوری طاقت و قوت کے ساتھ اس شرارت اور حماقت پر سخت گرفت کی حضورؐ کا اور حضورؐ کے پیش کردہ کلام الٰہی کا پرزور دفاع کیا اور اس کی بھرپور وضاحت کی کہ محمدؐ نہ تو شاعر ہیں نہ کاہن ہیں نہ ہی آپ کے اوپر جنات و شیاطین کا اثر ہے بلکہ محمدؐ کو ہم نے آسمانی شریعت اور آسمانی کتاب دے کر نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے نبی کی شخصیت اور شاعر یا کاہن کی شخصیت و کردار میں زمین آسمان کا فرق ہے نبی "موئیدمن اللہ" اور معصوم ہوتا ہے اس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہوتا جبکہ شعراء کے قول و فعل میں بڑا تضاد ہوتا ہے

وہ وادی خیال میں بھٹکتے پھرتے ہیں جبکہ کاہنوں پر شاطین واجنہ کا اثر ہوتا ہے جس زور وشور کے ساتھ شاعر اور کاہن کہہ کر حضورؐ کی شخصیت و کردار کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی تھی اتنے ہی زور دار انداز میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کا دفاع فرمایا اور سخت تہدید آمیز لہجے میں شعراء کا ذکر فرمایا تا کہ رسول کو شاعر کہنے اور سمجھنے والے رسولؐ اللہ کی شخصیت کے مقام ومرتبہ کو پہچان لیں اور اس پر متنبہ ہوسکیں قرآن کریم نے رسول اللہ کے دفاع میں شعراء کی مذمت فرمائی ہے اور شعراء کے کلام اور رسول اللہ کے پیش کردہ دعوت وپیغام کا فرق واضح کیا ہے اسی کے ساتھ ساتھ قرآن کریم نے ان شعراء کا استثناء بھی کر دیا جو رسول کی دعوت پر ایمان لائیں اور ان کے پیغام کو اپنی شاعری کا موضوع بنائیں اگر مطلقاً شاعری ہی قابل مذمت ہوتی تو شعراء کا استثناء ہرگز نہیں کیا جاتا یہی استثنا اس بات کی دلیل ہے کہ شاعری فی نفسہ مذموم نہیں ہے قرآن کریم میں چھ جگہ شعر اور شعراء کا ذکر ہے اور ہر آیت میں وحی الٰہی اور رسولؐ اللہ کی شخصیت کا دفاع کیا گیا ہے اور صالح اور غیر صالح شعراء کے درمیان تفریق کی گئی ہے صالح اور غیر صالح سے مراد حق پرست اور ہوس پرست شعراء ہیں آیات قرآنی کے ترجمہ وتفصیل سے اس کی مزید وضاحت ہوگی اس سلسلہ کی سب سے مشہور آیت سورۃ الشعراء کی آیت نمبر ۲۲۴ ہے اسی آیت کی وجہ سے یہ سورۃ سورۂ شعراء کہلاتی ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ٥ اَلَمْ تَرَاَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ٥ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ٥ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِمَا ظُلِمُوْا وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ٥

(سورۃ الشعراء آیت: ۲۲۴ تا ۲۲۷ - پارہ ۱۹)

”رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں کیا تم

دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوں گے"

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ (سورۂ طور آیت ۲۹،۳۴ پارہ ۲۷)

"آپ سمجھاتے رہیے کیونکہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ نہ تو کاہن ہیں اور نہ مجنون (جیسا کہ یہ کافر کہتے ہیں) ہاں کیا یہ لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں اور ہم ان کے بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں آپ فرما دیجیے تم منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں، کیا اُن کی عقلیں اُن کو اِن باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ کہ یہ لوگ شریر ہیں، ہاں کیا یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انھوں نے اس (قرآن) کو خود گڑھ لیا ہے بلکہ یہ لوگ تصدیق نہیں کرتے تو یہی لوگ (مشرکین) اس طرح کا کوئی کلام بنا کر لے آئیں اگر وہ سچے ہیں (اپنے دعویٰ میں)"

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ (سورۂ انبیاء آیت ۵ پارہ ۱۷)

"بلکہ انھوں نے کہا یہ محض خواب وخیال کی باتیں ہیں بلکہ من گھڑت

دعویٰ ہے، بلکہ یہ شاعر ہے (اگر ایسا ہے) تو کوئی نشانی ہمیں لا کر دکھائے
جس طرح اگلے وقتوں کے لوگ نشانیوں کے ساتھ بھیجے جا چکے ہیں۔"

وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْآ اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝ بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ
وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَذَائِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ۝

(سورۂ صفات آیت ۳۶ تا ۳۸، پارہ ۲۳)

"اور کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ کی وجہ
سے چھوڑ دیں گے بلکہ یہ تو ایک سچا دین لے کر آئے ہیں، اور دوسرے
پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہیں یقیناً تم سب کو دردناک عذاب چکھنا
پڑے گا۔"

مذکورہ بالا آیات میں مشرکین مکہ نے حضورؐ کی رسالت اور وحی الٰہی کو نہ ماننے اور رد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے حضورؐ کی ذات عالی پر شاعری کہانت جنون اور خواب وخیال کی باتیں بنانے کے الزامات عائد کئے ہیں اور کلام الٰہی کو شاعری جنون اور کہانت سے تعبیر کرنے کی دیدہ ودانستہ کوشش کی ہے کلام الٰہی کو رسول کا خود ساختہ کلام گردانا ہے اور دیوانے شاعر کی بڑ قرار دیا ہے قرآن کریم نے مشرکین مکہ کی اس جہالت ہٹ دھرمی سرکشی اور بغاوت کی نشاندہی کی ہے اور سخت گرفت فرماتے ہوئے چیلنج بھی پیش کیا ہے کہ اس جیسا کلام یا کلام کا ایک ٹکڑا ہی بنا کر پیش کردو مشرکین مکہ کے اس طرز عمل کا تقابلی ذکر کرتے ہوئے نبی کریمؐ کی اصل حیثیت اور پوزیشن کی وضاحت کی ہے اور حضورؐ کا دفاع بھی کیا ہے کہ آپؐ نہ کاہن ہیں نہ شاعر ہیں نہ جنون کا شکار ہیں اور نہ خوابوں کے اسیر ہیں بلکہ اللہ کے پیغامبر اور رسول ہیں سچا دین پیش کرتے ہیں اور تمام سابق انبیاء کی تصدیق کرتے ہیں حق وصداقت کے علمبردار اور دین حق کے داعی ہیں ساتھ ہی رسولؐ اللہ کی شخصیت سے متعلق اس قسم کی باتیں کرنے والوں، کہانت،

جنون اور شاعری کا الزام لگانے والوں کو جھوٹا سرکش اور باغی قرار دیا ہے نیز عذاب الیم میں مبتلا کرنے کی وعید بھی فرمائی ہے اور رسول اللہ کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے آپ کی شخصیت کو ان الزام تراشیوں سے پاک منزہ بلند اور ماوراء ثابت کیا ہے سورہ یٰس میں بڑی وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ شاعری پیغمبر کے شایان شان نہیں پیغمبر شاعری نہیں کرتا کلام الٰہی پیش کرتا ہے اور یہی اس کی شان ہے ہم رسول کو شاعری نہیں سکھاتے پیغام الٰہی کا ترجمان بناتے ہیں جو کچھ وہ پیش کرتا ہے شاعری نہیں قرآن مبین ہے:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۝ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۝

(سورۂ یٰس آیت ۶۹ ۷۰ پارہ ۲۳)

"اور ہم نے انھیں شاعری کا علم نہیں دیا اور یہ ان کے شایان شان بھی نہیں ہے وہ تو محض ذکر اور قرآن مبین ہے تا کہ وہ ڈرائیں ان کو جو زندہ ہیں (جن کا ضمیر زندہ ہے) اور کافروں پر حجت پوری ہو جائے۔"

دوسری جگہ رسول کی شخصیت پر کافروں کے عائد کردہ الزامات کی واضح تردید اس طرح مذکور ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (سورۂ الحاقہ آیت ۴۰ ۴۳ پارہ ۲۹)

"یہ (قرآن) ایک معزز فرشتہ کا لایا ہوا کلام ہے یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے تم بہت کم ایمان لاتے ہو، اور نہ یہ کسی کاہن کی بات ہے، تم بہت کم سمجھتے ہو یہ تو رب العالمین کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔"

اللہ رب العزت نے رسولؐ اللہ کی شخصیت اور وحی الٰہی پر عائد الزامات میں سے ایک ایک بات کی تردید فرمادی ہے قرآن پاک کی یہی تردید اور تہدید اس غلط فہمی کا باعث ہوئی اور ہوتی ہے کہ اسلام شاعری کا مخالف ہے آیات کا سخت لب ولہجہ شاعری کی مذمت اور تردید نہیں ہے بلکہ اس شرارت حماقت اور دیدہ ودانستہ جہالت کی تردید و مذمت ہے جو مشرکین مکہ نے رسولؐ اللہ کی اندھی مخالفت کی خاطر برپا کر رکھی تھی تاکہ سادہ لوح زندہ ضمیر انسانوں کو جو پیغام حق قبول کرنا چاہتے تھے روکا جاسکے یہ غصہ کفار قریش کے رویہ کے خلاف تھا جو نبوت کے مقام ومرتبہ اور پیغام الٰہی کی صداقت وحقانیت کو کہانت، شاعری اور صنمیات کے پیچ وخم میں الجھا کر خدا کے سادہ دل بندوں کو دعوت حق سے دور رکھنا چاہتے تھے اور کفر وضلالت کے بندھنوں میں اسیر رکھنا چاہتے تھے یہ رویہ مذمت کا متقاضی تھا مشرکین مکہ بطور خاص سرداران قریش خوب سمجھتے تھے کہ رسول شاعر نہیں اور نہ وہ کلام شاعری ہے جسے رسول پیش کرتے ہیں محض مخالفت کی خاطر دیدہ ودانستہ جہالت اور ہٹ دھرمی کی یہ روش یقیناً قابل مذمت تھی چنانچہ بہت پرزور انداز میں اس روش کی تردید ومذمت کی گئی ورنہ فی نفسہ شاعری کی مذمت نہ مقصود تھی اور نہ کی گئی ہاں اس ضمن میں شعراء کی مذمت کا جو پہلو نکلتا ہے وہ تقابلاً اور ضمناً ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ نے لفظ شاعر کو اور شاعر کی عرفی حیثیت کو اپنی مقصد برآری کے لئے بطور آلہ اور وسیلہ استعمال کیا تھا وہ رسول کو شاعر کہہ کر دراصل نبوت کا انکار کرنا چاہتے تھے رسول کو شاعر قرار دے کر نبوت کے مقام ومرتبے کو فروتر بنانے کی یہ ایک شعوری کوشش تھی دعوت حق کی مخالفت کا ایک انداز تھا ایک سوچی سمجھی سازش تھی اسی لئے قرآن کریم نے رسول اللہ کی شخصیت سیرت وکردار ان کی دعوت ان کے کلام کی حقیقت کو اور شعراء کے قول وفعل کے تضاد، خیالی بلند پروازی اور عملی درماندگی وبے عملی کو وضاحت سے بیان کیا اور شاعر اور رسول کی شخصیت کے تابین جو بعد المشرقین اور زمین آسمان کا فرق ہے اس کی وضاحت فرماتے ہوئے رسول اللہ کا بھرپور

دفاع کیا اور شعراء کی مذمت فرمائی مقصود کلام رسول کی شخصیت کا دفاع ہے شعراء کی مذمت نہیں اور اس مذمت میں بھی صاحب ایمان اور صاحب کردار (صالح) شعراء کا استثناء فرمادیا اور یہی استثناء تنقید فن کی بنیاد ثابت ہوا، شعراء کی طبقات بندی کے ساتھ ساتھ فن شاعری کی بھی حد بندی ہوگئی قرآن کریم نے فن کے لئے مضمون ومفہوم کی اساس فراہم کر کے لفظوں کے گورکھ دھندوں اور فنی کرتب بازی کی مذمت کی ہے کیونکہ فن معانی کی ترسیل اور بلند مقاصد کی تکمیل وترجمانی کا ذریعہ ہے صالح انسانی اقدار کی ترویج واشاعت کا جمالیاتی پیکر ہے اسلام ایک بلند نصب العین کا داعی اور ترجمان ہے اس لئے شاعری کو بلند انسانی اقدار، روحانیات واخلاقیات کی ترجمانی کا ایک حسین وخوبصورت اور مؤثر ذریعہ قرار دیتا ہے کیونکہ قرآن کریم انسانی زندگی کے لئے ایک آسمانی لائحہ عمل بنا کر اتارا گیا ہے اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں محاسن کو اختیار کرنے کی دعوت دی گئی چنانچہ شاعری کو بھی محاسن کا ترجمان قرار دیا گیا جو شاعر شراب وکباب فسق وفجور اور شرک وبت پرستی کی لعنت سے محفوظ ومامون ہو اور انسانی زندگی کی تعمیر وترقی صلاح وفلاح تحسین وتزئین کا داعی اور ایمان وعقیدہ کا علمبردار ہو وہ محمود ومستحسن ہوگا اور قرآنی تہدید وتنقید سے ماوراء اور مستثنیٰ بھی صرف اتنا ہی نہیں اگر اس کی شاعری ایمان وعقیدہ کی دعوت اور اللہ اور اس کے رسول کے دفاع کی ترجمان ہوگی تو یہی شاعری باعث اجر وثواب ہوگی اسلام صرف موضوع اور مضمون اور فکر کو صحیح رخ صحیح سمت دینے کا مطالبہ کرتا ہے ایمان وعقیدے کی شراب دو آتشہ سے جب شعر وشاعری کے خوبصورت وحسین پیمانے چھلک اٹھتے ہیں تو شاعری پیغمبری کا درجہ حاصل کر لیتی ہے اور روح القدس شاعر کے ہمنوا بن جاتے ہیں بقول غالب ؎

پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

روح القدس سے داد پانے کے لئے ہم زبانی کی ضرورت نہیں معانی کی بلندی

اور مضامین کی معراج حاصل کرنے کی ضرورت ہے، یہ معراج فن برائے فن کے سطحی نظریہ سے بلند ہو کر فن برائے تعمیر انسانیت کے بلند نظریہ کو اپنانے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ ہر شخص (شاعر) کے بس کا روگ نہیں شعری ذوق اور شعر گوئی کی فنی صلاحیت بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے اور بہت بڑی نعمت ہے اس صلاحیت سے ہر کس و ناکس کو نوازا بھی نہیں گیا قرآن کریم میں انسان کی چند خصوصیات گنائی گئیں ہیں اسی میں سے ایک خصوصیات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض نطق و گویائی کی نعمت ہی سے سرفراز نہیں کیا بلکہ نطق و گویائی کے ساتھ ساتھ علم بیان کی صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے سورۂ رحمٰن میں بہت وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے " **خلق الانسان و علمه البیان** " اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کا طریقہ بھی سکھلایا یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور خاص "البیان" کا لفظ ذکر کیا ہے شاعری کا تعلق علم بیان ہی سے ہے خود نبی کریم کو اللہ تعالیٰ نے قول بلیغ اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے "**وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولاً بلیغا**" آپ انھیں نصیحت کریں اور ان سے مؤثر انداز میں گفتگو کریں قول بلیغ بھی علم بیان ہی کی ایک قسم ہے نبی کریم کا ارشاد گرامی ہے "**ان اللّٰه تعالی جمیل ویحب الجمال ویحب معالی الا خلاق ویکره سفا سفها**" اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے اور بلند اخلاق کو پسند کرتا ہے اور فضول باتوں کو پسند نہیں فرماتا (الطبر انی) بلند اخلاقی تمام جمالیاتی قدروں کا منتہائے کمال ہے اسی لئے شاعری کو انھیں جمالیائی قدروں کا ترجمان بھی ہونا چاہیے کیونکہ شاعری خود قول جمیل بھی ہے اور قول بلیغ بھی بلکہ قول جمیل اور قول بلیغ کا حسین و خوبصورت امتزاج شاعری ہے۔ جمالیاتی قدروں ہی سے فن کا جمال وابستہ ہے اور یہی کمال فن بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے شاعری کو مطلقاً ناپسندیدہ قرار دینا محال ہے قرآن کریم نے بھی غیر صالح ہوس پرست شعراء کی تو مذمت فرمائی ہے لیکن مطلق شاعری کی مذمت کہیں نہیں

فرمائی اور خود نبی کریمؐ سے بھی شاعری کی مطلق مذمت ثابت نہیں ہے آپؐ نے جہاں کہیں بھی مذمت فرمائی شاعری میں غیر صالح عناصر کی مذمت فرمائی غیر صالح شعری عناصر تو فنی اعتبار سے بھی قابل مذمتی ہیں حضورؐ نے تو غیر مسلم جاہلی شعراء کے اچھے اشعار پسند فرمائے ہیں اور انھیں داد و تحسین سے نوازا ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس سے قبل گذر چکا ہے خلاصۂ کلام اور حاصل گفتگو یہ ہے کہ اسلام میں شاعری ناپسندیدہ عمل ہرگز نہیں ہے اسلام شاعری اور شعراء کی ہمت افزائی کرتا ہے بشرطیکہ شاعری اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عقائد سے متصادم نہ ہو اور انسانی معاشرہ کو تعمیر کے راستہ سے ہٹا کر تخریب پر آمادہ نہ کرے اور اعلیٰ جمالیاتی قدروں سے منحرف کر کے سفلیات و سطحیات کی طرف مائل نہ کرے خدا پرستی اور حق پرستی سے بہکا کر صنمیات اور شرکیات میں نہ مبتلا کرے صحیح ایمان و عقیدے کے ساتھ مثبت انسانی اقدار کی ترجمان فنی جمال و کمال سے آراستہ شاعری محبوب بھی اور محمود بھی اور مطلوب بھی حضورؐ کے اقوال و اعمال سے اس کی سند بھی دستیاب ہے لہٰذا کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی آپ خود تو شاعر نہیں تھے لیکن آپؐ نے اشعار سنے ہیں پسند بھی فرمائے ہیں شعراء کو داد و تحسین سے بھی نوازا ہے بلکہ انعام سے بھی سرفراز فرمایا اور صحابہ کو شعر گوئی پر آمادہ و متوجہ بھی فرمایا ہے اور آپؐ کی یہ تمام باتیں شعراء کے لئے اور فن شاعری کے لئے سرمایہ صد افتخار بھی ہیں اور فن شعر کے ارتقاء کی ضمانت بھی اور اسی سے شاعری کا چمن سرسبز و شاداب بھی ہے اور رنگین و پر بہار بھی آپؐ کی شعر و سخن کی قدردانی کے طفیل شاعری کی ساری بہار قائم ہے اور یہ آپؐ کے اعجاز سخن کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

اُردو شاعری پر اسلامی اثرات

آج سے ۱۵۰۰ سال قبل اسلام کا طلوع ساری نوع انسانی کے لئے ایک خوشگوار پیغام انقلاب تھا اور صدیاں گذر جانے کے بعد بھی یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ دین اسلام انسانی زندگی کے ہر گوشہ کو متاثر و منور کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے نبی اسلام حضرت محمد ﷺ نے زندگی کے ہر گوشہ کے لئے رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور اصول وضوابط مقرر فرمائے عبادات ومعاملات اور اخلاقیات وروحانیات سے الگ ہٹ کر خاص طور سے زبان وبیان کے مختلف اسالیب پر اسلام کا گہرا اثر پڑا اور دنیا کی ہر زبان کے ادب نے کسی نہ کسی اعتبار سے اسلام کا اثر ضرور قبول کیا اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے بھی، اور موضوع ومواد کے اعتبار سے بھی اسلامی تعلیمات کی اثر آفرینی کے علاوہ اس کی ایک تکنیکی وجہ یہ بھی ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک دنیا کے بڑے حصہ پر اسلامی سلطنت کا سورج جگمگاتا رہا اور اسلامی تہذیب وتمدن دنیا کی ترقی یافتہ تہذیب شمار کی جاتی رہی جس سے مختلف ممالک کے زبان وادب میں اسلامی تصورات وتعلیمات اور عقائد ونظریات کی ترویج واشاعت اور فروغ ترقی کے بڑے مواقع حاصل رہے اسلامی سلطنت کی فرمانروائی کی وجہ سے ادب میں اسلامی اثر ونفوذ کی راہیں ہموار ہوئیں اور اسلامی حکومت کی سرپرستی میں زبان وادب نے ترقی کے مراحل طے کئے اشاعت اسلام کے جذبے نے بھی اس میں بڑا اہم اور مرکزی کردار ادا کیا اور یہ جذبہ محض جذباتی رو نہیں تھی بلکہ نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے آخری خطبہ میں باقاعدہ

اس کا حکم فرمایا تھا کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ خدا کے اس پیغام کو بقیہ ساری دنیا کے انسانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری پوری کریں نبی کریمؐ کے الفاظ گرامی ہیں:

"الا فلیبلغ منکم الشاهد الغائب"

"ہر موجود شخص غائب شخص تک اس پیغام کو پہنچادے"

اس وقت موجود مجمع (صحابہ کرام) کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نفوس سے کیا گیا ہے جنھوں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور خدا کے آخری پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیا اس طرح نبی کریم کا یہ پیغام یہ حکم ساری دنیا کے انسانوں کے لئے اور ہر ملک وقوم کے لئے ایک پیغام انقلاب ثابت ہوا ساری دنیا میں اسلامی تصورات تعلیمات احکامات اور عقائد تہذیبی ومعاشرتی سطح پر اثر ونفوذ حاصل کرتے رہے اسلامی حکومتوں نے اس کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ اس کی عملی تطبیق اور تنفیذی سطح پر اہم کردار ادا کیا اس طرح اسلامی تعلیمات وعقائد اور اسلامی فکر دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب کا حصہ بنتی رہی مگر اسلامی تعلیمات تہذیب وتمدن اور اسلامی اثرات وتصورات سے عجمی زبانوں میں فارسی کے علاوہ جتنا فیض اردو زبان نے حاصل کیا شاید ہی کوئی دوسری زبان اس کی ہمسری کر سکے اس استفادہ وافادہ کی بھی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے ساڑھے آٹھ سو سال تک حکومت کی اور یہاں کی تہذیب وتمدن فنون لطیفہ مذہب وعقائد اور زبان وادب پر گہرے اثرات مرتب کئے اور اردو زبان تو بطور خاص ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ہی کی رہین منت ہے مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں اس نئی زبان کی تخلیق وترتیب تشکیل وارتقاء کا باعث بنی اس لئے قدرتی طور پر یہ زبان ان کے مذہب ان کی تہذیب وثقافت کی ترجمان بنی اس میں اسلامی اثرات کا پایا جانا اس زبان کا طبعی تقاضہ ہے، مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت کے جذبے کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر زبان کی ترویج واشاعت ہوتی رہی کیونکہ تبلیغ یا اصطلاحاً ابلاغ بغیر زبان کے

ممکن نہیں تھا چنانچہ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے زیر سایہ زبان کی تخلیق ترتیب تشکیل اور ترویج واشاعت کا عمل برابر جاری رہااور عوامی سطح پر اسی عمل نے اردو زبان کو ایک مقبول ومعروف زبان کا درجہ عطا کرنے میں اساسی کردار ادا کیا بنیادی طور پر اسلامی خیالات اسلامی تعلیمات اور اسلامی فکر کی ترجمانی کے لئے مقامی بولیوں کی مدد سے اردو کی لفظیات وجود کا قالب اختیار کرتی رہی اور اظہار کے اسلوب اپنی جگہ بناتے رہے اس طرح زبان کی تشکیل وارتقاء کا عمل جاری رہا کیونکہ خیالات اپنے اظہار کے لئے خود اپنا اسلوب تشکیل دیتے ہیں خصوصاً خیال جب کسی جذبہ کا ترجمان ہو تو بہت جلد اظہار کا قالب اختیار کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ تبلیغ کا جذبہ توسیع زبان کا بھی سبب بنا، روزمرہ کی ضروریات اور باہمی ارتباط واختلاط بھی زبان کی توسیع واشاعت کا ایک اہم ذریعہ ہے اور حکومتی ضروریات وتقاضے بھی اس زبان کی توسیع واشاعت کا سبب بنے بلکہ حکومت اس عوامی زبان کی سرپرستی پر مجبور ہوئی اور اس زبان کو قبول کر لیا اس طرح اردو کی تشکیل میں اسلامی عناصر بھی کارفرما رہے ہیں اگرچہ بعض محققین اور لسانیات کے بعض ماہرین اس سے انکار کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان نہ بھی آتے تو آریائی زبانوں کی باہمی شکست وریخت سے اردو زبان وجود پذیر ہو جاتی اگر چہ اس میں تاخیر ہوتی اور رفتار سست رہتی لیکن یہ خیال ایک ثابت شدہ حقیقت کے مقابلہ میں محض قیاس آرائی اور مفروضہ ہے اگر یوں ہوتا تو یوں ہوتا اور یوں ہوتا تو یوں ہوتا ......!! اگر مگر سے سامنے کی ثابت شدہ حقیقت کو جو صدیوں کے عمل اور ردعمل کے بعد وجود پذیر ہو چکی تھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ ثابت شدہ حقائق سے فرار اختیار کرنے والی مریضانہ ذہنیت ہے جس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے نہ اس پر کوئی دلائل فراہم کئے گئے ہیں۔

اردو زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے اثر ونفوذ کا اک خوشگوار نتیجہ ہے اس زبان کا آغاز بھی دیگر زبانوں کی طرح شاعری سے ہوا اور بابا فریدالدین گنج شکر جیسے برگزیدہ ولی نے اس کی بنیاد رکھی جن کا یہ شعر اردو شاعری کے اوّلین نمونہ کی حیثیت سے سبھی نے ذکر کیا ہے۔

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز درآں وقت کہ برکات ہے

شاعری بظاہر ایک مشکل صنف ادب ہے اور ہر شخص کے بس کی بات بھی نہیں لیکن اس کے باوجود دنیا کی بیشتر زبانوں کا آغاز شاعری سے ہوتا نظر آتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر شاعری کا ذوق رکھتا ہے اور کسی نہ کسی حد تک شعر ونغمہ انسانی فطرت کی صدائے بازگشت ہے شاید اسی لئے ان پڑھ سے ان پڑھ انسان بھی گنگنا تا ضرور ہے، ترنم سے متاثر ہوتا ہے وحشی سے وحشی قومیں بھی اپنا مخصوص راگ الاپتی رہتی ہیں بسا اوقات تو اس میں صرف سُر ہی سُر ہوتا ہے معنویت کچھ نہیں ہوتی ستار کے تاروں کی ہلکی سی لرزش آدمی پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہے شاعری میں یہی نغمگی اعلی سطح پر پائی جاتی ہے شاعری میں اثر آفرینی کی بے پناہ قوت ہے اور اسی قوت کی بنا پر شعرا کثر و بیشتر دماغوں میں محفوظ رہ جاتا ہے شاید اسی لئے غیر آسمانی مذاہب کی بیشتر تعلیمات شعری پیرایۂ اظہار میں ملتی ہیں منتر، مذہبی اشلوک اور بھجن کا پیرایۂ اظہار بھی شعری ہے شعری نغمگی وزن وقافیہ سے فائدہ اٹھا کر مذہبی رشیوں منیوں پنڈتوں اور صوفیاء اولیاء نے دینی و مذہبی حقائق عوام کے ذہن میں اتارنے کا کام لیا اور مذہبی حقائق عوام کے دل و دماغ میں جاگزیں کئے ہندو مذہب اپنی مختلف انواع واقسام کے ساتھ اور خصوصاً سکھ مذہب کی کتابیں عام طور پر شاعری سے مزین ہیں شاعری زمانۂ قدیم سے مذہبی حقائق وعقائد کی تبلیغ کا ایک عام ذریعہ اور وسیلہ رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ طبعی طور پر شعری ذوق اور اس سے اثر پذیری واثر آفرینی کا ملکہ قدرت خداوندی نے ہر انسان کو دیا ہے اسی کو اصطلاحاً وجدان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مولانا محمد رابع ندوی رقمطراز ہیں:

''ادب دراصل انسان کے وجدان سے بنتا ہے اور انسان کے وجدان کو متاثر کرتا ہے وجدان کی طاقت وصلاحیت اللہ تعالیٰ نے

تقریباً ہر انسان کو دی ہے خواہ وہ محقق و مفکر ہو خواہ جاہل و عامی اس کی وجہ سے ادب کا دائرہ کار بھی وسیع ہے۔"

(مولانا محمد رابع ندوی سہ ماہی صفا خصوصی شمارہ ادب اسلامی ۱۹۹۶ء)

فی الحال ہمیں اصناف ادب میں سے شاعری کا جائزہ لینا ہے اس لئے ہم اسی تک محدود رہیں گے دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان کا آغاز بھی شاعری سے ہوا رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

"دنیا کے تمام ادبوں کی ابتداء شاعری سے ہوئی شعر ایک زندہ قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پیشتر معلوم ہوتا ہے قافیہ پیمائی اور تک بندی انسان میں ایک فطری چیز ہے انسان کو پہلے جذبات کا حس ہوتا ہے پھر وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور سوچتا ہے اسی وجہ سے ارتقائے تہذیب انسانی میں شاعری جو مظہر جذبات ہے نثر پر مقدم ہے جو فکر دماغی کا نتیجہ ہے سب سے پہلے جب کہ فن تحریر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی شعر ہی اپنے زبردست اثر سے دماغ میں محفوظ رہ سکتے تھے اور قوت حافظہ کی مدد سے مجمع میں سنانے کے قابل بھی شعر ہی ہو سکتے تھے۔" (رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" ص ۱۶/۱۵)

نصیر الدین ہاشمی نے بھی اسی حقیقت کو بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا بہت دشوار ہے کہ پہلے کس زبان میں نظم کی ابتداء ہوئی لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جس قدر زبانیں عالم وجود میں آئیں ان میں اوّل نظم ہی کا رواج ہوا کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے اسی لئے قدیم زمانہ میں مذہبی کتابیں نظم ہی میں قلم بند ہوا کرتی تھیں سنسکرت میں عرفان حقیقی اور فلسفہ و حکمت کا اشراقی کام نظم کے ذریعہ ہی سے وابستہ تھا زمانہ جاہلیت میں جبکہ عرب میں

کتابت کا دستور نہ تھا سینکڑوں ہزاروں اشعار عرب یاد رکھتے تھے دنیا
میں عربوں کے سامنے کوئی قوم خلقی شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی''

(دکن میں اردو ص ۱۵)

ہندوستان میں اردو کا باقاعدہ مرتب آغاز بھی شاعری سے ہوا اور تمام ابتدائی شعراء صوفیاء و اولیاء اللہ ہی تھے جنھوں نے بندگان خدا کی رشد و ہدایت کی خاطر اپنی تعلیمات پیش کرنے لئے شاعری کا سہارا لیا کیونکہ یہی ایک مؤثر ذریعہ تھا جس کے ذریعہ عوام الناس کے دلوں میں رشد و ہدایت کا بیج بویا جاسکتا تھا چنانچہ صوفیاء نے اس کا خوب استعمال کیا اور اردو شاعری شروع ہی سے اسلامی تصورات و عقائد کی ترجمان بن گئی توحید، رسالت، دنیا کی بے ثباتی، جنت دوزخ آخرت مواخذہ اعمال، حشر، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اسلامی اخلاقیات و روحانیات عبادت الٰہی عشق خداوندی اور عشق رسولؐ، حمد باری اور نعت پیغمبر اردو شاعری کا موضوع قرار پائے اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ صوفیانہ طریقہ کار زاہدانہ تصورات یعنی حصول تقدس، ریاضت نفس، ترک ماسوا اللہ، فنا فی العبادات درجات سلوک اور اصطلاحات تصوف بڑی فراوانی کے ساتھ شعر کا قالب اختیار کرنے لگے اور یہی اُردو شاعری کا سب سے پہلا رجحان قرار پایا اردو شاعری صدیوں تک اسی کی ترجمان بنی رہی چونکہ یہ زبان کا ابتدائی دور تھا اس لئے ان خیالات کے اظہار کے لئے جو پیمانے بنائے گئے وہ زبان وادب کا جز بنتے رہے اور صوفیاء کی رہنمائی میں زبان تشکیل و ترقی کے مراحل طے کرتی رہی علماء لسانیات اور زبان وادب کے ماہرین نے اردو زبان کا جو ابتدائی سرمایہ تلاش و تحقیق کے بعد دریافت کیا ہے وہ صوفیانہ ملفوظات اور صوفیانہ شاعری پر ہی مشتمل ہے اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری شروع ہی سے اسلامی اثرات کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے زبان کی تشکیل و ترتیب میں دیگر عناصر کی شرکت و اہمیت اور ان کے کردار سے انکار نہ مقصود ہے

اور نہ ممکن نہ ہمیں اس پر اصرار ہے بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اردو زبان کا آغاز مسلمانوں کی آمد سے ہوا اور صوفیانہ شاعری سے ہوا اس لئے اردو کے ہندوستانی الاصل اور آریائی النسب ہونے کے باجود اردو زبان اور بطور خاص اردو شاعری میں اسلامی اثرات اور اسلامی عناصر کا غالب حصہ ہے اردو شاعری میں موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہی اسلامی اثرات غالب نہیں ہیں بلکہ عربی اور فارسی کے حوالہ سے الفاظ وتعبیرات کا بھی بڑا ذخیرہ جو اردو شاعری میں منتقل ہوا اسلامی اثرات کا غماز ہے اردو شاعری نے ابتدائی طور پر فارسی کا تتبع کیا یہ وقت کا ایک عموی تقاضہ اور ادبی ضرورت بھی تھی اس تتبع کے نتیجے میں فارسی شاعری کی اکثر قدریں الفاظ تعبیرات تشبیہات استعارات کنایات تخیلات تلمیحات کے علاوہ شعری اوزان و بحور حتی کہ قواعد وغیرہ بھی اردو میں منتقل ہو گئے فارسی شاعری مکمل طور پر اسلامی اقدار اور روایات کی حامل تھی چنانچہ یہی سرمایہ ہیئات و موضوعات کے ساتھ اردو میں بھی منتقل ہوا اردو شاعری اس سے متاثر رہی اور اس کو بعینہ قبول بھی کر لیا حمد و نعت رباعیات و مرثیہ کی روایات نیز تصوف جو فارسی شاعری کا جزو غالب تھا اردو شاعری کے لئے بھی سرمایۂ فن ثابت ہوا مجموعی طور پر اسلام نے تشکیل فن کے لئے جو حدود و قیود قائم کی تھیں اور جو معیار و اقدار مقرر کئے تھے وہ آفاقی تھے کسی مخصوص زبان یا مخصوص زمان ومکان کے لئے نہیں تھے چنانچہ مسلم ادباء شعراء اور فنکاروں نے ان کی رعایت ملحوظ خاطر رکھی اور جہاں جہاں دنیا میں مسلمان پہنچے فن کی تشکیل میں انہیں معیار و اقدار کو باقی رکھا اس کا سلسلہ ایران سے شروع ہوا تھا اور اسلامی تاریخ کے پہلو بہ پہلو اسلامی تہذیب وتمدن اور شعر و ادب کا اسلامی معیار مسلم سلاطین و فاتحین کے ساتھ ساتھ ہندوستان پہنچا، ہندوستان کو یہ خصوصیت مزید حاصل ہوئی کہ سلاطین و امراء کے علاوہ اہل اللہ اور صوفیاء و بزرگان دین نے ہندوستان پر خصوصی توجہ فرمائی یہ علاقہ روحانیات کے لئے مشہور معروف تھا لہذا صوفیاء بطور خاص اس طرف متوجہ ہوئے اور مختلف اوقات میں مختلف

مقامات پر وارد ہوئے بسا اوقات صوفیاء واولیا نے سلاطین پر سبقت حاصل کی اور اہل ہند کے دل ودماغ کو اپنی تعلیمات اخلاق اور سیرت وکردار سے فتح کرلیا اہل ہند بھی اولیاء صوفیاء کی طرف اور ان کی تعلیمات کی طرف زیادہ راغب ہوئے کیونکہ ہندوستان میں عوام ہندو مذہب کی طبقاتی کشمکش عدم مساوات ذات پات کی تفریق اور برہمنی جبر واستحصال کا شکار تھے اس لئے انھیں اسلامی مساوات اخلاقیات روحانیت اور صداقت نے بہت جلد متاثر کیا ان کے لئے طبقاتی نظام کے مقابلہ میں یہ ایک پرکشش تجربہ ثابت ہوا اور وہ اس کی طرف راغب ہو گئے اس میں اہل اللہ کے جذبۂ تبلیغِ حق اور خلوص وللہیت کا بھی بڑا دخل تھا اور بھی کئی معاشرتی وسیاسی اسباب وعوامل تھے جنھوں نے برادران وطن کو اسلامی قدروں کی طرف مائل کیا اس کا جائزہ لیتے ہوئے ''ڈاکٹر تاراچند اپنی مشہور کتاب ''اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر'' میں لکھتے ہیں:

''نویں صدی کے ابھی زیادہ برس نہیں گذرے تھے کہ وہ (مسلمان) ہندوستان کے سارے مغربی ساحل پر پھیل چکے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مخصوص عقائد اور طریق عبادت کی وجہ سے نیز جس جوش کے ساتھ وہ اس کا ادعا کرتے تھے اور جس طرح اس کی وکالت کرتے تھے اس سے ہندو آبادی میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔

اس وقت جنوبی ہندوستان میں مذاہب کی کشمکش سے بڑا ہیجان تھا اس لئے کہ جدید ہندو مذہب اپنی بالادستی کے لئے بدھسٹوں اور جینیوں کے مقابلہ کی پوری جدوجہد کر رہا تھا سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور تغیرات اور انتشار کا تھا چیراون کی قوت گھٹ رہی تھی اور نئے نئے حکمراں خاندان قوت حاصل کر رہے تھے قدرتاً لوگوں کے دماغ پریشان تھے اور وہ نئے خیالات قبول کرنے پر خواہ وہ کہیں سے آئے

ہوں آمادہ تھے اسلام ایمان کے ایک سادے سے اصول معین و مرتب
عقائد ورسوم اور سماجی نظام کے جمہوری نظریات کے ساتھ منظر عام پر
آیا اس سے مقامی فضا پورے طور پر متاثر ہوئی۔"

(ڈاکٹر تاراچند "اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر" ص ۶۴)

دوسری جگہ اسی حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں ملتا ہے:

"ہندوستان میں جو مسلمان آئے انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن
بنالیا وہ چاروں طرف ہندوؤں سے گھرے ہوئے تھے جن سے مسلسل
عناد کی حالت ممکن نہ تھی باہمی میل جول سے باہمی سمجھوتے کی راہ نکلی
بہت سے لوگ جنھوں نے اپنا مذہب بدلا تھا وہ ان لوگوں سے بہت
کم مختلف تھے جنھیں انھوں نے چھوڑا تھا اس طرح فتح سے جو پہلا دھکا
لگ چکا تھا اس کا اثر کم ہونے پر ہندو اور مسلمان ایک بیچ کی راہ نکالنے
پر آمادہ ہو گئے جس سے وہ آپس میں پڑوسیوں کی طرح رہ سکیں ایک نئی
زندگی کی تلاش کی کوشش نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو نہ تو خالص
ہندو تھی نہ خالص مسلم یقیناً یہ ایک ہندو مسلم تہذیب تھی نہ صرف ہندو
مذہب ہندو آرٹ ہندو لٹریچر اور ہندو سائنس نے مسلم عناصر کو جذب
کیا بلکہ خود ہندو تمدن کی روح اور ہندو ذہن میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور
مسلمانوں نے بھی جواباً ہر شعبہ زندگی میں تبدیلی پیدا کی"

(ڈاکٹر تاراچند "اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر" ص ۱۷۳)

سرزمین ہند پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اشتراک، اختلاط اور ارتباط کے
نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والی نئی تہذیب اپنی ترجمانی کے لئے خود ایک نئی زبان بھی تشکیل
دے رہی تھی اور پرانی زبانوں کا سحر ٹوٹ رہا تھا ڈاکٹر تاراچند نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے وہ

ہوں آمادہ تھے اسلام ایمان کے ایک سادے سے اصول معین و مرتب عقائد و رسوم اور سماجی نظام کے جمہوری نظریات کے ساتھ منظر عام پر آیا اس سے مقامی فضا پورے طور پر متاثر ہوئی۔''

(ڈاکٹر تاراچند''اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر''ص ۶۴)

دوسری جگہ اسی حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں ملتا ہے:

''ہندوستان میں جو مسلمان آئے انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنالیا وہ چاروں طرف ہندوؤں سے گھرے ہوئے تھے جن سے مسلسل عناد کی حالت ممکن نہ تھی باہمی میل جول سے باہمی سمجھوتے کی راہ نکلی بہت سے لوگ جنھوں نے اپنا مذہب بدلا تھا وہ ان لوگوں سے بہت کم مختلف تھے جنھیں انھوں نے چھوڑا تھا اس طرح فتح سے جو پہلا دھکا لگ چکا تھا اس کا اثر کم ہونے پر ہندو اور مسلمان ایک بیچ کی راہ نکالنے پر آمادہ ہوگئے جس سے وہ آپس میں پڑوسیوں کی طرح رہ سکیں ایک نئی زندگی کی تلاش کی کوشش نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو نہ تو خالص ہندو تھی نہ خالص مسلم یقیناً یہ ایک ہندو مسلم تہذیب تھی نہ صرف ہندو مذہب ہندو آرٹ ہندو لٹریچر اور ہندو سائنس نے مسلم عناصر کو جذب کیا بلکہ خود ہندو تمدن کی روح اور ہندو ذہن میں تبدیلی پیدا ہوگئی اور مسلمانوں نے بھی جواباً ہر شعبہ زندگی میں تبدیلی پیدا کی''

(ڈاکٹر تاراچند''اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر''ص ۱۷۳)

سرزمین ہند پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اشتراک، اختلاط اور ارتباط کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والی نئی تہذیب اپنی ترجمانی کے لئے خود ایک نئی زبان بھی تشکیل دے رہی تھی اور پرانی زبانوں کا سحر ٹوٹ رہا تھا ڈاکٹر تاراچند نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے وہ

لکھتے ہیں:

جہاں تک لٹریچر کا تعلق ہے اب سنسکرت لوگوں کی اہم ترین ضروریات کا وسیلہ نہیں رہ گئی تھی خیالات اظہار خیال کا نیا اسلوب بناتے ہیں شمال میں ہندی مغرب میں مرہٹی اور مشرق میں بنگالی ترقی کر کے ادبی زبانیں بن گئی تھیں اور ہندو مسلمان دونوں اس کامیابی کے افتخار میں شریک ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ اب ایک نیا لسانی امتزاج معرض وجود میں آتا ہے مسلمان اپنی ترکی اور فارسی کو چھوڑ کر ہندو کی زبان اختیار کرتا ہے اور فن تعمیر اور مصوری کی طرح اسے اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالتا ہے اور اس طرح اظہار خیال کا ایک نیا ادبی وسیلہ یعنی اُردو وجود میں آتا ہے۔''

(تاراچند ڈاکٹر ''اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر'' ص ۱۷۵/۱۷۶)

مسلمانوں کی آمد اور ان کے اثرات سے مقامی سطح پر جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی تھیں اور سرزمین ہند پر جو نئی قدریں رونما ہو رہی تھیں ان کا جائزہ لیتے ہوئے مشہور اسلامی مفکر و ادیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

''ہندوستان میں اسلامی عقائد اور تعلیمات کے فیض، تصوف کے پیدا کئے ہوئے درد و محبت اور وسعت نظر، ہندوستان کے خمیر کی آشنا پرستی اور وفا شعاری، رنگ و آہنگ سے اثر پذیری، ترکوں کی مہم جوئی و سپہ گری افغانوں کی شجاعت و شہامت، مغلوں کے ذوق جمال و قوت ارادی، عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوزِ دروں، سب سے مل کر ایک خاص تہذیب اور ایک خاص ثقافت وجود میں آئی جس کا نمونہ طبقہ امراء میں عبدالرحیم خانخاں شعراء میں امیر خسرو،

اہل دل میں خواجہ نظام الدین اولیاء اور علماء میں مولانا غلام علی بلگرامی نظر آتے ہیں اس تہذیب وثقافت میں شکوہ بھی ہے تو اضع بھی حلاوت بھی ہے اور مروت بھی گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے اور رقت بھی استقامت بھی ہے اور رواداری بھی اس کی قلم رو میں علوم شریعت وحکمت بھی ہیں اور ادب وشاعری بھی فقر ودرویشی بھی ہے اور نفاست وذوق لطیف بھی اس کے دلچسپی کے میدان قلعے بھی ہیں اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں اور خانقاہیں بھی تحقیق وتصنیف کے حلقے بھی ہیں اور مشاعرے بھی، اس میں ثقاہت بھی ہے اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے اور سبک روی بھی، اس کے اظہار خیال اور اظہار کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے اور فارسی بھی اردو بھی ہے اور ہندی بھی، یہ وہ تہذیب وثقافت ہے جس نے فاتحین اسلام کے داخلۂ ہند کے بعد سے اپنا کام شروع کیا پھر شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی یہ وہ ہندوستانی تہذیب وثقافت ہے جو نہ خالص ہندوستانی ہے نہ خالص ایرانی، نہ عربی ہے نہ عجمی بلکہ ان سب کے محاسن کا مجموعہ اور تہذیب وتمدن کے میدان میں ایک نیا تجربہ۔" (پرانے چراغ ص ۳۳)

اسی نئے تجربے کے نتیجہ میں جو نئی زبان اور نیا ادب وجود میں آرہا تھا وہ انھیں مختلف ومشترک عناصر کا مرکب تھا جن کا ذکر مذکورہ بالا اقتباس میں کیا گیا ہے ان تمام عناصر کی مشترکہ خصوصیات کا سب سے دلکش اظہار اس نئی زبان کی شاعری میں ہورہا تھا۔

اردو شاعری میں یہ اظہار ابتداءً مثنوی کی صنف میں منظر عام پر آیا اردو شاعری کے ابتدائی عہد میں جبکہ اردو زبان کی شکل بھی صاف نہیں تھی مثنویات بڑی کثرت سے

منظر عام پر آئیں مثنوی کی صنف کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی شعر گوئی کے لئے بھی اور شعر فہمی کے لئے بھی عوامی سطح پر مثنوی ایک مقبول صنف سخن بن گئی جس میں شعراء نے کسی واقعہ اور قصہ کو موضوع بنا کر حمد نعمت عشق رسول عبادت الٰہی کے مضامین اور اسلامی عناصر کو دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا تجربہ کیا اور بعض شعراء نے براہ راست تصوف اور اسلام کے حقائق وعقائد کی ترجمانی کے لئے ہی اس صنف سخن کو اختیار کیا چنانچہ اردو شاعری کے ابتدائی دور کی مثنویات کی ایک طویل فہرست ہے جو سلامی حقائق اسلامی فکر اور رموز تصوف وسلوک کی آئینہ دار ہے ابتدائی دور کی مثنویوں اور طویل نظموں میں خزائن رحمتہ اللہ، جواہر اسرار اللہ، خوب ترنگ، سکھ سہیلا، من سمجھاون، نوسر ہار، بشارت الذکر، رموز الواصلین، رموز السالکین، معراج نامہ نور نامہ اور گجرات کی جکریوں (ذکر رسول وخدا پر مبنی نظمیں) کا طویل درخشاں سلسلہ ہے جن کا تفصیلی تعارف و تجزیہ ایک مستقل موضوع ہے اس قسم کی تفصیلی نظموں کا عمومی موضوع ومزاج اسلام اور اسلامی تعلیمات وعقائد ہی ہیں ان عقائد کی تعبیر وتشریح اور تفصیل و بیان کے لئے خیال کے جو پیکر تراشے گئے اور اظہار کے لئے جو لفظیات عمل میں آئی اور ابلاغ کے جو اسلوب اپنائے گئے وہ اردو شاعری کا اساسی سرمایہ ثابت ہوئے جس پر اردو شاعری کی عمارت تعمیر کی گئی مثنوی کے علاوہ مرثیہ بھی خالص اسلامی موضوعات کا ترجمان ہے اور اسلامی صنف سخن ہے مراثی اگر چہ اسلام سے قبل بھی کہے جاتے تھے اور مستقل صنف سخن میں ان کا شمار تھا خصوصاً عربی شاعری میں یہ ایک معروف صنف سخن تھی لیکن سیاسی اور خاندانی پس منظر کے ساتھ وابستہ تھی اسلام کی آمد کے بعد اس کے موضوع ومواد میں تبدیلی واقع ہوئی اور ہندوستان آکر تو یہ مکمل اسلامی صنف بلکہ مذہبی صنف سخن بن گئی اور اپنے موضوع ومواد کے اعتبار سے سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی مظلومانہ شہادت کے واقعہ کی ترجمان بن گئی، سید الشہداء حضرت امام حسینؓ اور اہل بیت اطہار سے وابستہ ہو کر ایک قسم کا تقدس

حاصل کرلیا مرثیہ کا مطلب ہی اہل بیت کے مصائب کی ترجمانی اور واقعات کربلا کا بیان ہوگیا اس صنف سخن کو بھی یہاں ہندوستان کی سرزمین پر خاصی پذیرائی حاصل ہوئی عوامی سطح پر بھی اور خواص اور اہل علم کی سطح پر بھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عراق وایران اور نجد وحجاز سے وابستہ ہونے کے باوجود مرثیہ ہندوستان پہنچ کر خالص ہندوستانی ہوگیا اس کی محاکات ماحول تشبیہات استعارات طرز اور اسلوب سب کچھ بالکل بدل گیا اور اہل بیت کا خالص عربی وحجازی خاندان ایک ہندوستانی خاندان میں تبدیل ہوگیا چنانچہ مرثیہ کا طرز اظہار اور انداز غم وماتم اور نالہ وشیون مشرقی ہی نہیں خالص ہندوستانی ہوگیا مولانا حالی نے بھی اس پر تنقید کی ہے اور پرفیسر ہارون الرشید لکھتے ہیں:

> ''مرثیہ میں اہل بیت کی جو معاشرت پیش کی گئی ہے وہ تقریباً تمام تر لکھنؤ کی معاشرت ہے جس میں بہت سی باتیں غیر اسلامی ہیں مثلاً شادی بیاہ اور موت وحیات کی رسمیں، ملنے جلنے کے آداب انداز گفتگو وغیرہ تقریباً سب کے سب لکھنوی یا ہندوستانی معاشرے کے ترجمان ہیں۔'' (پروفیسر ہارون الرشید ''اردوادب اور اسلام'' ص۱۸۳)

اردو شاعری کے ابتدائی دور میں یہ صنف سخن بھی خاصی مقبول رہی یہ خالص مذہبی صنف سخن ہے جو مسلمانوں کے ذریعہ اردو شاعری میں متعارف ہوئی اور خوب ترقی کی اور یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اردو مرثیہ نے عربی اور فارسی شاعری کو بہت پیچھے چھوڑ دیا مولانا حالی نے اس کی شہادت دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہمارے نزدیک نہ صرف اردو بلکہ فارسی وعربی شاعری میں بھی ایسی نظمیں مشکل سے ملیں گی۔'' (علامہ حالی ''مقدمہ شعروشاعری'')

اُردو مرثیہ نے اسلامی اخلاق وکردار، صبر وشکر ہمت واستقلال، استقامت وعزیمت شجاعت وبہادری عزم وارادے دینی حمیت ووفاداری حق کی خاطر جاں نثاری

وفدائیت کے جذبات کو اردو شاعری میں لازوال و بے مثال بنا دیا امام حسین کا کردار ظلم و جبر کے خلاف ایک علامت ایک تلمیح ایک استعارہ بن کر اُبھرا اور اردو شاعری کو مالا مال کر گیا آج بھی یہ ظلم واستبداد کے خلاف عدل وانصاف کی علامت اور باطل کے خلاف حق کی جدوجہد کا روشن استعارہ ہے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سانحۂ کربلا کا بطور شعری استعارہ جائزہ لیا ہے اور اردو شاعری کے ایک تخلیقی رجحان کے طور پر اس کو پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف کا خیال ہے کہ موجودہ عہد میں نئے معنیاتی تقاضوں کے تحت شہادت حسین کا تاریخی حوالہ رسمی رثائی ادب سے ہٹ کر عام اردو شاعری میں بھی پرورش پا رہا ہے اور پچھلی تین چار دہائیوں سے ایک نئے اظہاری اور شعری رجحان کی صورت اختیار کر رہا ہے جو اپنی جگہ بے حد اہمیت ومعنویت کا حامل ہے''
>
> (پروفیسر گوپی چند نارنگ ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ'' ص ۲۳)

مراثی کے علاوہ بھی اردو شاعری کی مختلف اصناف سخن میں اسلامی فکر کی نمائندگی ملتی ہے پوری اردو شاعری میں اسلام اور اسلامی فکر کے حوالے سے جتنی طویل نظمیں ملتی ہیں یقیناً کسی دوسرے حوالے سے نہیں مل سکتیں یہ تسلسل تا حال برقرار ہے علامہ الطاف حسین حالؔی کی مدوجزر اسلام علامہ اقبال کی بے شمار نظمیں حفیظؔ جالندھری کا شاہکار شاہنامہ اسلام مولانا عامرؔ عثمانی کا جدید شاہنامہ اسلام کے علاوہ دور حاضر کے نمائندہ شاعر اعجاز رحمانی منظوم تاریخ اسلام مرتب کر رہے ہیں چار ہزار سے زائد اشعار ہو چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے ع-س مسلم نے جو سفر نامۂ حج مرتب کیا ہے اس میں چھ سو کے قریب اسلامی تاریخی حوالے منظوم شکل میں ان کی سعی بلیغ کا شاہکار ہیں یہ تو صرف حوالوں کی تعداد ہے جنھیں شاعر نے نمبر شمار کے ذریعہ واضح کیا ہے اور ان سب حوالوں کے مراجع کا

ذکر بھی حاشیہ میں موجود ہے اشعار کی تعداد تو اس سے کئی گنا زیادہ ہے قیصر الجعفری اور عنبر بہرائچی کی منظوم سیرت بھی اردو شاعری کا شاہکار ہے اس کے علاوہ قرآن کریم کی مختلف سورتوں کے منظوم تراجم حمد باری نعت نبویؐ، مدح صحابہ اور منقبت صحابہ کرام اور صلوۃ وسلام کے مجموعے اردو شاعری پر اسلامی اثرات کا شاہکار ہیں اور ہزاروں ہزار اشعار اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں کہ اردو شاعری اسلامی تعلیمات اسلامی فکر اور اسلامی نظریۂ حیات کی ترجمان رہی ہے اور اردو شاعری کی مختلف اصناف سخن میں یہ سلسلہ جاری ہے غزل کے بے شمار اشعار کا موضوع خیال اور مضمون اسلام اور اسلامی تعلیمات ہیں اور ہر دور کی غزل میں اس کا اثر محسوس کیا جاسکتا ہے جدید سے جدید فارم اور جدید ترین ہیئات میں اس موضوع کو خوبصورت انداز میں برتا جارہا ہے، اردو شاعری کا کوئی دور ہو قدیم یا جدید، جدیدیت یا مابعد جدیدیت اسلامی اثرات سے خالی اور بے نیاز نہیں بلکہ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ اردو شاعری از ابتدا تا ایندم اسلامی تعلیمات اسلامی عقائد اور اسلامی نظریۂ حیات کی ترجمان بھی ہے اور اسلامی نظام فکر سے زیر بار احسان بھی کیونکہ اسلام محض مجموعہ عبادت نہیں بلکہ مستقل اور مکمل نظام حیات بھی ہے تعمیر آدمیت اور فلاح انسانیت کی آفاقی قدروں کا علمبردار بھی اور یہی آفاقی قدریں، اعلیٰ اور بڑی شاعری کی بنیاد ہیں رندی ہوس پرستی شہوانیت تعیش، موقع پرستی اور آرائش خم کاکل کی شاعری آفاقی نہیں ساعاتی اور لمحاتی ہوتی ہے حقیقی اور کامیاب شاعری وہی ہے جو انسان کو ذلت وپستی سے نکال کر عروج وبلندی کی طرف مائل پرواز ہونے کی ہمت وحوصلہ عطا کرے ایسی ہی شاعری کو بقاء دوام حاصل ہوتا ہے بقاء دوام ذہنی جمناسٹک اور لفظوں کی بازی گری کا رہین منت نہیں موضوع اور مضمون کی بلاغت کا منت کش ہوتا ہے اسلام موضوع اور مضمون کی افادیت اور مقصدیت کا قائل ہے اور شاعری اس کا سب سے لطیف اور سب سے جمیل پیرایۂ اظہار ہے اسلام نے اس کی ہمت افزائی کی ہے اور یہ فیضان ہے

نبی کریم ﷺ کا جنھوں نے شاعری کو شجر ممنوع نہیں قرار دیا بلکہ اس کی صالح قدروں کی ہمت افزائی فرمائی شعراء کو داد و تحسین سے نواز اور انعام و کرام سے سرفراز فرمایا اور انھیں اپنے فن کو صالح تعمیری افکار و خیالات اور فلاحِ انسانیت کی آفاقی قدروں کی ترویج و اشاعت کے لئے استعمال کرنے کا حکم فرمایا اور فن برائے فن کے مقابلہ میں فن برائے تعمیر انسانیت کا نظریہ پیش کیا اور شاعری کا غالب حصہ اسی فیضان نبوت سے روشن ہے۔

اردو شاعری پر اسلامی اثرات کے مزید جائزے کے لئے آئندہ بحث "اردو شاعری میں اسلامی لفظیات" بھی ملاحظہ فرمایئے جو اسی موضوع کا تسلسل ہے۔

اُردو شاعری میں اسلامی لفظیات

حرف صوت کی علامت ہے جب صوت با معنی ہو جاتی ہے تو حروف کے مجموعے سے لفظ بنتا ہے اس طرح مختلف حروف کا وہ مجموعہ جو کوئی متعین معنی دے لفظ کہلاتا ہے اسی پر کلام کی بنیاد ہے اور یہی زبان کی اساس ہے مختلف لفظوں کے مفید مطلب مجموعے کو کلام کہا جاتا ہے اس طرح مفہوم کی ادائیگی اور معانی کی ترسیل لفظ کا بنیادی وظیفہ ہے۔

الفاظ اپنے انفرادی وجود کے اعتبار سے مجرد معانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں فی نفسہ لفظوں کا کوئی مسلک و مذہب نہیں ہوتا بظاہر لفظوں کو اسلامی اور غیر اسلامی خانوں میں تقسیم کرنا شاید صحیح نہ ہو لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ مختلف معانی کی ادئیگی کے لئے الفاظ کی تخلیق، ان کی تشکیل و ترتیب ان کی تراش خراش اور معانی کی تعیین میں مذہب نہ صرف ایک مؤثر عامل ہے بلکہ مذہب کا اہم اور بنیادی کردار ہے ہر لفظ کسی نہ کسی تہذیب کا پروردہ ہوتا ہے اور اپنی تہذیب کا نمائندہ بھی۔یہی وجہ ہے کہ ایک ہی معنی کی ادئیگی کے لئے مختلف مذاہب کے پس منظر میں الگ الگ الفاظ ملتے ہیں یہ لفظوں کی تخلیق میں مذاہب کے عمل دخل کا واضح اشارہ ہے ہر مذہب کے ماننے والوں کی اپنی مخصوص لفظیات ہوتی ہے جو زبان وادب میں معروف اور رائج ہو جاتی ہے اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں دعا، پرارتھنا، عبادت، پوجا، سلام، نمسکار، آداب، نمستے وغیرہ، محل استعمال اور معانی کی یکسانیت کے باجود الفاظ کا اختلاف

صرف مذہب کا اختلاف نہیں رہ جاتا بلکہ وسیع معانی میں یہ تہذیب وتمدن کا اختلاف بن جاتا ہے کیونکہ اکثر مذہب ہی سے تہذیب وجود میں آتی ہے ہم جہاں آپس میں ملاقات کے وقت ایک دوسرے کے لئے سلامتی کی دعا کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہیں یا آداب وتسلیمات بجالاتے ہیں وہاں سکھ ''ست سری اکال'' کا نعرہ لگاتے ہیں اور ہندو نمستے اور نمسکار کی پھوار برساتے ہیں یہ الفاظ کی تخلیق میں مذہب کے عمل دخل کا بہت واضح اظہار ہے مختلف قوموں کے درمیان استعمال ہونے والے لفظوں میں مذہبی تصورات کی جھلک اور عقائد کی چھاپ دراصل ان کے معانی کی تعیین کا واحد ذریعہ ہے ہم لفظ کو ہندو، مسلم، سکھ عیسائی کہیں یا نہ کہیں لیکن لفظ بذاتہ اپنے معانی کے اظہار کے لئے ان عقائد کا رہین منت ضرور ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ زبان انسان کے احساسات اور شعور وفکر کی ترجمان ہوتی ہے لفظوں کے ذریعہ جس کا اظہار ہوتا ہے مولانا محمد رابع ندوی رقمطراز ہیں۔

> ''ہر انسان کی زبان اس کی زندگی کے تقاضوں اور محسوسات کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہے اور اس کی زندگی کے تقاضے اور محسوسات اس کے ثقافتی اور مذہبی پہلوؤں سے بھی گہرا ربط رکھتے ہیں اس طرح کسی بھی قوم کی زبان اس قوم کی ثقافت اور مذہب کی بھی آئینہ دار بن جاتی ہے، انسانی زندگی کے یہ دونوں پہلو یعنی مذہب اور ثقافت انسانی زندگی سے اس طرح جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان سے علیحدہ نہیں کئے جاسکتے یہ کمزور پڑ سکتے ہیں لیکن ختم نہیں ہوتے ثقافتی پہلو اپنی مختلف اور متنوع شکلوں میں ہر قوم وملک میں عیاں ملتا ہے اور مذہبی پہلو کو دیکھا جائے تو وہ بھی ہر قوم وملک کے افراد کی زندگی میں ملے گا دین دار تو دین دار ہے وہ ملحد شخص کے یہاں بھی مل جاتا

ہے ملحد کے یہاں وہ اس کے اس ذہنی وقلبی تر دد میں ملتا ہے، جو مذہب
کے انکار سے پیدا ہونے والے خلا کے احساس کو دبانے کی شکل میں
ظاہر ہوتا ہے............

بہر حال ثقافت اور مذہب کے اثرات کسی قوم میں جس طرح کے اور
جس مقدار میں بھی ہوں اس قوم کی زبان کی تعبیر وطرز ادا میں جھلکتے
اور نمایاں ہوتے ہیں بلکہ زبان کے متعدد الفاظ اور محاورے اوّل اوّل
ثقافت اور مذہب کے مطالب ظاہر کرنے کے لئے ہی وضع ہوتے
ہیں پھر وہ عام استعمال میں دیگر مطالب کے لئے بھی رائج ہو جاتے
ہیں اور اس طرح بھی زبان کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ۔

(زبان وادب کا تعلق ومذہب سے رمولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کاروان ادب جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

لفظوں کی تخلیق میں مذہب کے عمل دخل سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی لئے
الفاظ کی تعیین وتقسیم مذہب کے اعتبار سے بھی کی جا سکتی ہے لہٰذا وہ تمام الفاظ جو اپنی
اصل کے اعتبار سے قرآن وحدیث یا اسلامی تعلیمات وعقائد کے مظہر یا ترجمان ہوں
اسلامی لفظیات کے دائرے میں شامل ہوں گے مرکب جملوں یا تعبیرات وتراکیب
اور محل استعمال کے ذریعہ مذہبی معانی ومفاہیم کی ادائیگی تو بالقصد وارادہ مطلوبہ مذہبی
معانی تک رسائی حاصل کرنا ہے، ہم تو مجرد ومفرد لفظ کی بات کر رہے ہیں کہ مجرد لفظ بھی
مخصوص مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ ایسے الفاظ اپنا پورا مذہبی پس منظر اور مذہبی
تاریخ رکھتے ہیں اسی مذہبی پس منظر کی وجہ سے ہی ان کے معانی کی تعیین ہوتی ہے کیونکہ
اس مخصوص مذہبی پس منظر کو سلب کر لینے سے یا غائب کر دینے سے لفظ بھی اپنی حقیقت
ومعنویت کھو بیٹھتا ہے مثلاً دعا، عبادت، اور خدا کے لفظ سے اسلامی تصور غائب کر دیا
جائے تو یہ پرارتھنا پوجا اور ایشور تو رہ جائے گا دعا عبادت اور خدا کے جو مخصوص مفاہیم

ومعانی ہیں وہ ختم ہو جائیں گے اسی طرح فرشتے، رسول، وحی، حشر، جہاد، شہادت، رسالت، وغیرہ ہیں یہ اپنا ایک مخصوص اسلامی تاثر وتصور رکھتے ہیں ان کو اس مخصوص پس منظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا خواہ کیسے ہی استعاراتی معانی تراش لئے جائیں بلکہ خود استعاراتی معانی کی گنجائش بھی ان کے مخصوص مزاج وماحول ہی کی رہین منت ہوگی یہ استعاراتی معانی بھی خواہ مثبت ہوں یا منفی دونوں صورتوں میں معانی کی تعیین کے لئے ان لفظوں کے مخصوص مذہبی وتہذیبی پس منظر سے استفادہ ضروری ہے پروفیسر وحید الدین سلیم نے بھی اس کی صراحت کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"اردو زبان میں مسلمانوں کی تاریخ مذہب اور رسم ورواج کے متعلق الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔" (افادات سلیم)

نثر کے مقابلے میں شاعری میں لفظوں کے انتخاب کا معاملہ ذرا نازک اور محدود ہوتا ہے الفاظ خیال کی ادائیگی کا ذریعہ اور معانی کے اظہار کا وسیلہ ہیں اس لئے شعر ونثر دونوں میں لفظوں کے صحیح انتخاب کی بڑی اہمیت ہے بہتر سے بہتر خیال لفظوں کے غلط یا کمزور انتخاب سے بے کیف وبے اثر ہو جاتا ہے اور دقیق سے دقیق معانی کے لئے لفظوں کا صحیح انتخاب واستعمال ہی اصل بنیاد ہے یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے مجرد لفظ ادب سے وابستہ ہو کر اثر آفرینی کا جادو جگاتا ہے ادبیات کی جملہ اصناف، خیال وفکر کی ادائیگی کے لئے لفظوں کی رہین منت ہو جاتی ہیں، لفظوں کی مذکورہ خصوصیات اور مخصوص پس منظر کی وجہ سے ہم نے اردو شاعری میں اسلامی لفظیات کی شناخت اور نشاندہی کی کوشش کی ہے ہمارا موضوع اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات ہے اور خود اسلامی تلمیحات بھی اسلامی لفظیات کی بڑی لطیف بلیغ اور شاندار مثالیں ہیں لیکن ہم نے اسلامی تلمیحات کے علاوہ اردو شاعری میں اسلامی لفظیات کی تلاش وجستجو اور نشاندہی کی کوشش کی ہے کیونکہ اردو شاعری میں تلمیحات کے علاوہ بھی اسلامی لفظیات کا بڑا حصہ ہے اردو شاعری کی طاقت

وقوت اور حسن و جمال انھیں سے قائم ہے اسلامی لفظیات اردو شاعری کا حسن بھی ہیں اور اساسی جز بھی، ایک ایک لفظ سے سیکڑوں اشعار مزین ہیں۔

اردو شاعری کی لفظیات کا مولد و مسکن اگرچہ ہندوستانی ہے لیکن اس کی معنویات، رمز و کنایات، تراکیب، تلفظ، بیان، تہذیب، سلیقہ رکھ رکھاؤ لطافت، نزاکت، حسن و ملاحت و تاثر، سحر اور اعجاز، ترکی، عربی، ایرانی اور اسلامی ہے اقبال کی لفظیات میں عجمی لئے اور حجازی مئے کا مرکب اردو شاعری ہے، اردو اپنے مزاج، مذاق اور منہاج کے اعتبار سے اسلامی ہے اردو کی لفظیات سے اسلامی تعلیمات، اسلامی پس منظر اور اسلامی عقائد و معنویات کی جھلملاہٹ ہٹادی جائے تو اردو کا سحر کافور ہو جاتا ہے کیونکہ لفظ تو معانی کے اظہار کا قالب ہے، اصل تو جہان معانی ہے بقول غالب لفظ گنجینہ معانی کا طلسم ہے ہندوستانی لفظیات میں اسلام اور مسلمانوں کے اشتراک سے جونئ معنویت پیدا ہوئی اسے اردو کا نام دیا گیا بلاد ہند میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد ہی اردو کی تخلیق و پیدائش کا ذریعہ ہے، کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بلاد ہند میں اردو کا وجود اسلام اور مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوا خواہ یہ آمد محمد بن قاسم، محمود غزنوی، غوری، خلجی، تغلق، سوری، لودھی، اور شاہان، مغلیہ کی آمد ہو یا پیر فقیر اور اولیاء اللہ کا ورود مسعود یا جہاز رانوں اور تاجروں کی آمد ان میں سے ہر طبقہ کی آمد کے ساتھ اسلام کا نور وابستہ تھا جس نے اہل ہند کے قلب و دماغ کو ہدایت ربانی سے منور کر دیا اور معنویت کی یہی وہ کہکشاں ہے جس نے مقامی بولی کی لفظیات کو جگمگایا تو اردو کا نور چمک اٹھا اور مقامی بولی کی کھڑی بڑی لفظیات میں اعجاز معانی اور سحر حلال کی کیفیت پیدا ہوئی، ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں روز آغاز سے ہی
> تقریباً تمام اصناف سخن میں خالق کائنات کی تسبیح و تقدیس اور تعریف

وتوصیف کے مضامین ضرور شامل کیئے گئے ہیں اور ہمارے شعراء نے
خدا کے حضور اپنی بے نوائی اور بے بضاعتی کا اظہار کیا ہے اور اپنے
ذہن ودماغ اور فکر وقلم کو توانائیاں عطا کرنے کی التجاء کی ہے......
مثنوی میں یہ روایت زیادہ مضبوط و مستحکم شکل میں سامنے آتی ہے۔"

(کاروان ادب شمارہ ا، ۱۹۹۴ء)

اردو زبان کی تشکیل وتخلیق میں اولیاء، بزرگان دین کا بنیادی کردار رہا ہے انھوں نے دین کی تبلیغ واشاعت کی خاطر عوام الناس کی زبان کو اختیار کیا اور ایسی زبان تشکیل دی جو عام فہم ہو اردو زبان کے تشکیلی دور میں صوفیاء کرام کی خدمات کا طویل ودرخشاں سلسلہ ہے جس نے نہ صرف ہندوستان میں نئی زبان تخلیق کی بلکہ اس کی اشاعت کا فریضہ بھی انجام دیا بطور خاص دکن اور گجرات میں تو یہ زبان اولیاء اللہ اور بزرگان دین ہی کی بدولت پھیلی اور پروان چڑھی پنجاب، دہلی (دوآبہ) بنگال، گجرات دکن وغیرہ جن جن علاقوں میں لوگوں نے اردو کے آغاز کی بحث کو اپنی سرزمین سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے اور دلیل میں جو سرمایہ پیش کیا ہے وہ انھیں بزرگان دین کی نقل وحرکت فیض رسانی دین کی تبلیغ واشاعت اور بندگان خدا سے ملاقات اور اختلاط کا ذکر کیا ہے اور انھیں کے اقوال گیت دوہے، مثنویات اور ملفوظات کو اردو کا اوّلین سرمایہ قرار دیا ہے، پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی مشہور کتاب "پنجاب میں اردو" میں اردو کے جس ابتدائی سرمائے کے نمونے جمع فرمائے ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق اولیاء کے اسی مقدس گروہ سے ہے وہ اردو شاعری کی سب سے قدیم نظم دریافت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریختہ کی طرز کی نظموں میں سب سے قدیم ریختہ شیخ فریدالدین
گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ کی طرف منسوب ہے علاوہ بریں ان کے

بعض اردو فقرے بھی ملتے ہیں ان کے بعد شیخ عثمان اور شیخ جنید اور منشی
ولی رام کے ریختوں کی باری آتی ہے جو گیارہویں صدی ہجری سے
تعلق رکھتے ہیں، بارہویں صدی ہجری کی متفرق نظموں میں زیادہ تر
صوفیانہ نظمیں داخل ہیں جن میں سے اکثر غوث اعظمؒ کی شان میں
ہیں ایسی نظمیں چونکہ کثیر تعداد میں ملتی ہیں اس لئے میں نے صرف
چند انتخاب کر لی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان زیادہ تر
خانقاہ نشینوں کی گود میں پلی۔''

(پنجاب میں اردو، بحوالہ نقوش ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۲۴)

اردو زبان اور اردو شعر و ادب دونوں کی تخلیق و اشاعت میں صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کی جدوجہد کا تسلسل نظر آتا ہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا دکن اور گجرات میں یہ سلسلہ زیادہ طویل مضبوط پائیدار اور مسلسل کئی صدیوں پر محیط ہے اردو زبان کو شاہان تصوف کی سرپرستی پہلے حاصل ہوئی پھر شاہان حکومت کی سرپرستی حاصلہوئی اردو شاعری پر بھی بعینہ اسی کا اطلاق ہوتا ہے صوفیاء و اولیاء اللہ نے اپنے مسترشدین کی تعلیم و تربیت کی خاطر شعر کی تاثیری قوت اثر پذیری و اثر آفرینی کی صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا یہی وجہ ہے کہ اردو کے اوّلین شعراء میں صوفی شعراء کی تعداد زیادہ ہے پروفیسر معین الدین جینا بڑے اپنے مضمون ''گجری اور دکنی میں ترجمے کی اوّلین روایت'' میں دکنی اور گجری کے چند صوفی شعراء کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اردو کے ان اوّلین صوفی شعراء نے تصوف کے دقیق
مسائل اور پند و موعظت کے خشک موضوع کو خوبصورت تشبیہوں،
استعاروں اور تمثیلوں کی مدد سے دلچسپ انداز سلیس اور سادہ زبان میں
پیش کیا ہے اس سادگی و پرکاری کی وجہ سے ان کے کلام میں اثر اور

شاعرانہ حسن کا امتزاج پایا جاتا ہے اسی شاعرانہ حسن کی وجہ سے یہ
ادب جس کا موضوع مذہب اور تصوف ہے صرف مذہبی ادب نہیں
رہتا بلکہ مستقبل کے اس عظیم کلاسیکی ادب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے
جس نے ادبیات عالم کو ''سب رس'' اور غزلیات ولی جیسے انمول
جواہر پارے دیئے۔
جس زبان کے ادب کی بسم اللہ خانقاہ سے ہوئی اس کے ابتدائی دور
میں ترجموں کے لئے قرآن کی تفاسیر اور احادیث کا انتخاب عین
فطری امر ہے، قدیم دور کا ادب مذہب کے زیر اثر پروان چڑھتا ہے''

(بحوالہ دکنی اردو، پروفیسر عبدالستار دلوی ص ۳۱۰)

پروفیسر عبدالقادر کا شمار مشہور محققین اور ماہرین زبان میں ہوتا ہے وہ رقمطراز ہیں:

''اردو کو ایک مستقل ادبی زبان کی حیثیت دینے میں حضرت
شاہ میران جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے بزرگوں کو خاص
اہمیت حاصل ہے آپ کا تعلق بہمنیوں کے آخری عہد سے تھا لیکن
جب بہمنی سلطنت پانچ خودمختار سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی تو آپ بیجاپور
منتقل ہو گئے عوام کے ارشاد و ہدایت کے لئے آپ بھی اردو سے کام
لیتے تھے چنانچہ نثر و نظم میں آپ کے کئی رسالے ہیں آپ کے فرزند
اور خلیفہ برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلی آپ کے
نقش قدم پر چلتے رہے روحانی پیشواؤں کی اس پشت پناہی نے جدید
بولیوں کو ابھارا اور عوام بھی ان کی تقلید میں ان زبانوں میں لکھنے
لگے......دکنی کا یہ دور مذہبی تحریروں کا دور ہے۔''

(دکنی زبان پروفیسر عبدالقادر سروری/بحوالہ دکنی اردو، پروفیسر عبدالستار دلوی ص ۳۳۳)

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' کے عنوان سے مستقل کتاب لکھ کر صوفیاء واولیاء کی ابتدائی خدمات کا جائزہ لیا ہے اور بہت سارے ثبوت اور دلائل بھی جمع کر دیئے ہیں اردو زبان اور شعر وادب کی تاریخ لکھنے والے اور تذکرہ نگار سب اس بات پر متفق ہیں کہ اردو ادب نثر و نظم دونوں شکلوں میں صوفیائے کرام کی جدوجہد کا رہین منت ہے ماہرین لسانیات، محققین زبان اور اساتذہ شعر وادب کے مذکورہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی پیدائش کے وقت سے ہی اس کی شاعری کی تمام اصناف سخن میں خالق کائنات کی تسبیح وتقدیس اور حضور سرور کائنات ﷺ کی تعریف وتوصیف اردو کا وطیرہ رہا ہے، اردو خانقاہ نشینوں کی گود میں پلی ہے اور اردو شعر وادب کی بسم اللہ خانقاہوں سے ہوئی اردو کا ابتدائی ادب مذہب کے زیر سایہ پروان چڑھتا رہا ہے اور اس کا ابتدائی دور مذہبی تحریروں کا دور رہا اور اس کی نشوونما میں اولیاء کرام اور صوفیاء عظام نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں مذکورہ بالا بیانات کئی صدیوں کا خلاصہ ہے، اردو زبان اور شعر وادب کی تاریخ لکھنے والے اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اردو ادب اپنے آغاز ہی سے شعر ونثر دونوں صورتوں میں صوفیاء واولیاء کرام کی جدوجہد کا رہین منت ہے اور اسلامی فکر کا آئینہ دار بھی ہے یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں سے اردو شاعری میں اسلامی تصورات وعقائد کا اور ان کی ترجمانی کے لئے اسلامی لفظیات کا آغاز ہوتا ہے اور یہ محض آغاز نہیں ہے بلکہ اس کا تسلسل کئی صدیوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری کی لفظیات کا بڑا حصہ اسلامی لفظیات سے صرف آشنا ہی نہیں آراستہ ہے اردو کی ابتدائی شاعری صوفیانہ خیالات دینی تصورات وتعلیمات اور اسلامی فکر کی ترجمان رہی ہے یہی اردو شاعری کا سب سے پہلا رجحان قرار پاتا ہے جو کئی صدیوں پر محیط رہا اور اردو شاعری نے اسی کے زیر سایہ اپنا تشکیلی وارتقائی سفر طے کیا چنانچہ اسلامی لفظیات اردو شاعری میں جذب

ہوتی رہی اور رچ بس گئی پھر مرور ایام کے ساتھ اصلاً اسلامی تصورات وعقائد کی ترویج واشاعت کے لئے وجود میں آنے والی لفظیات دیگر مختلف معانی کے لئے بھی استعمال ہونے لگی اور اسی بنیادی لفظیات سے دیگر مرکب الفاظ تراش لئے گئے اور اشتقاق کا یہ عمل ہنوز جاری ہے۔

اردو شاعری میں ہمیں اسلامی لفظیات کی دو سطحیں ملتی ہیں ایک کا تعلق اسلامی تہذیب وثقافت سے ہے اور دوسری سطح پر اس کا تعلق خالص مذہبیات سے ہے بلا مبالغہ سینکڑوں اشعار میں یہی لفظیات جلوہ گر ہے اور ہزاروں اشعار اسی لفظیات سے مزین ہیں بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مذکورہ لفظیات کی وجہ سے اشعار زیادہ حسین زیادہ پرکشش پر اثر دلچسپ اور معنی خیز ہو گئے ہیں کیونکہ ان میں معنویات کی کئی تہیں اور پرتیں بڑی آسانی سے سما جاتی ہیں معنوی وسعتوں اور پہنائیوں کے علاوہ شاعری کے لئے یہ لفظیات زیادہ موزوں ثابت ہوئی شاعری کی اپنی مخصوص لفظیات ہوتی ہے سبک، نرم، لطیف، نغمہ ریز ہلکی پھلکی آوازوں والے لفظ شعر کے لئے زیادہ موزوں ہوتے ہیں مذکورہ لفظیات میں ثقیل آوازوں والے حرف مثلاً، ڈ، ڑ، ٹ، بھ، جھ، دھ، مہتوتہ الفاظ بالکل نہیں ہیں اس لئے بھی شعراء کے لئے یہ لفظیات زیادہ مانوس اور پرکشش ثابت ہوئی اور شاعری میں اسے زیادہ جگہ دی گئی۔

مندرجہ ذیل فہرست اس کا سرسری جائزہ پیش کرتی ہے جو حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے:

اللہ	اذان	ایمان
ازل	ابد	اجر
ارم	آخرت	

بہشت / باغ جناں / باغ رضواں بت / بت خانہ / بت کدہ باطل

پرہیزگار	پردہ/ پردہ نشیں/ پردہ داری	پارسا
تقویٰ	تجلّی	تسبیح
توبہ	تقدیر	ثواب
جنت	جہنم	جامۂ احرام
جزا	جہاد	حج
حرم	حق	حور
حرام	حشر	حجاب
خدا	خلد	خوں بہا
خانقاہ	دعا	دیت
رب	رحمت	رحمٰن
رحیم	روضہ	زہد
زاہد	زمزم	سجدہ
سلسبیل	سلام	شہادت
شہید	شہید	شیطان
صبر	صور	صلیب
طور	طواف	طیبہ
عرش	عرفان	عصیان
عذاب	غیبت	فتویٰ
فرشتہ/سروش	فردوس	قسم
قیامت	قضاوقدر	قضا/مرگ
قبر	قسمت	قربانی

قصاص	کعبہ	کوثر
کشف	کرامت	کفر
کافر	کفن	گناہ
گواہی	لن ترانی	لم یزل
مسجد	معراج	معجزہ
معصیت/ معاصی	مغفرت	متقی
محتسب	معرفت	معبود
نور	نعمت	نقاب
نماز	نبی	نذر
ناصح	وحی	وضو
واعظ		

تلمیحی الفاظ

آب زمزم	آب کوثر	آتش طور
آتش نمرود	ابرہہ	ابن مریم
ابن ملجم	ابوجہل	ابولہب
ارنی	اژدرِ موسی	اصحاب فیل
اصحاب کہف	اعجاز مسیحا	الم نشرح
اورنگ سلیماں	بردران یوسف	برق تجلی
بوئے یوسف	بوئے پیرہن	بیت اللہ
پسر نوح	پنجۂ مریم	تجلیٔ طور

تخت بلقیس	تخت سلیماں	تعبیر یوسفی
جاء الحق و زھق الباطل	جلوۂ طور	جلوۂ سینا
چاہ یوسف	چشمۂ خضر	چشمۂ کوثر
چوب کلیم	حجر اسود	حرف استکبار
حرف ینسلون	حسن یوسف	خاتم سلیمانی
خاتم نبوت	خضر	خواب یوسف
دجال	دست موسیٰ	دست داؤد
دعائے خلیل	دم عیسیٰ	دیوار یتیم
ذبح عظیم	ذوالنورین	روز الست
رود نیل	زمرۂ لا یحزنوا	زندان یوسف
زور حیدری ۔ زور اسد اللّٰہی	ساقیٔ کوثر	ساکنان عرش اعظم
سامری	سحر سامری	سد سکندر
سد یاجوج ماجوج	سدرہ	سگ اصحاب کہف
سلیماں	سلیمان اور چیونٹی	شجر ایمن
شجر خلد	شجر طور	شجر ممنوعہ
شراب طہور	شعلۂ ایمن	شعلۂ سینا
شعلۂ طور	شعلۂ نمرود	شرح صدر
شق صدر	شق القمر	شیش محل سلیمانی
صاحب الحوت	صاحب خلق عظیم	صبح حشر
صبر ایوب	صبر حسین	صدائے کن فیکون
صور اسرافیل	صوم مریم	ضرب کلیم

الفاظ پر مشتمل ہیں ان سب کو شمار کر لیا جائے تو اردو شاعری کی وہ شاندار لفظیات وجود میں آتی ہے جسے ہم نے اسلامی لفظیات سے تعبیر کیا ہے اس طرح اس کا سلسلہ خاصا دراز بھی ہے اور درخشاں بھی، پر کشش بھی ہے اور پُر تاثیر بھی، پر اثر بھی ہے اور پر معنی بھی، پر خیال بھی ہے اور پر بہار بھی............

مذکورہ لفظیات میں سے ایک ایک لفظ پر ایک ایک شاعر کے یہاں پچاسوں اشعار ملیں گے اردو کے قدیم وجدید شعراء میں سے شاید ہی کوئی شاعر ایسا ملے جس نے ان لفظیات کو نہ برتا ہو مثبت انداز میں نہ برتا ہوگا تو منفی انداز میں برتا ہوگا کیونکہ مثبت اور منفی دونوں انداز میں شعراء نے ان لفظیات کو برتا ہے اور معنویات کی نئی جہتیں دریافت کی ہیں اور نئی نئی پرتیں پیدا کی ہیں اور یہ انہی لفظیات کا کرشمہ ہے۔

اسلامی لفظیات کی تلاش میں ہم نے کلام غالب کا مطالعہ کیا تو کم غزلیں ایسی ملیں جو ان لفظیات سے خالی تھیں بعض بعض غزلوں میں مسلسل کئی اشعار انھیں الفاظ سے مزین ہیں جو ہم نے اوپر ذکر کئے ہیں ایک غزل ایسی بھی دستیاب ہوئی جس کے نو میں سے سات شعر ایسے ہیں جس میں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا ضرور ہے جسے ہم اسلامی لفظیات کے دائرے میں شمار کرتے ہیں اور اکثر شعر میں وہ لفظ بھرتی کا نہیں ہوتا بلکہ شعر کے حسن وخوبصورتی کا محور وہی ایک لفظ ہوتا ہے خیال کی ترسیل اور معنی کا ابلاغ اسی لفظ سے ہوتا ہے شعر اسی لفظ کے گرد گھومتا ہے اور اسی ایک لفظ سے مکمل ہوتا ہے۔

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے — قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین وہوش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ — یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام — قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

۹

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی — رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا — گویا، ابھی سنی نہیں آواز صور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

غالب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

مختلف غزلوں کے مسلسل اشعار جن میں اسلامی لفظیات کی جلوہ نمائی ہے اوپر مذکور ہوئے اب کچھ متفرق اشعار بھی پیش خدمت ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی لفظیات کی معنیاتی سطح کیا ہے گہرائی اور وسعت کتنی ہے تنوع کیسا ہے اور یہ صرف نمونہ ہے احاطہ نہیں نہ شاعری کا نہ اسلامی لفظیات کا......!!

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے — کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا　رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد　مجھ سے میرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

تلمیحات

تعریف و تعارف:

فن لغت اور علم بلاغت کی کتابوں میں تلمیح کی تعریف مختلف الفاظ میں کی گئی ہے کوئی تلمیح کو محض کسی قصہ کا اشارہ قرار دیتا ہے کوئی محض حوالہ کہتا ہے کوئی تاریخی واقعات کی قید کا اضافہ کرتا ہے تو کوئی تلمیح کو محض مشہورات عوام تک محدود رکھتا ہے کسی نے تلمیح کی تعریف میں علمی اصطلاحات و مسائل کو بھی شمار کر لیا ہے کسی نے ضرب الأمثال، محاورات، آیات و احادیث کو بھی تلمیح کے دائرہ میں شامل کیا ہے غرض کوئی ایک مستقل جامع وسیع و مکمل تعریف نہیں ملتی اور ایسی تعریف کی ضرورت کا احساس ابھرتا ہے جو جامع وسیع مکمل اور تسلی بخش ہو اور شعراء کے تمام استعمالات پر مشتمل ہو۔

تلمیح کی تعریف میں یہ اختلاف دراصل اس سبب سے پیدا ہوا کہ شعرا نے پہلے پہل صرف تاریخی واقعات کو شعر کی معنوی قوت کے لئے استعمال کیا تو تلمیح کی تعریف میں ''تاریخ'' کی قید ضروری قرار دے دی گئی پھر علم نجوم موسیقی طب و سائنس کی اصطلاحات کو بھی بعض معانی کی ادائیگی کے لئے شعر میں استعمال کیا جانے لگا چنانچہ ان کا بھی اضافہ ہو گیا اسی طرح آیات و احادیث اور فلسفۂ تصوف بھی تلمیح کی تعریف میں شامل کر لیا گیا غرض شعراء و ادباء کے استعمالات سے تلمیح کی تعریف تغیر و تبدیلی کا شکار ہوتی رہی کیونکہ شعراء علم لغت و بلاغت کے اصولوں کے تحت شعر نہیں کہا

کرتے، بلکہ شاعری کا وجود پہلے ہے اور لغت و بلاغت کے اصول وقواعد کی ترتیب بعد کی چیز ہے خاص طور سے اردو شاعری کے اصول وضوابط اور فصاحت و بلاغت کے قواعد و معیارات نیز تنقید و تحقیق کے قوانین تو بہت بعد میں مرتب کیے گئے اس لئے تلمیح کی تعریف میں تعارض واختلاف اور تضاد ناگزیر تھا اور یہی اختلاف زبان وادب کے تدریجی ارتقاء کا آئینہ دار بھی ہے لیکن اب جبکہ عرصہ ہوا اردو زبان وادب کا عبوری دور گذر چکا فن لغت اور علم بلاغت کے اصول وضوابط منضبط کئے جا چکے اور شعراء وادباء کے کلام کو انھیں اصولوں کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جانے لگا اب شاعر کا کلام معیار فصاحت و بلاغت نہیں رہا بلکہ کلام کا فصاحت و بلاغت کے اصول کے مطابق ہونا ضروری ہو گیا ہے اور ہمارے پاس کئی سو سال کی شاعری کا سرمایہ بھی محفوظ ہے لہذا اب تلمیح کی ایسی تعریف کا تعین ضروری ہے جو شعراء کے تمام استعمالات کا احاطہ واستقصاء کر سکے اور اس کے مشمولات میں ہمہ اقسام تلمیحی اشارات سما سکیں جو جامع کامل اور وسیع تر ہو اور تلمیح کا دائرہ ''مشہورات'' اور ''تاریخی'' کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر زبان وادب اور شعر وسخن کے وسیع آفاق روشن کر سکے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ فن لغت اور علم بلاغت و معانی کی پیش کردہ تعریفات کا جائزہ لیا جائے تا کہ اس کی روشنی میں تلمیح کی تعریف پر از سر نو غور کیا جا سکے۔

اردو کی مختلف لغات میں تلمیح کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

(۱) نور اللغات: تلمیح (ع) مؤنث، علم بیان کی اصطلاح کلام میں کسی قصہ کی طرف اشارہ کرنا۔

(۲) فیروز اللغات: تلمیح، علم بیان کی اصطلاح میں کسی قصہ وغیرہ کا کلام میں اشارہ کرنا۔

(۳) معیار اللغات: تلمیح، تلمیح وہ صنعت ہے کہ کلام مشتمل ہو کسی قصۂ معروف یا کسی مضمون مشہور پر۔

(۴) مہذب اللغات: تلمیح، کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا۔ علم بیان کی اصطلاح میں ایک صنعت کا نام ہے جس میں شاعر اپنے کلام میں کسی مشہور مسئلہ یا کسی قصہ یا مشہور مثل یا اصطلاح نجوم وغیرہ کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرے جس کے بغیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے اس کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے (عربی، مؤنث، علم بیان کی اصطلاح)

(۵) جامع اللغات: کسی چیز کی طرف سبک نگاہ سے دیکھنا اور اپنے کلام کو آیات و احادیث سے ثابت کرنا۔

(۶) لغات کشوری: تلمیح، (ع) مؤنث سبک نگاہ کرنا کسی چیز کی طرف اور اصطلاح اہل معنی میں: اشارہ کرنا اپنے کلام میں کسی قصہ کی طرف یا اصطلاحات نجوم وموسیقی کا لانا یا اپنے کلام میں آیات قرآن یا احادیث کا لانا۔

(۷) لغات فیروزی: تلمیح، کسی چیز کی طرف ہلکی نظر سے اشارہ کرنا۔ اصطلاح علم معانی میں کسی قصے یا علمی اصطلاح کی طرف اشارہ کرنا یا اپنے کلام میں قرآن شریف کی کوئی آیت یا حدیث لانے کو کہتے ہیں۔

(۸) اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری: تلمیح، اشارہ، کنایہ، (کسی قصہ وغیرہ کی طرف جس میں اشارہ یا کنایہ ہو) تلمیح سے مراد ہے پر کنایہ یا کنایہ آمیز

(۹) غیاث اللغات: لغوی معنی بجائے مہملہ نگاہ سبک کردن بسوئے چیزے از منتخب و یا اصطلاح اہل معنی اشارت کردن در کلام بقصہ یا آوردن اصطلاحات نجوم وموسیقی وغیرہ یا در کلام آوردن آیات قرآن مجید یا احادیث۔

ہندی لغت نویسوں کے نزدیک تلمیح کے مترادفات تین ہیں (अन्तरकथा) انتر کتھا (सन्दर्भ) سندر بھ اور (संकेत)

(۱) بھار گو اسٹینڈرڈ ڈکشنری: سنکیت مترادف ہے Token, sign, Symbol, Reference

(۲) بار مانک ہندی کوش: کسی کہی ہوئی بات کی طرف مخفی انداز میں اشارہ کرنا، وروہ بات

(۵) آئینۂ بلاغت: (Allusion) سے یہ مطلب ہے کہ کسی شعر میں تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جائے انگریزی میں علاوہ واقعات تاریخی کے رومی و یونانی صنمیات کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے اور اس کی متعدد مثالیں انگریزی میں موجود ہیں

(۶) افادات سلیم: زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لئے الفاظ بنائے گئے ہیں رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا لمبے لمبے قصوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص لفظوں کے ذریعہ سے اشارے ہونے لگے جہاں وہ لفظ زباں پر آئے فوراً قصے یا واقعے آنکھوں کے سامنے آ گئے جن کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں ایسے تمام اشارے تلمیح کہلاتے ہیں۔

(۷) شعر العجم: صنائع شاعری میں ایک چیز تلمیح ہے یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا ایک لطیف صنعت ہے۔

تلمیحات: ڈاکٹر مصاحب علی صدیقی نے بھی تمام تعریفات کا جائزہ لینے کے بعد اور تلمیح کی موجودہ تعریفات کے نقص کا شکوہ کرنے کے بعد خود ایک جامع و مانع تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے جو اس طرح ہے "تلمیح وہ صنعت معنوی ہے جس میں شاعر اپنے کلام میں کسی مسئلہ مشہور یا قصہ یا قول یا مثل یا اصطلاح نجوم یا موسیقی وغیرہ کی طرف اشارہ کرے جس کے بغیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آوے۔ آیت قرآن پاک کا لانا، کسی معجزہ کا ذکر کرنا، کسی حدیث کو نظم کرنا، کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا تلمیح کی تعریف سے خارج از بحث نہ سمجھنا چاہیے بلکہ ان کو بھی تلمیح کی تعریف کا ایک ضروری جزء تصور کرنا چاہیے۔"

قدیم و جدید اہل لغت اور علماء بلاغت کی مذکورہ تعریفات کا جائزہ لیں تو تلمیح کی تعریف میں جو قدر مشترک یا مفہوم مشترک نظر آتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) اشارہ کرنا، بعض اس کے لئے سبک انداز کی قید لگاتے ہیں۔

(۲) مشہور و معروف ہونا۔

(۳) علمی مسئلہ، ضرب الامثال، اصطلاح، آیات، احادیث، یا واقعات و قصص کا ہونا، بعض نے مؤخرالذکر کے لئے تاریخی کی قید بھی لگائی ہے ہندی و انگریزی اہل لغت کی تعریفات کا خلاصہ ایک نیا رخ فراہم کرتا ہے، یعنی وہ اشارے کو حوالہ (Reference) کا رنگ دیتے ہیں ایسا حوالہ جو براہ راست بھی ہوسکتا ہے اور بالواسطہ بھی صریح بھی اور خفی بھی۔

(۴) لفظ تلمیح کا عربی ہونا۔

تقریباً سارے اہل لغت نے تلمیح کو لفظاً عربی گردانا ہے اور اصلاً یہ عربی ہے بھی لیکن عربی میں تلمیح کا جو اصل مادّہ ہے ل+ م + ح = لمح۔ تلمیح کی تعریف متعین کرتے وقت اس کے اصل جوہر کا خیال نہیں رکھا گیا، عربی میں لَمَحَ یَلمَحُ لَمحاً باب فَتَحَ یَفتَحُ فَتحاً ثلاثی مجرد سے آتا ہے۔ جس کے معنی ہیں نگاہ اٹھنا چمک جانا، روشن ہونا، مثلاً لمح البرق بجلی چمکی لمح النجم ستارہ روشن ہوا یہی عربی مادہ جب باب تفعیل سے لایا جاتا ہے تو اس کی شکل بنتی ہے لمّح یلمّح تلميح باب تفعیل کا یہی مصدر اردو میں علم معانی و بیان کی اصطلاح تلمیح ہے باب تفعیل سے جب الی کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں اشارہ کرنا اور بغیر صلہ کے براہ راست استعمال ہو تو نظر ڈالنا، دزدیدہ نگاہ سے دیکھنا روشن کرنا، چمکدار بنانا جگمگا دینا جیسے لمّح الشیٔ چمکدار بنا دیا رایته لمحة البرق بجلی جتنی دیر میں چمک کر ختم ہو جاتی ہے میں نے اتنی دیر اسے دیکھا (اچٹتی سی نگاہ ڈالی) اسی سے لمح البصر کی تعبیر بنتی ہے یعنی پلک جھپکنا یہ باب فتح اور تفعیل دونوں سے آتا ہے اور مجموعی طور پر جو معانی بنتے ہیں وہ ہیں نگاہ اٹھنا، روشن ہونا، چمک جانا، نگاہ ڈالنا، روشن کر دینا، چمکدار بنانا، جگمگا دینا، اشارہ کرنا، یہ تمام معانی اس لفظ کی اصل ''لمح'' میں پوشیدہ

ہیں اور تلمیح میں ان تمام معانی کا عکس جھلکتا ہے اس پس منظر میں جو لفظِ تـلـمیـح کی اصل حقیقت یا جوہری معنی ہیں ہم اصطلاحی معانی پر غور کریں تو تلمیح کی اصل بھی یہی ہے، شاعر کوئی ایک لفظ یا اشارہ ایسا استعمال کرتا ہے جس سے ذہن میں روشنی کا جھما کا سا ہوتا ہے بجلی سی چمک جاتی ہے اور واقعہ روشن ہو جاتا ہے اور وہ تمام معانی بھی جگمگا اٹھتے ہیں جو شاعر کا مقصود ہوتے ہیں وہ خیال جھلملانے لگتا ہے شاعر جسے ادا کرنا چاہتا ہے تلمیحی اشارہ میں شاعر پہلے واقعے کو روشن کرتا ہے پھر اسی سے خیال کو منور کر کے تلمیح تراشتا ہے جس کے سہارے معانی کی ترسیل اور خیال کا ابـلاغ مکمل ہوتا ہے شاعر کا مقصد کبھی فی نفسہ وہی واقعہ یاد دلانا ہوتا ہے اور کبھی اس واقعہ کے پس منظر کو جگمگا کر مطلوبہ معانی کی طرف ذہن کو منتقل کرنا ہوتا ہے اس اعتبار سے تلمیح ایک قسم کا سرپرائز ہے (SUSPENSE) سسپینس ہے، طلسم ہوشربا ہے علاء الدین کا چراغ ہے، جس سے پلک جھپکتے میں مفہوم ومعانی کے خزانے روشن ہو جاتے ہیں اور یہ سارا کرشمہ ہے لفظِ تلمیح کی اصل " لمح " کا جو تـلمیح میں قلب کی طرح پیوست، خون کی طرح متحرک اور روح کی طرح جاری وساری ہے اسی لئے تـلـمیـح کی تعریف میں ان خاص معانی کا لحاظ ضروری ہے جو اس کے اصل عربی مادہ کا تقاضہ ہے اور یہی معانی براہ راست مراد لئے جاتے ہیں اور لئے جانا چاہئے کیونکہ لفظ تلمیح بغیر صلہ کے مطلقاً اشارہ کے معنی میں استعمال ہی نہیں ہوتا بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق نے تلمیح کے معانی لکھے ہیں اشارہ، کنایہ، اور تلمیح کی تعریف کرتے ہوئے پُر کنایہ یا کنایہ آمیز الفاظ استعمال فرمائے ہیں، علامہ شبلی نعمانی نے جو اردو کے اوّلیں نقادوں میں ہیں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ کسی واقعہ یا قصہ کی طرف محض اشارہ کرنے کا نام تلمیح نہیں ہے بلکہ کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنے کا نام تلمیح ہے لہذا لفظ تلمیح کے اس عربی پس منظر اور انہیں دونوں بزرگ ادیب ونقادوں کی بیان کردہ وضاحتوں کی بنیاد پر تلمیح کی جدید تعریف کچھ اس طرح

روشن ہوتی نظر آتی ہے "تلمیح وہ انداز کلام ہے جس میں کسی خیال کی ادائیگی کے لئے لطیف انداز میں کسی واقعے، قصے، داستان، مثل، اصطلاح یا آیات واحادیث سے کوئی مرکب تعبیر اخذ کی گئی ہو یا کوئی لفظ تراشا گیا ہو یا شعر (کلام) کا مجموعی مفہوم ہی اس نوعیت کا ہو کہ ذہن کو کسی واقعے قصے داستان مثل اصطلاح یا آیت وحدیث کی طرف منتقل کردے"، تلمیح کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کلام میں اشارہ لفظاً موجود ہو بلکہ معانی ومفہوم کے اعتبار سے بھی اگر اشارہ پایا جا رہا ہے تو ایسے کلام کو بھی تلمیح شمار کیا جائے گا بلکہ یہ زیادہ لطیف وبلیغ تلمیح ہوگی کیونکہ اس میں استعارہ کی شان پیدا ہو جائے گی مثلاً

پتھر اُبالتی رہی اک ماں تمام رات
بچے فریب کھا کے چٹائی پہ سو گئے

اس شعر میں ماں کا تمام رات پتھر اُبالنا تاریخی واقعہ سے استفادہ ہے اور یہی تلمیح کی بنیاد ہے۔

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانہ ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ... ہے

ہاتھ اس کا وہی خدا کا ہاتھ
بات اس کی کلام ربانی

ہماری بیان کردہ تلمیح کی مذکورہ تعریف میں "تاریخی" اور "مشہور" یا معروف کی کوئی قید نہیں ہے تاکہ تلمیح کا دامن تنگ نہ ہو اس کی وسعت و بے کرانی برقرار رہے اور تلمیح کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو اور زبان وادب کے ایوان میں تلمیح کے نئے نئے چراغ روشن ہوتے رہیں۔

شمیم انہوتوی نے محمود نیازی کی کتاب "تلمیحات" کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''صنعت تلمیح کا دائرہ دیکھنے میں جس قدر وسیع معلوم ہوتا ہے
اس قدر وسیع نہیں ہے کیونکہ کچھ مخصوص پابندیاں احاطہ کئے ہوئے
ہیں'' (صفحہ:۱۴)

اس خیال کی بنیاد تلمیح کی وہ تعریفات ہیں جو قسط وار ہوتی رہی ہیں، انہیں تعریفات کی وجہ سے تلمیح کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوگیا ہے خود محمود نیازی نے بھی تلمیحات غالب میں بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

''تلمیحی الفاظ کی بنیاد مشہورات پر ہوتی ہے یعنی جو قصہ جس
طرح بھی عام لوگوں میں مشہور ہے اس کو ویسا ہی سمجھا جاتا ہے اس
میں عقل ونقل تائید وتبصرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔''

(تلمیحات غالب)

محمود نیازی کے بعد افتخار حسین رضوی (ساحر لکھنوی) نے تلمیحات کی فرہنگ مرتب کی تو انہوں نے بھی اسی بات کو دہرایا اور اسی سمت میں مزید کچھ آگے بڑھ گئے وہ لکھتے ہیں:

''شعر یا نثر میں کسی واقعہ کی جانب اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے
ہیں بشرطیکہ وہ واقعہ کافی مشہور ہو چکا ہو خواہ خلاف عقل ہو، تو ہماتی
ہو، طلسماتی ہو یا فرضی ہی کیوں نہ ہو بعض تاریخی واقعات جب داستانوں
کی زینت بن جاتے ہیں تو زیب داستان کے لئے ان میں بہت
سے اضافے بھی ہو جاتے ہیں تلمیح کے بطور جب انکا حوالہ دیا جاتا
ہے تو ان کی وہی حیثیت پیش نظر ہوتی ہے۔ جس کے سبب وہ واقعات
معروف ہو جاتے ہیں ایسی صورت میں واقعات کا تجزیہ کرنے کی
کوئی ضرورت نہیں۔'' (تلمیحات ومصطلحات)

پروفیسر وحیدالدین سلیم غالباً اس خیال کے موجد و بانی ہیں لکھتے ہیں:

> "تلمیح کی بنیاد اکثر مشہورات پر ہوتی ہے نہ کہ حقائق پر اس لئے جن
> باتوں سے تلمیح اخذ کی جاتی ہے ان پر اعتراض کرنا سراسر حماقت ہے
> ان باتوں کا ثبوت عقلاً یا نقلاً نہیں ہوتا۔" (افادات سلیم ص ۲۱۱)

مذکورہ بالا تعریفات کی روشنی میں ایسے تمام واقعات جن کی بنیاد خالص حقائق پر ہو تلمیح کی فہرست سے خارج کرنا ہوں گے اور آئندہ کے لئے بھی ایسے واقعات کو تلمیح کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا؟؟! اس کے علاوہ مذکورہ بالا بیانات میں قدر مشترک یہ ہے کہ تلمیح کی بنیاد صرف وہی واقعات ہیں یا ہو سکتے ہیں جو مشہور و معروف ہوں تلمیح کی تعریف میں دراصل اہل لغت نے مشہور و معروف ہونے کی قید لگا رکھی ہے مذکورہ خیالات کی بنیاد وہی ہے اور خود اس خیال کی بنیاد اس امر پر ہے کہ سننے والا کلام کے مفہوم کو سمجھ سکے پروفیسر وحیدالدین سلیم نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "ہر تلمیح کسی خیال کے ادا کرنے کا سانچہ ہے اور یہ سانچہ اس
> لئے کام میں لایا جاتا ہے کہ اس خیال کی تصویر سننے والوں کی نظر کے
> سامنے آ جائے تو ضروری ہے کہ تلمیح کی بنیاد جس بات پر رکھی جائے
> وہ لوگوں میں مشہور ہو اس بات کی ہم کو مطلق پرواہ نہیں ہونی چاہیے
> کہ اصلی اور واقعی بات کیا ہے۔" (افادات سلیم ص ۲۱۱)

تلمیح کے سلسلہ کے ان تصورات میں شاعر یا قائل سے زیادہ سامع کو غیر ضروری اہمیت دی گئی ہے اور تلمیح کی بنیاد تلمیح تخلیق کرنے والے کے بجائے تلمیح سننے والے پر رکھی گئی ہے جبکہ تلمیح کی تلاش و جستجو تحقیق و تخلیق اور تلمیح کے ذریعہ خیال کی لطیف ادائیگی ہی اصل فن ہے فن ہی نہیں بلکہ فن بلاغت ہے اور بلاغت کا بھی اعلیٰ معیار ہے اور یہ متفقہ اصول ہے کہ فن کا معیار فنکار و تخلیق کار ہوتا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے سامع

اور جو تلمیحی مضامین پیدا کئے ہیں ان کی بنیاد مشہورات پر نہیں بلکہ سنگین اور بہت سنگین حقائق و واقعات پر ہے اور وہی حقائق تلمیح کی تخلیق کا باعث ہیں اس کے علاوہ مذہبی عقائد تمدنی ترقیات قوموں کا عروج و زوال اور مذہبی تعلیمات آیات و احادیث سے متعلق تلمیحات کی بنیاد بھی محض مشہورات پر نہیں ہو سکتی اسی لئے تلمیح کے سلسلہ میں ''مشہور و معروف'' کی قید لگانا یا تلمیح کو محض تاریخی واقعات تک محدود کرنا دراصل تلمیح کے دائرے کو محدود اور تنگ کر دینا ہے (ان بزرگوں سے معذرت کے ساتھ) شعراء نے اس کی پذیرائی نہیں کی ہے اور اہل ادب کو اس کی ہمت افزائی کرنا بھی نہیں چاہیے تلمیح کے سلسلہ میں ہم عقل و نقل اور تنقید و تجزیہ کی گنجائش بھی روا سمجھتے ہیں اور اس کو ''حماقت'' سے تعبیر کرنے کی جسارت بھی نہیں کرتے کیونکہ تلمیحات کے ذیل میں آیات و احادیث، انبیاء عظام، صحابہ کرام، اہل بیت اطہار، قومی ہیروز اور سینکڑوں برگزیدہ شخصیات کا ذکر ہے اور ان سے متعلق واقعات تلمیح کے ذیل میں آتے ہیں جو اس بات کے متقاضی ہیں کہ تلمیحات کی بنیاد محض مشہورات عوام پر نہ ہو بلکہ عوامی مشہورات کی تنقید و تنقیح اور تحلیل و تجزیہ کر کے حقائق کی تلاش و جستجو کی جائے اور عوام الناس میں کوئی غلط بات مشہور ہے تو اس کی تصحیح کی کوشش کی جائے کیونکہ خدانخواستہ آیت غلط مشہور ہے یا من گھڑت باتوں کو انبیاء کرام اور نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی سے منسوب کر کے صحابہ اور اہل بیت کے شایان شان باتیں نہیں ہیں تو کیا ہم تلمیح کے لئے صحت کی تلاش و جستجو نہیں کریں گے؟؟؟ کیا یہ تلاش و جستجو حماقت ہوگی؟؟! یا مشہورات عوام کو بنیاد بنا کر غلط تلمیح تراشیں گے؟؟؟! یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ تلمیح میں جو طاقت و قوت ہے وہ حقیقت کے سرچشمہ سے پھوٹتی ہے اور حلاوت و تاثیر کے پیچھے صداقت کا ہیرا جگمگاتا ہے تلمیح اسی ہیرے کا انعکاس ہے جس سے ذہن روشن ہو جاتا ہے اور باطن جگمگا اٹھتا ہے اور شعر و ادب کے در و بام منور ہو جاتے ہیں۔

اس بحث کو مختصر کرتے ہوئے ایسے تلمیحی اشعار بطور دلیل و نمونہ درج کیے جاتے ہیں جن سے یہ دعوی پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ تلمیح کی تخلیق مشہورات عوام پر نہیں ہے بلکہ ایسے علوم وحقائق پر ہے عوام کا جن سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ہاتھ اس کا وہی خدا کا ہاتھ
بات اس کی کلام ربانی (میر)

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا (میر)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا (غالب)

تلمیح کی اقسام اور اس کا حدودِ اربعہ

تلمیح کا دامن اپنی وسعت و جامعیت میں خاصا کشادہ ہے نثر و نظم کی بیشتر اصناف ادب کو یہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اس کے اظہار کا اصل اور بڑا میدان تو شعر و شاعری ہے لیکن نثر میں بھی اس کی حکمرانی ہے نثر میں تلمیحی پیرایۂ بیان خاصہ دلچسپ لطیف و مؤثر ہوتا ہے اور فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ معیار سمجھا جاتا ہے تلمیح کی قلمرو میں جملہ اصناف شعر بھی داخل ہیں مثنوی، مرثیہ، مسدس، نظم، غزل، نعت، قطعات وغیرہ۔ فنی اعتبار سے بھی تلمیح کے دائرہ میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز، ضرب الأمثال، صنائع بدائع، اشاریت علامت وغیرہ شامل ہیں معنوی اعتبار سے تلمیحات ادبی بھی ہیں علمی بھی، تاریخی بھی ہیں مذہبی بھی، تخیلاتی بھی ہیں واقعاتی بھی، اصطلاحی بھی ہیں رسمی بھی، عوامی بھی ہیں شاہی بھی، روایتی بھی ہیں اور بیگماتی بھی، تلمیح کا ایک چھوٹا سا لفظ اپنے اندر ایک جہان معانی رکھتا ہے اور پورے شعر و ادب پر حاوی ہے۔

تلمیح کی اسی وسعت و جامعیت کے پیش نظر بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں بعض لوگ خالص تشبیہی اور استعاراتی اشعار کو بھی تلمیح کے ذیل میں لے آتے ہیں اور مطلق علامت و اشاریت کو بھی تلمیح شمار کرنے لگتے ہیں اور ہر اصطلاح کو جو شعر میں آجائے تلمیح کی فہرست میں شمار کرنے لگتے ہیں حالانکہ تلمیحات و اصطلاحات کے مابین بڑا بنیادی فرق ہے علمی و فنی اصطلاح کے لئے ہر علم و فن کے ماہرین بیٹھ کر باہم غور و

فکر اور تبادلۂ خیال کے بعد باہم متحد ہو کر کسی معنی کے لئے کوئی اصطلاح وضع کرتے ہیں اور وہ اصطلاح اسی علم وفن یا اس کے بعض جزئیات یا ذیلی شعبوں کی ترجمان ہوتی ہے اس کے معانی متعین ہوتے ہیں جبکہ تلمیح طے شدہ مخصوص معانی کی ''ترجمان'' نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعہ نئے نئے معانی تراشے جاتے ہیں تلمیح معانی وخیال کی ادائیگی کا ایک سانچہ، ایک آلہ ایک ذریعہ ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ شعراء مخصوص معنی کی ادائیگی کے لئے کسی اصطلاح کو تلمیحاً استعمال کرلیں تب بھی اصطلاح تلمیح نہیں ہوگی بلکہ جو مخصوص معانی مراد لئے جائیں گے اصل تلمیح وہی ہوگی کیونکہ شعر میں کسی فن کی اصطلاح کا استعمال اس فن کے مخصوص معانی کے اظہار کے لئے نہیں ہوتا جس کے لئے وہ اصطلاح بنائی گئی ہے بلکہ شاعر اپنے خیال کی ادائیگی کے لئے اس اصطلاح کا سہارا لیتا ہے۔

بعض علماء بلاغت نے تلمیح کو ''سرقات'' کے ذیل میں بیان کیا ہے جو صحیح نہیں ہے دراصل تلمیح خیال کی ادائیگی کا ایک ذریعہ ہے ایک مخصوص پیرایہ اظہار ہے جسے کوئی بھی برت سکتا ہے مثلاً بیمار کو اچھا کرنا مردے کو زندہ کرنے کے لئے مسیح اور مسیحائی کی تلمیح ہے اس تلمیح کو بیک وقت مختلف شعراء استعمال کر سکتے ہیں اس کی گنجائش بھی ہے لیکن ہر شاعر کا شعر جدا ہوگا اسلوب کلام بھی علیحدہ ہوگا اور تاثیر و تاثر بھی الگ اور خیال بھی مختلف، اشتراک صرف تلمیح کے استعمال میں ہو سکتا ہے اور یہ کوئی عیب نہیں نہ اسے سرقہ قرار دیا جانا چاہیے کیونکہ لفظوں کے توارد کا نام سرقہ نہیں، بلکہ ایک ہی خیال کے دہرانے کا نام سرقہ ہے اور محتاط انداز میں اسے بھی سرقہ سے نہیں بلکہ توارد سے تعبیر کیا جاتا ہے لہذا مختلف شعراء کے یہاں محض تلمیح کی مماثلت و مطابقت کی وجہ سے تلمیح کو سرقات کی فہرست میں شمار کرنا یقیناً نادانی ہوگی۔ اسی طرح توریہ اور شعری معمہ بھی تلمیح کے ذیل میں نہیں آئے گا اور حوالۂ محض بھی تلمیح کی حدود میں شامل نہیں ہے کیونکہ حوالہ، محض ایک بے جان بے روح پیرایۂ بیان ہے جبکہ تلمیح حوالہ کا نام نہیں ہے کیونکہ کسی

واقعہ کی طرف اشارہ کر کے اس واقعہ سے مضمون پیدا کرنا یا کسی لطیف خیال کو تراشنا تلمیح ہے واقعہ کے پس منظر سے خیال کو مجسم و منور کرنا تلمیح کی روح ہے محض کسی بات کا حوالہ اس معیار کو نہیں پہنچتا اس لئے یہ بھی تلمیح کی حدود سے خارج شمار ہوگا۔

تلمیح کی اقسام

عام طور پر تلمیح کی قسمیں ان کے معانی کا لحاظ کرتے ہوئے کی گئی ہیں فنی طور پر تلمیح کی اقسام نہیں ملتیں، پروفیسر وحید الدین سلیم نے جو تلمیحات کے سلسلہ کا ایک اہم حوالہ ہے تلمیح کی صرف دو ہی قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) ادبی تلمیحات : وہ تلمیحیں جو اردو نظم و نثر میں مستعمل ہیں۔

(۲) عام تلمیحات : وہ تلمیحیں جو عام بول چال میں داخل ہیں (افادات سلیم)

شمیم انہونوی محمود نیازی کی ''تلمیحات'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''مجتہدین علم کلام نے تلمیح کی بڑی بڑی دو قسمیں قرار دی ہیں تاریخ و قصص اور معتقدات: (۱) تاریخ و قصص اسماء و اعلام سے متعلق خاص خاص واقعات اور مخصوص تاریخی باتیں اور اشیاء مراد ہیں''
>
> (۲) معتقدات میں وہ باتیں شامل ہیں جن کو مذہبی عقیدے کے طور پر مانا جاتا ہے۔'' (تلمیحات)

تاریخ و قصص اور معتقدات دونوں کو تلمیح کی قسموں میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ تو تلمیح کے مآخذ ہیں ہاں البتہ معنوی اعتبار سے یا معانی کے لحاظ سے تلمیح کی جو قسمیں کی گئی ہیں ان میں تاریخی و مذہبی دونوں کا ذکر ملتا ہے اور غالباً شمیم انہونوی کا مقصد بھی یہی ہے لیکن پھر صرف ''دو'' کی تحدید صحیح نہیں ہے کیونکہ معانی کے اعتبار سے تلمیحات کا جائزہ لیں تو بہت سی قسمیں بنتی ہیں۔

صنائع بدائع کی روشنی میں تشبیہ کی طرح اس کی فنی تقسیم نہیں کی جا سکتی؟؟ تلمیح کا جملہ اصناف سخن میں جاری وساری ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کی بھی فنی تقسیم کی جائے جیسے دیگر صنعتوں کی فنی تقسیم کی گئی ہے جیسے تشبیہ، استعارہ ومجاز وغیرہ ہمیں اس میں بظاہر کوئی مانع نظر نہیں آتا بلکہ یہ تلمیحات کی نوعیت کی تعیین کا تقاضہ ہے تا کہ مختلف تلمیحات کے مابین فرق درجات اور قدر مراتب قائم ہو سکے علم معانی وبلاغت کی جتنی صنعتیں ہیں ان میں سے بیشتر صنعتوں میں شعراء نے تلمیح کا استعمال کیا ہے اور بڑی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ کیا ہے چنانچہ تلمیح تشبیہ بھی ہے استعارہ بھی تلمیح کنایہ بھی ہے مجاز بھی اور مجاز مرسل بھی بلکہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ جب جب تلمیح نے تشبیہ استعارہ یا کنایہ کا لباس فاخرہ زیب تن کیا ہے اس کا حسن وشباب اس کا سحر اس کی لطافت اس کی ملاحت اور زیادہ نکھر گئی ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ اس نے لوگوں کے دل ودماغ کو مسخر کرلیا ہے اسی لئے کوئی مانع نہیں ہے اگر ہم تلمیح کو بھی انہیں صنعتوں کے اعتبار سے تقسیم کردیں اور اس کی تعریف و حدود کا بھی تعین کردیں یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ تلمیحی شعر میں بیک وقت دو صنعتیں جمع ہو جاتی ہیں اوّل تو تلمیح خود ایک صنعت شعری ہے دوم بصورت استعارہ یا بصورت کنایہ یا تشبیہ یا مجاز وغیرہ اور کبھی کوئی بھی صنعت تلمیح سے وابستہ نہیں ہوتی لہذا اس کی تعیین ضروری ہے کہ آیا تلمیح مجرد ہے یا دوسری کسی صنعت کے ساتھ وابستہ ہے اور اگر دوسری کسی صنعت کے ساتھ وابستہ ہے تو وہ کون سی صنعت ہے اسی کو بالفاظ دیگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ تلمیح کی کون سی قسم ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ہیں:

تلمیح مجرد:

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتداء ہے اسماعیل (اقبالؔ)

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

(اقبال)

یوسف سے عزیز کو کئی سال
زندان عزیز میں پھنسایا
اللہ رے تیری بے نیازی
یعقوب کو مدتوں رلایا
پہونچ کے چاند پہ لوٹ آئے منکر معراج
شکست عقل نے کھائی بڑے غرور کے بعد

(انور صابری)

ان اشعار میں نہ تشبیہ ہے نہ استعارہ ہے نہ کنایہ نہ مجاز بلکہ صرف سادہ تلمیح ہے مجرد واقعہ کی طرف اشارہ ہے یہ اور اس قسم کے تلمیحی اشعار جن میں تلمیح کا انداز محض خبر کا ہوتا ہے یا مجرد واقعہ کا بتلانا مقصود ہوتا ہے کیا ہم انہیں ''تلمیح مجرد'' نہیں کہہ سکتے خصوصاً ان تلمیحی اشعار کے مقابلے میں جن میں تلمیح استعاراتی پیکر میں نمودار ہوتی ہے یا تلمیح تشبیہ کے خوشنما ملبوس میں جگمگاتی ہے اسی طرح جن تلمیحی اشعار میں یہ صنعتیں یعنی تشبیہ استعارہ وغیرہ پائی جاتی ہیں کیا ہم انہیں استعاراتی تلمیح یا تلمیح استعارہ، تشبیہی تلمیح یا تلمیح تشبیہ، کنایاتی تلمیح، تلمیح مجاز وغیرہ کا نام نہیں دے سکتے؟ کیا اس تعین کے ساتھ تلمیح کی فنی تقسیم نہیں کی جا سکتی۔؟؟؟

تلمیح خواہ مجرد ہو یا استعاراتی، تشبیہی ہو یا کنایاتی ومجازی وغیرہ فی الوقت تو ادب کا طالب علم سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیتا ہے تلمیح کے اندر جو صنعت ہے یا تلمیحات کے درمیان باہم جو فرق ہے اس کو ملحوظ بھی نہیں رکھ پاتا چہ جائیکہ وہ اس سے محظوظ بھی ہو۔

اقبال کا شعر ہے:

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

ناصر کاظمی کا شعر ہے:

یوں ترے حسن کی تصویر غزل میں آئے
جیسے بلقیس سلیماں کے محل میں آئے

تو بھی اس بھیڑ میں کھو جائے گا یوسف کی طرح
اے میرے دوست بہت گرمیِ بازار نہ دیکھ

(رازالہ آبادی)

کیا ان اشعار کو صرف تلمیح کہہ کر گذار دیں؟؟!!اقبال نے تشبیہ کو تلمیح بنا کر پیش کیا ہے جس سے شعر کی معنویت بہت بلند ہوگئی ہے اور زور بیان میں اضافہ ہوا ہے اور ناصر کاظمی کے شعر میں تلمیح سے تشبیہ اخذ کی گئی ہے جبکہ تیسرے شعر میں سادہ تشبیہ ہے ان اشعار میں لوازماتِ تشبیہ مکمل موجود ہیں یعنی مشبہ، مشبہ بہ، اور یوں، سا، جیسے، کی طرح وغیرہ حرف تشبیہ بھی موجود ہیں کیا ایسے اشعار کو بھی صرف تلمیح کہنا کافی ہوگا؟؟یا صرف تشبیہ کہہ دینے سے بات مکمل ہو جائے گی؟!!

مندرجہ ذیل اشعار میں تلمیح استعارہ کی شکل میں موجود ہے اور بڑی دقیق ولطیف تلمیحات ہیں:

پتھر اُبالتی رہی اک ماں تمام رات
بچے فریب کھا کے چٹائی پہ سوگئے

(؟)

بھوکے بچوں کی تسلی کے لئے
ماں نے پھر پانی پکایا دیر تک

(نواز دیوبندی)

وطن کی ریت مجھے ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقین ہے پانی یہیں سے نکلے گا

(بشیر بدر)

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

(افتخار عارف)

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(اقبال)

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے برنگ گل
پھر مجھ کو آگئی کسی گل پیرہن کی یاد

(مومن)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(غالب)

یہ اور اس قسم کے تلمیحی اشعار کے لئے اگر ہم استعاراتی تلمیح یا تلمیح استعارہ کی قسم مان لیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تلمیح کی شناخت اور اس کی توسیع و تعیین کا ایک اہم قدم ہوگا اور اس کی ضرورت بھی ہے۔

تلمیح کے سلسلہ میں مطالعہ اور تلاش و تحقیق کے دوران صنعت تلمیح سے متعلق علماء فن معانی و ماہرینِ فن بلاغت کی کوئی فنی تقسیم یا تشریح و تحلیل اور تلمیح کی ادبی اہمیت و حیثیت اور اس کے مقام و مرتبہ کی تعیین کی کوئی مستقل و مکمل تفصیلی بحث نظر نہیں آئی، جس سے بڑی مایوسی اور حیرت بھی ہوئی صرف ایک نام وحیدالدین سلیم کا ملتا ہے جنھوں نے ''افادات سلیم'' میں کچھ تفصیل لکھی ہے جس کی حیثیت ابتدائی خطوط ونقوش کی ہے اور اس کے بھی تنقیدی جائزے کی ضرورت ہے چند سال پیشتر یعنی سنہ ۱۹۹۰ء میں مصاحب علی صدیقی نے بھی اس کا شکوہ کیا ہے اور بڑی حد تک خود انھوں نے اپنی کتاب ''اردو ادب میں تلمیحات'' میں قدرے تفصیلی بحث کی ہے اور تلمیح کے موضوع پر قابل قدر اور اہم مواد جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی یہ کوشش بھی متقدمیں کی بیان کردہ محدود تعریفات اور شرائط و قیود کی پابند ہے البتہ انھوں نے دیگر لوگوں کی طرح تلمیحات کی فرہنگ سازی کے بجائے براہ راست تلمیح کا ادبی جائزہ لیا ہے اور خاصا مواد جمع کر دیا ہے ڈاکٹر مصاحب علی صدیقی کے بعد ہمارا یہ معروضی جائزہ اسی سلسلہ کی دوسری پیش رفت ہے جس سے ضرورت کا احساس بیدار ہوتا ہے اور ہم نقادان فن، علماء بلاغت و معانی اور اہل ادب سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس سمت میں کوئی قدم اٹھانے کی زحمت فرما کر اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

اردو شعر وادب میں تلمیح کی اہمیت

تلمیح کا آغاز دراصل حضرت آدم ؑ کی تخلیق ہی سے ہو جاتا ہے جب حضرت آدمؑ کی تخلیق ہوئی پھر ملائکہ وذات باری تعالی کے درمیان جو مکالمہ ہوا، ابلیس نے سجدہ سے انکار کیا فرشتوں نے سجدہ کیا حضرت حوا کی تخلیق ہوئی آدم وحوا دونوں کو جنت میں رہنے کا حکم ملا پھر ابلیس نے دونوں کو بہلا پھسلا کر جنت سے نکلوایا اور حضرت آدمؑ مع شیطانی ذریت کے دنیا میں اتارے گئے یہ تمام کی تمام تلمیحات ہیں جو لحظہ بہ لحظہ حضرت آدم کی تخلیق کے ساتھ ساتھ وجود پذیر ہوتی رہیں قرآن کریم نے عالم بالا کے ان واقعات وحقائق کی طرف اشارات کئے ہیں اور تخلیق آدم کے پورے قصہ کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے اسی لئے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تلمیحات کی تخلیق اس دنیا کے پہلے انسان حضرت آدمؑ کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی تلمیح چونکہ اشارہ کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے بھی اس کی تخلیق کو ابتداء آفرینش سے ہی جوڑا جاتا ہے کیونکہ مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے سب سے پہلے حضرت انسان نے اشاروں ہی سے کام نکالا تھا ڈاکٹر مصاحب علی صدیقی نے تلمیحات کے آغاز کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تلمیح علم بیان کی نہایت اہم صنعت ہے اس کی قدامت اس طرح مسلم الثبوت ہے جیسا کہ تمدن و معاشرت کی تاریخ، ابتداء آفرینش سے اس صنعت کا گہرا لگاؤ انسانی تمدن سے رہا ہے ارتقاء

کی ہر منزل میں اس کے نقوش پائے جاتے ہیں، دنیا کی جن قوموں
میں الفاظ نہیں تھے وہ اپنے خیالات و اشیاء کو سمجھانے کے لئے ہاتھ
پاؤں اور آنکھوں سے اشارہ کرتے تھے اپنے دلوں کی ترجمانی انھیں
ٹوٹے پھوٹے حوالوں سے کرتے تھے پھر تصویروں کے ذریعہ اظہار
مطلب کرنے لگے رفتہ رفتہ حرفوں نے جنم لیا جن کی مدد سے ایک
خاص خیال یا کام کی طرف اشارہ ہونے لگا اور ہر شخص ان اشاروں کو
سمجھنے لگا ترقی کی دنیا میں یہ دور نہایت اہم تھا جس میں زبان کا سنگ
بنیاد رکھا گیا اور ادب کی تشکیل ہوئی انہیں اشاروں اور تصویروں کی
جگہ تلمیحات نے لے لی. تلمیح کے ایک لفظ نے وہی توضیح کی جو ان
اشاروں اور تصویروں سے ادا ہو سکتی تھی۔''

(اردو ادب میں تلمیحات ڈاکٹر مصاحب علی صدیقی ص ۱۳۲)

تلمیح اظہار خیال کا ایک لطیف ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے جو طویل واقعات کو کمال اختصار کے ساتھ ادا کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے اور یہ مختصر نویسی کا کمال نہیں بلکہ ایجاز کا کرشمہ ہے تلمیح میں خیال کی ادیگی عام طور پر براہ راست نہیں ہوتی بلکہ شاعر تلمیح کے ذریعہ شعر میں ایک ''ایمائی'' کیفیت پیدا کرتا ہے جو شعر کا خاصہ ہے رمز و ایما شاعری کا حسن قرار دیا گیا ہے اسی لئے شعر میں الفاظ کے ظاہری قالب کے سہارے معانی کی ایک دنیا آباد کی جاتی ہے اور جب ذہن ان معانی کا ادراک کر لیتا ہے تبھی شعر مکمل لطف دیتا ہے اور شعر سن کر سرور و انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے سرشاری کا احساس آدمی کو ملاء اعلی کی سیر کرا دیتا ہے باطن جھنجھنا اٹھتا ہے اور لہو کی گردش تیز ہو کر آنکھوں سے چھلکنے لگتی ہے اہتزاز و انبساط کی یہ کیفیت اس وقت دو آتشہ ہو جاتی ہے جب شعر تلمیحی ہوتا ہے کیونکہ تلمیح میں عجیب و غریب بلاغت ہوتی ہے جو سننے والے کو

پلک جھپکتے میں سینکڑوں سال کا سفر طے کرا دیتی ہے، ایجاز و اختصار، بلاغت اور سرعت انتقال ذہنی کے اسی کمال سے شاعری میں تلمیح کی حیثیت و اہمیت کا تعین وابستہ ہے، تلمیح کا چھوٹا سا لفظ اپنے اندر معانی کی جو کائنات رکھتا ہے وہ لفظیات کی دنیا میں تنہا اسی کا خاصہ ہے کسی بلیغ سے بلیغ تر لفظ میں معانی کی وہ وسعت وہ گہرائی و گیرائی نہیں پائی جاتی جو تلمیح کے چھوٹے سے لفظ کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اسی طرح اثر آفرینی و تاثیر کی بھی وہ قوت تلمیح میں پائی جاتی ہے کہ بلیغ سے بلیغ تعبیرات بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں تلمیح کی بلاغت پر پروفیسر وحید الدین سلیم نے یوں اظہار خیال کیا ہے۔

> ''بلاغت کے معنی یہ ہیں کہ کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی سمجھے جائیں یہ بات جس قدر تلمیحات میں پائی جاتی ہے الفاظ کی دیگر اقسام میں نہیں پائی جاتی (اسی لئے) جس زبان میں تلمیحات کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں وہ بلاغت کے درجہ سے گری ہوئی ہے۔''
>
> (افادات سلیم ص ۱۱۳)

تلمیحات ادب کی جان ہیں خواہ نثر میں ہوں خواہ نظم میں، ان معنی خیز اشاروں سے ادیب و شاعر اپنے کلام میں بلاغت کی روح پھونکتے ہیں تاثیر کا کمال دکھاتے ہیں اثر آفرینی کا جادو جگاتے ہیں خاص طور سے شعر میں تلمیح کا استعمال شعر کو جاندار و شاندار اور باوقار بناتا ہے اور تلمیحی معنی کی رعایت سے شعر جگمگا اٹھتا ہے معنوی اعتبار سے بھی شعر فصاحت و بلاغت کے بام عروج پر پہنچ جاتا ہے اسی لئے یہ دعوی کیا جا سکتا ہے اور بجا ہوگا کہ ایک تلمیحی شعر غیر تلمیحی شعر کے مقابلے میں یقیناً زیادہ بلیغ زیادہ لطیف زیادہ حسین و جمیل اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے بشرطیکہ تلمیح کو خوبصورتی سے تراشا گیا ہو اور سلیقہ سے برتا گیا ہو تلمیح جتنی سچی حقیقی اور واقعاتی ہو گی شعر اتنا ہی حسین و خوبصورت دل آویز اور مؤثر ہوگا اور تلمیح کا جادو سر چڑھ کر بولے گا کیونکہ تلمیح کی معنوی پرتیں ذرا وقفہ

سے روشن ہوتی ہیں (صرف اتنا وقفہ جتنی دیر میں بجلی کوند جاتی ہے) لیکن دیر تک جھلملاتی رہتی ہیں جذبات واحساسات میں برقی رودوڑ جاتی ہے، ذہن جگمگا اٹھتا ہے اور ذوق لطیف سرور وانبساط سے سرشار ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تلمیح کا ایک لفظ (ہلکا سا اشارہ) باذوق آدمی کو ایک لمحہ میں پوری فلم دکھا دیتا ہے تلمیحی اشارہ سے وہ لمحہ بجلی کی طرح روشن ہو کر گذر جاتا ہے اور معانی واشارات کی گھٹائیں جھما جھم برسنے لگتی ہیں پلک جھپکتے ہی نہ بجلی رہتی ہے نہ گھٹائیں صرف سرشاری اور سرور وانبساط کی لہریں باقی رہ جاتی ہیں سرشاری کی یہی انفعالی کیفیت تلمیح کا کمال بھی ہے اور مقصود بھی اور بلاغت و معانی کا نقطۂ عروج بھی، تلمیح کی اسی حیثیت واہمیت کے پیش نظر شعروسخن کی جملہ اصناف میں تلمیح رائج ومقبول ہے مثنویات ہوں یا منظومات، قطعات ہوں یا رباعیات، شاہنامہ ہو یا مسدس، مرثیہ ہو یا نعت یا غزل تلمیح سب میں اپنا جادو جگاتی ہے۔

تلمیح خود ایک صنعت شعری ہے لیکن اس صنعت شعری کا استعمال علم معانی وبلاغت کی دیگر صنعتوں کو حسین تر اور لطیف ترین بنانے کے لئے بھی کیا جاتا ہے استعارہ کنایہ تشبیہ ومجاز وغیرہ خود مختلف صنعتیں ہیں لیکن ان صنعتوں کو جب تلمیح کے ساتھ برتا جاتا ہے تو بذات خود یہ صنعتیں بھی چمک اٹھتی ہیں اور ان کا حسن دوبالا بلکہ دوآتشہ ہو جاتا ہے اسی لئے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نثر ونظم اور دیگر اصناف سخن پر تلمیح جس قدر حاوی ہے کوئی اور صنعت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور اسی سے اردو شعروادب میں تلمیح کی اہمیت وحیثیت کا تعین وابستہ ہے۔

تلمیحات کے مآخذ و مصادر

تلمیحات کے مآخذ کا جائزہ لیتے وقت ہم اردو زبان کی تخلیق اس کی نشو نما کے ابتدائی مراحل ابتدائی ماحول اور تاریخ کو نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ اردو کا خمیر مختلف بولیوں، مختلف زبانوں، مختلف مذاہب مختلف تہذیب و تمدن اور مختلف قوموں کے اختلاط سے تیار ہوا تھا اس لئے جہاں اس کی لفظی تراش خراش میں یہ تمام عناصر جزوی اور کلی طور پر شریک ہیں وہیں اس کی معنویات میں بھی ان تمام عناصر کا عطر کشید ہو کر آ گیا ہے، مختلف قوموں کی سیاسیات، سماجیات، ثقافات اور مذہبیات کے پس منظر میں اردو کی تراکیب وضع ہوئیں اور نشو نما کے ابتدائی مراحل سے گذر کر رائج و مقبول ہوئیں اردو کی تشکیل میں جہاں ہندوستان کی مقامی بولیوں برج بھاشا، پراکرت، اپ بھرنش سنسکرت اور ان سب کی مجموعی ترقی یافتہ شکل مغربی ہندی اور دکن کے علاوہ عربی، ترکی اور فارسی کا دخل ہے اسی طرح اس کی ترویج و ترقی میں بھی ان تمام اقوام کا دخل ہے ہندو قوم کے مختلف طبقات جو مقامی ہیں ان کے علاوہ عربی ترکی ایرانی افغانی بلوچی پنجابی سندھی مکرانی مراٹھی گجراتی اور دکنی بھی شامل ہیں. ان تمام اقوام کے ساتھ ان کا اپنا اپنا مذہب رسوم رواج تاریخی و جغرافیائی پس منظر لہجہ اور تہذیب و تمدن بھی وابستہ تھا لہذا غیر شعوری طور پر زبان کی تشکیل کے ابتدائی عمل میں صرف الفاظ کا تبادلہ شروع ہوا وہ بھی روزمرہ کی شدید ضروریات کے تحت، اس لئے شروع شروع میں ان مختلف اقوام کے خیالات،

جذبات ،احساسات اور ثقافتی اثرات زبان کا جزء نہیں بنے بلکہ عرصے تک فاتح اور مفتوح قوم کے کلچر کے درمیان حد فاصل قائم رہی اور بڑی حد تک فاتح قوم کا کلچر ہی غالب رہا یہ ماحول کا نفسیاتی دباؤ اور تقاضہ بھی تھا اور حسن اتفاق سے جو قوم فاتح بن کر آئی تھی وہ اپنی زبان اپنے ادب اپنی ثقافت اپنے مذہب اپنی تہذیب کے اعتبار سے کافی غنی اور مالدار تھی خاص طور سے اس کی زبان اس کا ادب خاصہ سرمایہ دار تھا ابتداء اسے یہاں سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں پیش آئی یوں بھی وہ ''الید العلیا'' کی پوزیشن میں تھی اس کا ادب اس کا کلچر عالمی سطح کا تھا اس لئے ابتداءً اس نے یہاں کے مذہب یہاں کی تہذیب وثقافت یہاں کی زبان سے استفادہ کے بجائے افادہ کا فطری اصول اپنایا جو ماحول کا نفسیاتی تقاضہ اور غیر شعوری ردّعمل تھا اگر چہ اس میں فاتح قوم کی نفسیات کے دخل سے مطلقاً انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن صورت حال یہی تھی اور یہی اردو کی تشکیل کا بالکل ابتدائی باب ہے

اُردو کی تشکیل کے سلسلہ کی اسی ابتدائی اور بنیادی حقیقت ،سیاسی حالات اور وقت کے نفسیاتی دباؤ کے ردّعمل کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ بعض مصنفین کو یہ شکوہ تھا اور اب بھی کبھی کبھار اس کی بازگشت سنائی دے جاتی ہے کہ اردو شعراء وادباء نے مقامی تہذیب اور کلچر کو نظر انداز کر کے اپنی لفظیات ومعنویات اور تعبیرات میں ایرانی عربی اور ترکی کلچر کو برتنے کی بلکہ تھوپنے کی کوشش کی ہے موجودہ دور میں یہ شکوہ کسی حد تک مبنی بر تعصب کہا جا سکتا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے آج سے نصف صدی قبل یہی شکوہ ماہر لسانیات پروفیسر وحیدالدین سلیم نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان کے بنانے میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے ادب میں صرف اسلامی ادبیات کے آثار موجود ہیں، ہندو قوم کے ادبیات کا کوئی نشان نہ ہماری نثر میں ہے نہ

نظم میں۔" (افادات سلیم صف ۱۸۱)

حالانکہ تحقیق کی کسوٹی پر یہ الزام کھرا نہیں اترتا لیکن پتہ نہیں کیوں لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ زبان بیک جنبش لب وجود میں نہیں آتی رفتہ رفتہ دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ ساتھ مدتوں زبان کا تخلیقی سفر اور ارتقائی عمل جاری رہتا ہے صدیوں کے اختلاط کے نتیجہ میں نئی زبان کا مکھڑا تیار ہوتا ہے پھر اس کی تراش خراش تزئین و تحسین کا عمل شروع ہوتا ہے اور اس میں بھی کافی طویل عرصہ لگتا ہے تب کہیں جاکر زبان گفتگو اور بول چال کے درجہ سے آگے قدم بڑھا کر تقریر و تحریر کا مرحلہ طے کرتی ہے پھر شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کا مرحلہ آتا ہے اور اس کے بعد ثقافتی سرمایے کے تبادلہ کا دور شروع ہوتا ہے تلمیح کا تعلق اسی ثقافتی لین دین سے ہے۔

اردو کی تخلیق میں تو صدیوں تک فارسی اور مقامی بھاشاؤں کے درمیان تبادلہ ہوتا رہا فارسی اور مقامی بولیوں کے مختلف مراحل طے ہونے کے بعد اردو کی ابتدائی شکل سامنے آئی پھر اردو اور مقامی بھاشاؤں کے درمیان لین دین جاری رہا جس کے نتیجہ میں اُردو بن سنور کر سامنے آئی اور یہی موجودہ اردو ہے جس نے اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں تحریر و تقریر کی شکل اختیار کی اور تصنیف و تالیف اور تنقید و تحقیق کی زبان بنے ہوئے تو اس کو کچھ زیادہ طویل عرصہ بھی نہیں گذرا ہے مسلم سلاطین اور فرمانرواؤں کی وجہ سے عرصہ تک فارسی ہی رائج الوقت زبان تھی اسے ہی علمی زبان ہونے کا شرف حاصل تھا حکومت وقت کی زبان بھی وہی تھی حالانکہ اردو نہ صرف وجود میں آچکی تھی بلکہ اردو شاعری کا بھی خوب چرچا تھا عرصۂ دراز تک خود اردو کے شعراء بھی نثر کے لئے اور تصنیف و تالیف کے لئے حتیٰ کہ خط و کتابت کے لئے بھی فارسی ہی کو ترجیح دیتے تھے اور اردو کو باعث عار سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ اردو شعراء کے ابتدائی تذکرے بھی فارسی ہی میں مرتب کئے گئے شروع شروع میں لوگوں نے اردو کو قابل اعتناء نہیں گردانا حتیٰ کہ وہ

شعراء جن کی شہرت کا باعث ہی اردو شاعری تھی انہوں نے بھی نثر کے لئے اردو کو منہ نہیں لگایا یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ کی بہت سی ابتدائی کڑیاں گمشدگی کا شکار ہیں اور زبان کی تاریخ کا تسلسل ماہرین لسانیات کے اجتہادات کا شاہکار ہے۔ آب حیات وہ پہلا باقاعدہ تذکرہ ہے جس میں اردو کو اظہار خیال کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور اردو تاریخ میں پہلی بار اردو کے شعراء اور ان کے فن شاعری پر اردو میں اظہار خیال کیا گیا آب حیات کا سن اشاعت ۱۸۸۰ء ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کتنے طویل عرصہ تک علمی وادبی زبان نہیں بن پائی تھی۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ ہے کہ تلمیحات کے مآخذ کا جائزہ لیتے وقت پورے پس منظر کو سامنے رکھا جائے پھر تلمیحات کے مآخذ کی تلاش و جستجو کی جائے کیونکہ اردو پر مختلف مقامی زبانوں اور خاص طور سے فارسی و عربی کے اثرات بہت گہرے ہیں اور ان زبانوں کی تہذیب کے اثرات تلمیحات کے باب میں بہت نمایاں ہیں ایرانی، ترکی، عربی اور اسلامی تہذیب وثقافت کی تلمیحات کا استعمال بہت کثرت سے ہوا ہے اور اتنا مقبول ہوا کہ ان تلمیحات کی ایرانیت و اجنبیت ختم ہوگئی ہونا بھی یہی چاہیے تھا کیونکہ ان تلمیحات کو فارسی پس منظر سے کاٹ کر اردو سیاق وسباق میں مقامی سطح پر برتا اور استعمال کیا گیا تھا اس لئے یہ تلمیحات خالص اردو زبان وادب کا سرمایہ بن گئیں اس کے علاوہ تلمیح کو چونکہ خیال کی ادائیگی کا لطیف وخوبصورت پیرایۂ اظہار تسلیم کیا گیا ہے اسی لئے اگر وہ یعنی پیرایۂ اظہار کسی دوسری زبان سے ہمارے شعر وادب میں منتقل ہوا ہو تو بھی اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا نہ ہے اس کے علاوہ اردو زبان تو نمو وترقی کے مرحلے میں تھی جہاں خیال کی ادائیگی کے لئے نئے نئے سانچوں کی ضرورت ہوتی ہے اردو زبان کی یہ ایک فطری اور طبعی ضرورت تھی جسے عربی، فارسی، ترکی، اور مقامی بھاشاؤں اور بولیوں کی مدد سے پورا کیا گیا یوں بھی سانچے اور پیمانے تو کہیں

سے بھی درآمد کئے جاسکتے ہیں اصل تو شراب معانی ہے جو خالص دیسی ہے اس کا سرور و کیف صرف اور صرف اردو کا رہین منت ہے فارسی یا عربی کا نہیں اور اکثر تلمیحات اپنی اصل فارسی وعربی ہیئت میں مستعمل بھی نہیں ہیں ان کو اردو تعبیرات اور مقامی پس منظر کے تحت استعمال کیا گیا ہے پروفیسر وحیدالدین سلیم تلمیحات کے مآخذ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب اسلام نے عرب سے نکل کر گرد و پیش کے ملکوں کو فتح کیا تو انہیں میں سے ایک ایران تھا، جب فاتحین کے حملوں سے ایران کو سر اٹھانے کا موقع ملا تو ایرانیوں نے اپنے ادب کو زندہ کرنا چاہا، تمام ایران مذہب اسلام قبول کر چکا تھا آتش پرستی ناپید ہو چکی تھی اس لئے ایران کے جدید ادب میں عربی کی مذہبی روح دوڑنے لگی ایران کے جغرافیہ و تاریخ اور عرب کے مذہب نے مل کر ایک نیا ادب پیدا کیا جس کو ہم خالص ایرانی ادب کہہ سکتے ہیں نہ عربی ادب ...... یہی جدید ایرانی ادب جو نہ عربی ادب ہے نہ ایرانی ادب بلکہ ایک نئے نام ''عربیرانی'' کہلانے کا مستحق ہے ہندوستان کے مغربی حملہ آوروں کے ذریعہ ہندوستان پہنچا، غزنوی، غوری، تغلق، خلجی، سادات، لودھی، سوری، اور مغل خاندان جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں ہندوستان پر حکومت کی ان کی زبان فارسی تھی ان کی زبانوں میں بھی یہی ''عربیرانی'' ادب جاری تھا، ہندی بھاشا پر فارسی زبان کا اثر پڑنے سے رفتہ رفتہ اردو زبان پیدا ہوئی جب فارسی کو چھوڑ کر یہاں کے شعراء نے اردو زبان میں طبع آزمائی شروع کی تو قدرتی طور سے اسی عربیرانی ادب کا خاکہ اتارا گیا یہ شعراء حاکم اور

فاتح قوم کے تھے مغلوب و مفتوح قوم کی زبان یعنی ہندی اور سنسکرت
کی طرف ان کی توجہ مائل نہیں ہوئی، ہندو راگ مالا، ہندو تاریخ،
ہندو شاعری، ہندو مذہب، کو وہ دلچسپی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اس
لئے لازم تھا کہ جو تلمیحیں اردو ادب میں آئیں وہ ہندو ماخذوں
سے نہ لی جائیں، بلکہ عرب و ایران کے اسی مرکب ادب سے لی
جائیں جس کو فاتح اپنے ساتھ لائے تھے۔" (افادات سلیم)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابتداءً تلمیحات اردو میں عرب و ایران کے ادب سے منتقل ہوئیں لیکن یہ تلمیحات اردو زبان کے سہارے اتنی مقبول اور عام ہوئیں کہ اردو ادب کے رگ و پے میں سما گئیں اور ان کے عرب و ایرانی ہونے کا احساس تک ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر مصاحب علی صدیقی لکھتے ہیں:

"آج یہ فیصلہ کرنا کہ کون تلمیحات عربی کی ہیں کون سی فارسی کی
تھیں اور کونسی تلمیحات زردشتی، ساسانی، وساسانی عناصر سے آئی ہیں
اور فارسی سے اردو نے حاصل کی ہیں آج یہ معاملہ بآسانی نہیں
حل ہو سکتا اور اس چھان بین سے کچھ فیض بھی زیادہ حاصل نہیں ہوگا
کیونکہ اردو ادب کے ہاتھ تو یہ سب تلمیحات فارسی کے گراں بہا
عطیات کے ساتھ دستیاب ہوئیں اور ان کی شمولیت اردو ادب میں
ایک خاص مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔"

(اردو میں تلمیحات مصاحب علی عبدالقیوم صاحب)

ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی محققانہ تصنیف " مذہب اور شاعری" میں اردو نے فارسی سے جو تلمیحات اخذ کی ہیں اس پر بڑا اچھا تبصرہ و تجزیہ کیا ہے فرماتے ہیں:

"فارسی وغیرہ سے تلمیحات مستعار لینے میں ایک فائدہ یہ بھی

ہوا خواہ وہ غیر شعوری ہو کہ ہمارے ادب میں شروع ہی سے بین الاقوامی جراثیم پیدا ہو گئے جس سے اس کی روز افزوں ترقی کی صلاحیت کو ایک تقویت پہنچتی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ جب ضرورت پڑی اس نے فارسی، عربی، بھاشا، کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی مختلف حیثیت سے فائدہ اٹھانے کی سعی مشکور کی چنانچہ آج (انگریزی) روسی اور فرانسیسی ادب سے بھی وہ حسب خواہش اپنا دامن وسیع کر رہا ہے۔" (مذہب اور شاعری ڈاکٹر اعجاز حسین)

اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی یہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ہندوستان کی مٹی اور ہندوستانی قوم کی خصوصیات ان کی روایات اور ان کے کلچر سے فیض نہ حاصل کرتی اردو نے یہاں سے بھرپور فیض حاصل کیا یہاں کی روایات کلچر اور مذہبی معتقدات تک کو گلے سے لگایا (اس سلسلہ میں پروفیسر وحیدالدین کا خیال صحیح نہیں ہے) اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کا کلچر یہاں کی روایات معتقدات رسوم رواج اور دیومالائی تصورات اردو تلمیحات کے لئے "گنج گرانمایہ" ثابت ہوئے سچ تو یہ ہے کہ تلمیحات کے باب میں ہم اردو کی تخلیق و تشکیل میں شامل تمام قوموں کی تہذیب و روایات معتقدات اور ثقافات و کلچر کا عکس جھلکتا ہوا محسوس کر سکتے ہیں. اس پس منظر میں تلمیحات کے مآخذ و مصادر کی تعیین و شناخت تلاش و جستجو اور تلمیحات کے مطالعہ و مشاہدہ سے درج ذیل مآخذ تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور کسی حد تک ان کی تعیین کی جا سکتی ہے کئی سو برس کی اردو شاعری کا سرمایہ محفوظ ہے جس کے مطالعہ سے عام طور پر تلمیح کے جو مآخذ سامنے آتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

(۱) دیومالائی تصورات (ہندو مائتھالوجی)

(۲) مذہبی قصے کہانیاں

(۳) مذہبی عقائد

(۴) مذہبی تعلیمات

(۵) مذہبی واقعات (دیو مالائی قصے کہانیوں کے علاوہ مذہب کی ترویج واشاعت کے لئے فرضی وتخیلاتی قصے کہانیاں اوران کے مخصوص کردار)

(۶) تاریخی واقعات

(۷) مشہور ڈرامے، ناٹک، ناولیں اوران کے مخصوص کردار

(۸) سیاسی انقلابات وسیاسی تحریکات

(۹) قومی تحریکات

(۱۰) مشہور شخصیات

(۱۱) رسوم ورواج نیز اوہام وخرافات

(۱۲) جادوٹونے ٹوٹکے، تعویذات وعملیات اوران کی اصطلاحیں

(۱۳) دیگر اقوام کی زبانیں اوران کا ادب

(۱۴) قرآن کریم

(۱۵) احادیث نبوی

ان کے علاوہ مختلف معاشرتی اموراور دیگر بہت سے امور تلمیح بن سکتے ہیں اسی لئے مآخذ ومصادر کی بحث کو مذکورہ مآخذ ومصادر تک محدود نہیں کیا جاسکتا قطعیت کے ساتھ کوئی آخری نشان دہی یا تحدید نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ شاعروادیب کے اپنے حوصلہ، مطالعہ، تجربے تحقیق وتجزیے نیز مشاہدہ کی بات ہے کہ وہ کون سی بات کو تلمیحی انداز میں بیان کرتا ہےاوراس میں اس کا کتنا سلیقہ ہے۔ جس شاعر کے یہاں تلمیح برتنے کا جتنا سلیقہ اور شعور ہوگا اس کے یہاں تلمیحات کی تعداد بھی زیادہ ہوگی اور تلمیحات میں تنوع اور ندرت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کی بعض تلمیحات ہماری کلاسیکل شاعری میں

مفقود و نایاب ہیں اسی لئے تلمیحات کے مآخذ کی قطعیت کے ساتھ کوئی تحدید نہیں کی جاسکتی یہ میدان بہت وسیع ہے اور اس کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا ہوا ہے مذکورہ مآخذ کی نشاندہی اب تک کی شاعری کے پس منظر میں کی گئی ہے یہ الگ بات ہے کہ یہی مآخذ آئندہ بھی تلمیحات کے لئے گنج گراں مایہ ثابت ہوتے رہیں گے بات صرف تلاش و جستجو ہمت و حوصلہ اور سلیقہ و شعور کی ہے۔

صحیح واقعات کے ہوتے ہوئے غلط واقعہ کو تلمیح کی بنیاد بنانا دراصل تلمیح کو غلط رخ دینا اور اصل واقعے کو مسخ کرنے کی تائید وتوسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تلمیحات کے باب میں صحیح وغلط کے درمیان حد فاصل یا خط امتیاز کھینچنا مشکل ہو گیا ہے اور اسلامی تلمیحات کی شناخت اور تعیین تو اور بھی مشکل کام ہے اسلامی تلمیحات کسے کہتے ہیں اور ان کا دائرہ کیا ہے تلمیحات کی اس پر پیچ و پر خطر وادی میں اسلامی تلمیحات کی نشان دہی بے انتہا ضروری ہے تا کہ عوام کے رطب و یابس سے انہیں ممتاز کیا جا سکے، ان سے افسانوی واساطیری رنگ دور کر کے اور فرضی وتخیلاتی غلاف اتار کر ان کا صحیح تقدس بحال کیا جا سکے کیونکہ مذہب اور مذہبی عقائد وتعلیمات سے متعلق تلمیحات کی بنیاد عوامی مفروضات اور غلط تصورات پر نہیں رکھی جا سکتی خواہ وہ تصورات عوام میں کتنے ہی مشہور و معروف ہوں اور زبان زد خاص و عام ہی کیوں نہ ہوں مذہبی عقائد وتعلیمات تو دو اور دو چار کی طرح واضح حقائق کا نام ہے خاص طور سے مذہب اسلام.....اسلام کی تعلیمات نہایت ٹھوس اور مستحکم ہیں ان میں کوئی غموض وابہام نہیں، اس کے عقائد بے لچک ہیں ان پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا خود ساختہ تلمیحات کے اس گنجلک و بے ترتیب مجموعہ سے ایسی تلمیحات کا علیحدہ کرنا جن کی بنیاد خالص مذہبی عقائد وتعلیمات پر ہو آسان نہیں ہے اس کے لئے کوئی حدود اربعہ اور کسی جامع و مانع تعریف کا تعین ضروری ہے جس کی روشنی میں اسلامی اور غیر اسلامی تلمیحات کے درمیان خط امتیاز کھینچا جا سکے اور کوئی حدِ فاصل قائم کی جا سکے۔

اسلامی تلمیح:

ایسی تمام تلمیحات جن کی بنیاد اسلامی عقائد، اسلامی تعلیمات یا قرآن وحدیث پر ہو یا قرآن وحدیث کا کوئی جملہ کوئی تعبیر یا کوئی جز لفظاً یا معناً بطور تلمیح استعمال ہوا ہو اور

اس کا مفہوم و مقصود قرآن و حدیث کی تعلیمات کے منافی نہ ہو نہ ہی اسلامی عقائد و تصورات سے متصادم ہو تو ایسی تلمیح اسلامی تلمیحات کے دائرے میں شامل سمجھی جائے گی لیکن تلمیحی اشارہ تو اسلامی ہے مگر مفہوم تلمیح وہ نہیں ہے جو اس لفظ کا صحیح اسلامی تصور و تقاضہ ہے تو پھر ایسی تلمیحات کو طنز و تعریض پر محمول کیا جائے گا۔

اس قسم کی طنزیہ تلمیحات دراصل شعراء کی شوخیاں، خوش مذاقیاں، معنیٰ آفرینیاں فنی شعبدہ بازی اور لفظیات کا کھیل ہوتا ہے کبھی کبھی جدتِ ادا، حسنِ تخیل مزاح اور محض اثر آفرینی مقصود ہوتی ہے کبھی غلط فہمیاں اور جرأتِ رندانہ اور جرأتِ فاسقانہ کا دخل بھی ہوتا ہے اس میں سنجیدگی نہیں ہوتی، شاعری کی ترنگ اور بسا اوقات یک گونہ بیخودی کا کرشمہ ہوتا ہے بہر حال ان کے لفظ اور معانی کے اعتبار سے انہیں اسلامی تلمیحات کے دائرے سے خارج تو نہیں کیا جا سکتا ہاں البتہ اسلام کا منفی نقطہ نظر قرار دے کر انہیں طنز و تعریض پر محمول کیا جائے گا مثال کے طور پر لاتعداد اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں کیونکہ شوخی و رندی یا رندانہ شوخی اردو شاعری کا ایک مستقل رجحان رہا ہے اس رجحان میں زاہد و محتسب اور واعظ و شیخ سے چھیڑ چھاڑ کا بھی کافی دخل ہے۔ اسلامی تلمیحات کے منفی رخ کے ترجمان چند اشعار مثالاً پیش کئے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

(غالب)

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی.... تھا

(غالب)

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
(غالب)

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
(غالب)

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
(غالب)

اسلامی تلمیحات مثبت و منفی دونوں انداز میں اردو شاعری کا حسن ہیں بڑی پسندیدہ و مقبول ہیں معانی کی ادائیگی کے لئے بڑی دقیق و لطیف، نہایت حسین و جمیل خوبصورت اور بڑی پر بہار و پر خیال ہیں اور فصاحت و بلاغت کے بھی اعلی مرتبہ پر فائز ہیں ان کی بنیاد حقیقت و صداقت پر ہے تلمیحات کے پورے سرمایہ میں اسلامی تلمیحات ہی سب سے زیادہ سچی کھری حقیقی اور واقعاتی ہیں ان میں فرضی واقعات یا محض تخیل کی کارفرمائی نہیں بلکہ حقائق کی صداقت ہے اسی لئے ان کا حسن ان کی حلاوت ان کی تاثیر بڑی گہری اور معنویت ہشت پہلو ہے اوران کا تأثر دیر تک قائم و برقرار رہتا ہے۔

اردو ادب میں مستعمل و معروف تلمیحات کے ایک سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچاس فیصد (۵۰٪) سے زائد تلمیحات اسلامی ہیں یعنی ان کا ثبوت قرآن و حدیث کی آیات و روایات سے ہوتا ہے یا وہ اسلامی تاریخ سے وابستہ ہیں یا اسلامی تصوف سے، اس کے ثبوت کے لئے تلمیحات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے تا کہ اسلامی تلمیحات کو دیگر تلمیحات سے علیحدہ و ممتاز کیا جا سکے مندرجہ ذیل جدول اس کا ثبوت

فراہم کرے گا اور اس سے اسلامی تلمیحات کی فہرست سازی کا عمل بھی مکمل ہو جائے گا۔

آب زمزم	آب کوثر	آتش طور
آتش نمرود	ابرہہ	ابن مریم
ابن ملجم	ابوجہل	ابولہب
ارنی	اژدر موسیٰ	اصحاب فیل
اصحاب کہف	اعجاز مسیحا	الم نشرح
اورنگ سلیماں	بردران یُوسف	برق تجلی
بوئے یوسف	بوئے پیرہن	بیت اللہ
پسر نوح	پنجۂ مریم	تجلئ طور
تخت بلقیس	تخت سلیماں	تعبیر یوسفی
جاء الحق و زھق الباطل	جلوۂ طور	جلوۂ سینا
چاہ یوسف	چشمۂ خضر	چشمۂ کوثر
چوب کلیم	حجر اسود	حرف استکبار
حرف یسئلون	حسن یوسف	خاتم سلیمانی
خاتم نبوت	خضر	خواب یوسف
دجال	دست موسیٰ	دست داؤد
دعائے خلیل	دم عیسیٰ	دیوار یتیم
ذبح عظیم	ذوالنورین	روز الست
رود نیل	زمرۂ لایحزنوا	زندان یوسف
زور حیدری ۔ زور اسد اللّٰہی	ساقئ کوثر	ساکنان عرش اعظم
سامری	سحر سامری	سد سکندر

سدِ یاجوج ماجوج   سدرہ   سگ اصحاب کہف

سلیماں   سلیمان اور چیونٹی   شجر ایمن

شجر خلد   شجر طور   شجر ممنوعہ

شراب طہور   شعلۂ ایمن   شعلۂ سینا

شعلۂ طور   شعلۂ نمرود   شرح صدر

شق صدر   شق القمر   شیش محل سلیمانی

صاحب الحوت   صاحب خلق عظیم   صبح حشر

صبر ایوب   صبر حسین   صدائے کن فیکون

صور اسرافیل   صوم مریم   ضرب کلیم

طارق کا سفینہ (کشتیاں جلانا)   طلسم سامری (سحر سامری)   طوفان نوح

عزیز مصر   عشرۂ مبشرہ   عشق زلیخا

عصائے کلیم (چوب کلیم)   عمر خضر   عمر نوح

فتح عظیم   فتح مبین   فرعون موسیٰ

قاب قوسین   قاصد سلیمان (مرغ سلیمان)   قارون

قصر سلیمان   قم باذن اللہ   کشتیٔ نوح

کف موسیٰ   کلیم اللہ   کن فیکون

کوہ طور   گلشن خلیل (گلشن ابراہیم)   لا تقنطوا

لاحول ولاقوۃ   لب عیسیٰ   لن ترانی

لوح محفوظ   لوح و قلم   ماہ کنعاں

مرغ عیسیٰ   من و سلویٰ   ناقۂ صالح

نخل مریم   نغمۂ داؤد   وادیٔ غیر ذی ذرع

هل من مزید	دوزخ	ہاروت ماروت
یاران نجد	یار غار	یاجوج ماجوج
		ید بیضا

اسلامی تلمیحات کا یہ ایک طائرانہ جائزہ ہے ان میں سے کم وبیش ہر تلمیح کے ثبوت کے لئے آیات واحادیث پیش کی جاسکتیں ہیں متعلقہ آیات واحادیث کا ذکر تلمیحات کے ذیل میں کیا جائے گا ان کے علاوہ قرآن واحادیث کی اور بھی تلمیحات ہیں اور ہو سکتی ہیں جو شعراء کے مطالعہ وحوصلہ کی متقاضی ہیں اور ان کی جولانیٔ طبع کے لئے ایک چیلنج بھی اور اظہار معانی کے لئے نازک ولطیف پیمانہ بھی!!

اسلامی تلمیحات کے مآخذ اور ان کا درجۂ استناد

اسلامی تلمیحات کی بنیاد اسلام کے ٹھوس حقائق وواقعات اور عقائد وتعلیمات پر ہے لہذا یہ بحث لازمی طور پر سامنے آئے گی کہ ان حقائق وواقعات اور عقائد وتعلیمات کے مآخذ کیا ہیں ان کا درجۂ استناد کیا ہے جب درجۂ استناد ٹھوس اور مضبوط ہوگا تبھی یہ دعوی بھی صحیح ہوگا کہ اسلامی تلمیحات کی بنیاد مشہورات وشائعات پر نہیں ہے ہر وہ تلمیح جس کا تعلق اسلامیات سے ہے اپنے پیچھے حقائق اور عقائد کا پورا ایک نظام ایک پس منظر رکھتی ہے۔

اسلامی تلمیحات کے چار بنیادی ستون ہیں قرآن کریم، نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ، یعنی کتب حدیث، اسلامی تاریخ کے مستند مصادر، تصوف اسلام (اسلامی تصوف) ان مآخذ ومصادر کا تعارف ضروری ہے۔

قرآن مجید: قرآن کریم وحی الہی ہے جو نبی کریم ﷺ پر ۲۳ سال کے طویل عرصہ تک موقع بموقع تدریجی طور پر نازل ہوتی رہی حتی کہ قرآن مجید مکمل ہوگیا اللہ کے

مقرب فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ وحی لے کر آتے رہے جن کا لقب روح القدس اور روح الامین ہے نبی کریم ﷺ پر غار حرا میں پہلی وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی:

اِقْرَاء بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقْ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقْ

(سورۂ اقراء آیت ا پ ۳۰)

"اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے انسان کو تخلیق کیا جمے ہوئے خون سے"

جب جبرئیل امین نے نبی کریمؐ سے کہا کہ "پڑھو اپنے رب کے نام سے" تو نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا "ما انا بقاری" "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں (میں پڑھنا نہیں جانتا) نزول قرآن کے بالکل آغاز ہی میں نبی کریم کا یہ ارشاد اس بات کی مکمل وضاحت تھی کہ دنیا جان لے کہ قرآن نبی کی تصنیف نہیں ہے آپ نے اپنے امی ہونے کا اظہار فرمادیا تھا نبی کریم کا جواب سن کر حضرت جبرئیل نے نبی کریم ﷺ کو تین بار اپنے سینہ سے لگا کر بھینچا تھا اس کے بعد نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک پر وحی الٰہی کے الفاظ جاری ہوگئے تھے نزول قرآن کے سلسلہ کی آخری وحی حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی جس کے الفاظ ہیں:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً. (سورۂ المائدۃ آیت ۳ پ ٦)

یہ آخری وحی دین اسلام کی تکمیل کی بشارت بھی تھی اور قرآن کریم کی تکمیل کا اشارہ بھی، یہ خدا کا آخری پیغام تھا جو دنیا کے لئے نازل ہوا تھا یہ آخری وحی تھی پہلی اور آخری وحی کے درمیان کا عرصہ نزول قرآن کا عرصہ ہے جو (۲۳) تیئس سالوں پر پھیلا ہوا ہے اس عرصہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس کاتبین وحی کی ایک جماعت مستقل رہا کرتی تھی جب جب وحی نازل ہوتی آپؐ ان کاتبینِ وحی میں سے کسی کو طلب فرما کر آیات

قرآنی تازہ بہ تازہ لکھوادیا کرتے تھے اور بسا اوقات یہ بھی فرمادیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں فلاں آیت کے بعد لکھ لو اس طرح نہ صرف آیات الٰہی عہد نبوی میں ہی لکھی جارہی تھیں بلکہ قرآن کریم کی ترتیب کا عمل بھی جاری تھا جتنا قرآن شریف نازل ہو چکا تھا حضرت جبرئیل ہر رمضان میں نبی کریم ﷺ کو اس کا دور بھی کراتے تھے جس سال نبی کریم کا وصال ہوا اس سال یہ دور دو مرتبہ ہوا اور اسی ترتیب پر ہوا جس ترتیب پر قرآن کریم موجود ہے اور آج تک اس میں کسی لفظ، کسی حرف بلکہ زیر زبر (اعراب) تک کی کوئی تبدیلی یا تحریف عمل میں نہیں آ سکی نہ آ سکتی ہے اس پر ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود ذات باری تعالیٰ نے قبول فرمائی ہے قرآن کریم کی گواہی موجود ہے۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ ٥

(سورۃ الحجر آیت ۹ پ ۱۴)

''ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''

قرآن کریم کے سلسلہ میں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے جسے اس نے اپنے فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ اپنے آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اس میں کوئی تحریف وتبدیلی نہ ہوئی ہے نہ آئندہ ہو سکتی ہے مسلمانوں کے دین وشریعت کی بنیاد یہی کتاب اللہ ہے یہی شریعت اسلامی کا مصدر ومنبع ہے اور رہتی دنیا تک کے لئے سارے انسانوں کی بھلائی ورہنمائی وہدایت کا مرجع ہے اس کا ادب واحترام واجب ہے بغیر وضو چھونا منع ہے اس کی تلاوت باعث ثواب ہے اس کی ایک ایک بات صحیح اور محقق ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اس کا پڑھنا اور یاد کرنا فرض کفایہ ہے اس کی آیات موجب شفا ہیں باعث خیر وبرکات ہیں یہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے اس میں عبرت وموعظت کے لئے سابقہ انبیاء

اوران کی امتوں کی عبرتناک تفصیلات ہیں ان پر جو عذاب نازل ہوئے اس کی خبر ہے عالم آخرت سے متعلق خبریں اور بشارتیں ہیں وعیدیں بھی ہیں ترغیب وترہیب کا سامان ہے جنت دوزخ برزخ اعراف وغیرہ کا ذکر ہے ساری انسانیت کی فلاح ورہنمائی کا سامان ہے اور بے شمار آیتیں مختلف معانی اور آفاق وانفس کی تفاصیل بیان کرتی ہیں اوران سب پر ایمان لانا ان سب کو سچا سمجھنا اور منزل من اللہ سمجھنا ضروری ہے ورنہ ایمان کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے قرآن کریم کے معانی تفسیری روایات اور آیات کے حوالے سے اردو شاعری میں بہت سی تلمیحات مستعمل ہیں اور یہ اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات کے لئے ایک زبردست معدن وماخذ ہے اوراس سے متعلق کوئی تلمیح فرضی وتخیلاتی نہیں ہے سب منزل من اللہ حقائق ہیں تاوقتیکہ شاعر منفی اور عکسی معنی مراد نہ لے۔

احادیث نبوی

نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال اور اعمال کو علوم اسلامی کی اصطلاح میں حدیث کہتے ہیں اصطلاح میں اسے اصلاً ''السنۃ'' کہا جاتا ہے یعنی نبی کریم ﷺ کا طریقہ واسوہ اردو میں اس کے لئے حدیث کی تعبیر مستعمل ہے عہد نبوی میں وقوع پذیر ہونے والے ایسے تمام واقعات جو نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش آئے ہوں یا آپؐ کو ان واقعات کی اطلاع دی گئی ہو اور دونوں صورتوں میں آپؐ نے اس واقعہ پر مثبت یا منفی کوئی حکم جاری نہ فرمایا ہو بلکہ خاموشی اختیار فرمائی ہو تو اس کو بھی (سکوت نبوی) حدیث شمار کیا جاتا ہے۔

نبوت کے بعد نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کا عرصہ ۲۳ سال ہے اس دوران پیش آنے والے حوادث وواقعات بے شمار ہیں اور خود نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال و اعمال وغیرہ لاتعداد ہیں نبی کریم ﷺ کا قول وفعل اور عمل امرِ تشریعی ہے یعنی شریعت کی حدود میں داخل ہے اس لئے صحابۂ کرام نے ان سب کو محفوظ رکھا نبی کریم ﷺ کے اقوال

افعال اعمال اور اوامر کی حفاظت کا یہ سلسلہ نسلاً بعد نسل چلتا رہا اور یہی سرمایۂ ذخیرۂ احادیث کی شکل میں کتب احادیث میں موجود و محفوظ ہے ابتداءً یہ سرمایۂ حدیث سینہ بہ سینہ زبانی روایات اور ذاتی تحریروں کی شکل میں محفوظ رہا لیکن پھر مزید اور مستقل حفاظت کے خیال سے اس کو کتابوں میں مدون کر لیا گیا علوم اسلامی میں تدوین حدیث اور اس سے پہلے صیانتِ حدیث کی باقاعدہ اور مستقل بحث ہے، حفاظتِ حدیث کا کیا طریقہ کار رہا؟ خود عہدِ نبوی میں اس کا کیا نظم تھا؟ عہد صحابہ میں اس کا کیا اسلوب رہا؟ اور عہد صحابہ کے بعد حفاظت حدیث کی کیا شکل تھی؟ تدوین حدیث کا مرحلہ کب شروع ہوا؟ اور جمع و تدوین کے لئے کیا شرائط و قیود کیا بنیادیں اور کیا اصول و ضوابط مقرر کئے گئے حدیث کا درجۂ اعتبار کیسے قائم ہوا؟ کن علماء نے احادیث کو کیسے کیسے جمع کیا اور حدیث کو پرکھنے کا کیا طریقہ ایجاد کیا وغیرہ وغیرہ بہت طول طویل اور عظیم علمی بحثیں ہیں جن پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے یہ ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ ہمیں ذخیرۂ احادیث کا درجۂ استناد بھی بیان کرنا ہے ان ضروری علمی بحثوں سے صرف نظر کر کے ہم حدیث کا درجۂ استناد قائم نہیں کر سکتے کیونکہ ہم حدیث پر مبنی تلمیحات کے لئے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرنا چاہتے ہیں اس لئے اس بحث کا جائزہ اور تعارف ضروری ہے۔

اس سے قبل کہ ہم صیانتِ حدیث کے لئے کی جانے والی کوششوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کریں ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دو حدیثوں کو ذہن نشین کر لیں کہ دراصل مثبت و منفی دونوں انداز میں خود نبی کریم ﷺ نے اس کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اور یہی دونوں حدیثیں جمع احادیث اور نقل احادیث کے سلسلہ کی بنیاد ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نضر الله عبدا سمع مقالتی فحفظها و وعاها و اداها کما سمع. او کما قال (مشکوٰۃ)

"اللہ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میری باتوں کو سنا ان کو یاد رکھا ان کی حفاظت کی اور جیسا سنا تھا اس کو دوسروں تک پہنچا دیا۔"

ایسے شخص کے لئے نبی کریم ﷺ کی دعائیہ بشارت ہے اس وجہ سے بھی صحابۂ کرامؓ احادیثِ نبویہ کو غور سے سنتے تھے اور یاد رکھتے تھے اور یاد رکھنے کے لئے آپس میں مذاکرہ کرتے تھے اور ایک دوسرے سے الفاظِ حدیث کا اور مفہومِ حدیث کا تاکد بھی کرتے تھے اور بعض صحابہ جو لکھنا جانتے تھے ان کو نوٹ بھی کر لیا کرتے تھے حفاظت حدیث کے مثبت و ایجابی پہلو کے لئے یہ حدیث بنیادی ہے

یہ حفاظت حدیث کے عظیم الشان سلسلہ کی بنیاد ہے اور اس میں دونوں پہلو ترغیب و ترہیب نمایاں ہیں اسی لئے صحابۂ کرامؓ نے بڑی وقت و احتیاط کے ساتھ حدیث کی حفاظت فرمائی صیانتِ حدیث کا یہ کام خود آپؐ کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا مختلف صحابۂ کرام حدیث سنتے یاد رکھتے اور لکھ بھی لیتے تھے اس کے علاوہ صحابۂ کرام کا ایک مخصوص گروہ جو اصحابِ صفہ کے نام سے معروف ہے عہدِ نبوی ہی میں جس نے اخذ حدیث اور حفاظت حدیث کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دی تھی یہ حدیث سیکھنے سکھانے یاد رکھنے اور پڑھنے والے اوّلین طالبعلم تھے جو مسجدِ نبوی سے متصل ایک چبوترے (صفہ) پر بیٹھ کر اس خدمت میں مشغول رہتے تھے اسی حیثیت سے صفہ مسجد نبوی کو علوم اسلامی کا پہلا مدرسہ بھی کہا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کی زندگی میں حفاظت حدیث کے دو طریقے ملتے ہیں ایک حفظ و یاد داشت اور دوسرا تحریری، اصحابِ صفہ کے علاوہ بھی خود حضورؐ کے عہد میں ہی صحابۂ کرام کا ایک گروہ ایسا ملتا ہے جو لب ہائے مبارکؐ سے نکلنے والی ہر بات کو بلفظہ یاد رکھنا اپنا فرض اور اپنی سعادت سمجھتا تھا چنانچہ ان کے پاس اقوال نبیؐ کا بہت بڑا ذخیرہ مکمل محفوظ تھا ان میں سات صحابۂ کرام ایسے ہیں جن سے بہت زیادہ روایات ملتی ہیں سرِ فہرست

حضرت ابو ہریرۃؓ کا نام ہے جن کا تعلق صفہ نبوی سے تھا ان کی بیان کردہ احادیث کی تعداد (۵۳۷۴) ہے اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عباس اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی روایاتِ حدیث کی تعداد بالترتیب اس طرح ہے (۲۶۳۰۔ ۲۲۸۶۔ ۲۲۱۰۔ ۲۶۶۰۔ ۱۵۴۰۔ اور ۱۱۷۰) صرف انہیں صحابہ کرام کی روایات کو دیکھا جائے تو مجموعی تعداد تقریباً (۲۰،۰۰۰) تک پہنچتی ہے اور یہ ایسی روایتیں ہیں جن کے درمیان کوئی سند کوئی واسطہ نہیں ہے یہ ساری احادیث براہ راست حضور ﷺ کی زبان مبارک سے سنی گئی ہیں۔

دوسرا ذریعہ حفاظت حدیث کا عہد نبوی میں تحریر تھا ''کتابت'' حضور ﷺ کے عہد مبارک تک رائج و معروف ہو چکی تھی کاتبینِ وحی کی ایک جماعت با قاعدہ حضور ﷺ کے پاس موجود رہا کرتی تھی اور حضور ﷺ نے خود اس ذریعہ (کتابت) کو استعمال کرنے کا حکم بھی فرمایا تھا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی مشہور روایت ہے۔

كنت أكتب كل شيء اسمعه عن رسول الله ﷺ اريد احفظه فنهتني قريش و قالوا تكتب كل شيء تسمعه و رسول الله ﷺ يتكلم في الرضاء و الغضب، فأمسكت عن الكتاب فذكرت ذلك لرسول الله ﷺ فأومى باصبعه الى فيه و قال اكتب فوالذى نفسى بيده ما يخرج منه الا الحق .

''عبداللہ بن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ سے جو کچھ سنتا سب لکھ لیا کرتا تھا تا کہ اسے یاد کر سکوں لیکن قریش نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ تم نبی کریمؐ سے جو کچھ سنتے ہو سب لکھ لیتے ہو حالانکہ حضور ﷺ کبھی خوشی کی حالت میں کوئی بات کہتے ہیں اور کبھی ناراضگی

کے ساتھ کوئی بات ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ میں نے لکھنا چھوڑ دیا اور حضور ﷺ سے سارا ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے اپنی انگلی سے دہان مبارک کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا لکھا کرو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے حق بات کے علاوہ کوئی اور بات نہیں نکلتی۔"

چنانچہ عہد نبوی میں ہی کتابتِ حدیث کے کئی مجموعے ملتے ہیں جو حضرت علی، حضرت انس، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کے پاس تحریری شکل میں موجود تھے ان سب تحریروں کا تاریخی ثبوت بخاری کتاب العلم، تہذیب التہذیب، طبقات، اور تذکرۃ الحفاظ جیسی مستند کتابوں میں ملتا ہے عہدِ نبوی کے بعد عہد صحابہ میں بھی کتابت حدیث کا تسلسل باقی رہا حضرت عمرؓ نے صحابۂ کرامؓ سے باقاعدہ مشورہ کر کے یہ حکم نافذ کر دیا تھا کہ "قیدو العلم بالکتاب" علم کو قیدِ تحریر میں لے آ ؤ عہد نبوی سے لے کر تیسری صدی ہجری کے وسط تک باقاعدہ کتابی شکل میں احادیث مدون ہو چکی تھیں موطا امام مالک، مسند امام احمد اور بخاری جیسی اہم اور بڑی کتابیں اسی دور کی ہیں اور ان کے علاوہ بھی مختلف ترتیبات پر احادیث کے مجموعے منظر عام پر آ چکے تھے ان ائمہ حدیث نے احادیث کی جمع و ترتیب میں جن شروط و قیود کا جن احتیاطات کا جن دقتوں کا خیال رکھا اور جن خدشات کی پیش بندی کی وہ بھی حیرت انگیز ہے تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کے ادوار میں نقلِ حدیث اور اخذِ حدیث میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اس کے لئے محدثین نے کئی ایسے علوم ایجاد کئے جو سرمایۂ حدیث نبوی کی حفاظت میں بے پناہ ممد و معاون ثابت ہوئے ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے لکھا ہے:

"پوری علمی دنیا کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی حیات طیبہ بلکہ ہر اس چیز اور ہر اس شخص

کے حالات کی جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی آپ ﷺ کی ذات مبارک سے تھا جس طرح حفاظت کی وہ انسانی تاریخ کا عجوبہ ہے۔

(فن اسماء الرجال ڈاکٹر تقی الدین ندوی)

صحابۂ کرام، تابعین تبع تابعین اور بعد کے رواۃ حدیث یعنی چوتھی صدی ہجری تک کے راویان حدیث کے احوال وآثار حاصل ہیں ان کے مجموعۂ احوال کا نام " فن اسماء الرجال " ہے حفاظت حدیث کی خاطر مسلم علماء ومحدثین نے جن علوم کو وجود بخشا دنیا اس پر بجا طور پر انگشت بدنداں ہے. علم الاسناد، علم الانساب، علم اصول حدیث، فن اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل وغیرہ سارے علوم حفاظت حدیث کی خاطر ایجاد ہوئے اور علم حدیث کے خادم کی حیثیت سے معروف ہیں ان علوم میں سے بیشتر کا تعلق سند حدیث سے ہے کیونکہ حدیث کے سلسلہ میں سند کی بڑی اہمیت ہے بلکہ اس کو حدیث کا جزء لاینفک تسلیم کیا گیا ہے تا کہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کی طرف کوئی بات بے سند منسوب نہ کی جا سکے اسی لئے سند نہ صرف حدیث کا جز بنا دی گئی بلکہ بعض ائمہ نے تو اس کو جزو دین قرار دیا ہے امام عبداللہ ابن مبارک کا قول ہے

الاسناد من الدین لو لا الاسناد لقال من شاء و ما شاء

''اسناد دین کا جزء ہیں کیونکہ اگر اسناد نہ ہوں تو جس کے جو جی میں آئے کہہ دے'' (ڈاکٹر تقی الدین ندوی اسماء الرجال)

ڈاکٹر تقی الدین ندوی سند کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حدیث کے دو جزء ہوتے ہیں ایک متن حدیث یعنی حدیث کا اصل مضمون، جن الفاظ میں بھی راوی نے بیان کیا ہو دوسرا جزء اسناد یعنی بالترتیب ان لوگوں کے اسماء جنھوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہو.... اسناد کو حدیث کا جزء بنا دیا گیا ہے اور بلا اسناد کے حدیث کو

قابلِ قبول ہی نہیں سمجھا گیا۔ (فن اسماء الرجال ص ۱۰۱/۱۱)

ذخیرۂ احادیث کی مشہور و متداول کتابیں چھ ہیں جن کو علمی اصطلاح میں صحاح ستہ کہا جاتا ہے ان میں اوّلیت کا مقام امام بخاری کی ''الجامع الصحیح'' کو حاصل ہے جسے امت نے متفقہ طور پر اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب قرار دیا ہے دیگر کتب حدیث میں صحیح مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور نسائی ہیں اس کے علاوہ احادیث کی دیگر مشہور کتب بھی موجود ہیں لیکن احادیث کی ان کتابوں میں باہم فرق اور درجہ بندی سند اور روایات کی تحقیق و تدقیق نیز تحلیل و تجزیہ کی بنا پر کی گئی ہے حدیث کی ان کتابوں میں نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کے سینکڑوں واقعات ہیں اسلامی تعلیمات ہیں احکامات ہیں عقائد کی تفصیلات ہیں غزوات ہیں اور اسلامی تعلیمات و تصورات کے بے شمار موضوعات ہیں جو ذخیرۂ احادیث میں خزانے کی طرح محفوظ ہیں ان کتابوں میں بیان ہونے والی ہر حدیث ہر واقعہ ہر بات سند مسلسل سے ثابت ہے اس لئے احادیث کا یہ ذخیرہ اسلامی تلمیحات کے لئے ایک قیمتی خزانہ اور معتبر ماخذ و مصدر ہے شعراء نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی تلمیحات کو حدیث کی صداقتوں سے منور و روشن بھی کیا ہے ظاہر ہے کسی حدیث کو یا حدیث کے مفہوم کو تلمیح کی شکل میں استعمال کرنے سے حدیث کی سند مسلسل اس تلمیح کے لئے بھی سند کا کام دے گی اور تلمیح کا درجۂ اعتبار بڑھ جائے گا شعراء نے اس ذخیرے سے استفادہ تو کیا ہے لیکن تناسب بہت کم ہے اور یہ بھی بالواسطہ ہے براہ راست نہیں اگر براہ راست صحیح فائدہ اٹھایا جائے تو شعراء بڑی اچھی قیمتی اور نایاب تلمیحات تراش سکتے ہیں اس کا بڑا مواد میسر ہے اب تو دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں احادیث کا ترجمہ بھی دستیاب ہے اور اردو ان میں سر فہرست ہے اور شعراء براہ راست فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

بہر حال مقرر کرنے ہوں گے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اسلامی تاریخ کا کوئی واقعہ جو عہد نبوی سے متعلق ہو اس کی تائید و تحقیق کے لئے کتب حدیث میں موجود روایات کی طرف رجوع کرنا ہوگا اگر کتب حدیث سے اس کی تائید و توثیق ہو جائے تو اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے گا۔

(۲) ایک ہی واقعہ کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو اور اس میں تضاد بھی نہ ہو تو ایسی روایات تاریخی اعتبار سے معتبر شمار ہوں گی۔

(۳) مختلف مؤرخین کوئی واقعہ نقل کریں اور باہم اختلاف بھی ہو تو متفق علیہ معتبر مؤرخین کی بیان کردہ تاریخی روایات معتبر ہوں گی۔

(۴) ایسے مؤرخین جن کی تاریخ نگاری کی صحت پر علمی حلقہ میں عام اتفاق ہو وہ معتبر و متفق علیہ مؤرخین شمار ہوں گے اور ان کی تاریخی روایات بھی معتبر ہوں گی۔

(۵) تاریخ کی ایسی روایتیں جن میں فخر و مباہات، مبالغہ، عقیدت، قوم پروری اور توہم پرستی اور داستان کے عناصر پائے جائیں قابل اعتبار نہیں ہیں۔

تصوف

اسلامی تلمیحات کا چوتھا بڑا ماخذ تصوف ہے تصوف کی تلمیحات اردو شاعری میں بہت کثرت سے مستعمل ہیں تصوف کی تلمیحات اکثر و بیشتر اصطلاحات تصوف یا اصطلاحات صوفیہ پر مبنی ہیں تصوف کی اصطلاحات اور صوفیا کی رمز و کنایہ سے پُر گفتگو کا سمجھنا آسان نہیں تھا اور نہ اب ہے کیونکہ تصوف کو ایک فلسفہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ تصوف کوئی فلسفہ نہیں اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے ایک سادہ اور آسان راہ عمل ہے لیکن صوفیاء کی رمزیہ گفتگو اور بہت سے معانی و محسوسات کو چند لفظوں میں سمیٹنے کی کوشش نیز ماورائی کیفیات کو لفظوں میں مقید کرنے کی ناکام کوشش اور نادیدہ مقامات و

مراتب کی تعیین اوران تک رسائی کی ناکام شعوری کوششوں کی وجہ سے تصوف اصطلاحات کا معدن ومخزن ضرور بن گیا ہے اور کثرتِ اصطلاحات کی بنا پر ہی اسے فلسفہ سمجھ لیا گیا ہے تصوف کی بیشتر تلمیحات کا تعلق اس کی اصطلاحات، صوفیا کے اقوال و احوال اور مسالک و مقامات سے ہے اس لئے فی نفسہ اس کا جاننا ضروری ہے کہ آخر تصوف کی حقیقت کیا ہے اور تصوف کسے کہتے ہیں تصوف میں رطب ویابس، لیت ولعل اور کشف و کرامات کا ایسا اژدحام ہے کہ واقعی وحقیقی تصوف ناپید ہو گیا ہے اور صوفی نما مجاوروں نے تصوف کے نام پر قبر پرستی کی دوکان سجا رکھی ہے حالانکہ قبروں، مزاروں اور درگاہوں کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے ایسے لوگوں نے شرک و اولیاء پرستی کا میلہ لگا کر خود تصوف کو بھی گمراہ وبدنام کر رکھا ہے عوام کے نزدیک جھاڑ پھونک، دعا تعویذ، مزارات پر حاضری وسجدہ ریزی، عملیات، کشف وکرامات اور مخصوص جبہ ودستار سجادہ ومصلی بلکہ عرس وقوالی تصوف کے لازمی اجزاء ہیں حالانکہ اصلی وحقیقی تصوف سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے مصنوعی صوفی ازم بالکل الگ چیز ہے اور تصوف اسلامی اس سے بالکل علیحدہ ہے اردو شاعری میں دونوں خلط ملط ہو گئے ہیں اصلی اور حقیقی تصوف کیا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی جو خود بھی کوچۂ تصوف کے راہ نورد تھے لکھتے ہیں:

> ''تصوف شریعت کا ایک محمود ومطلوب شعبہ ہے جسے شریعت کی اصطلاح میں تزکیہ واحسان کہا جاتا ہے اور یہی تزکیہ واحسان نبی کریم ﷺ کی خاص صفت بیان کی گئی ہے۔'' (تصوف اسلام)

وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ٥ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۹ پ ۱)

"اے ہمارے پروردگار ان میں انھیں میں کا ایک رسول بھیج دیجئے
جو ان لوگوں کو رب کی آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب کی اور
حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے بیشک آپ ہی قدرت
والے اور حکیم ہیں۔"

حدیث شریف میں اس کو "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی اسلامی تصوف کی بنیاد ہے مشہور حدیث حدیث جبرئیل میں ہے ایک مرتبہ حضور کی خدمت حضرت جبرئیل انسان کی شکل میں حاضر ہوئے اور دریافت فرمایا ایمان کیا ہے آپؐ نے اس کا جواب عنایت فرمایا پھر دریافت فرمایا اسلام کیا ہے آپؐ نے اس کا بھی جواب عنایت فرمادیا تو پھر دریافت فرمایا کہ احسان کیا ہے اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو (گویا اس کے روبرو کھڑے ہو) اور اگر اس طرح نہیں کر سکتے تو اس طرح کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے "ان تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك" یہ فقرہ اور عبادت میں یہ استحضار و معیار یہ تصور صحیح اسلامی تصوف کی بنیاد ہے کیونکہ اس حدیث میں زبان نبوت سے ایمان واسلام کی تشریح و وضاحت ہو جانے کے بعد پھر احسان کو دریافت کیا گیا ہے اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ احسان دراصل ایمان واسلام کی تکمیلی شان کا نام ہے کوئی آدمی اسلام لے آئے اور کلمہ پڑھ کر ایمان قبول کرلے تو وہ مسلم تو ہو جاتا ہے لیکن اسے ایمانِ کامل کا درجہ نہیں حاصل ہوتا اسی لئے اس کو مومن نہیں کہا جاتا قرآن کریم میں سورۃ الحجرات میں اس کی صراحت بھی موجود ہے قبائل عرب کے کچھ لوگ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم ایمان لے آئے اس پر آیت نازل ہوئی۔

قَالَتِ الاَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا
وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ

رَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ
الرَّحِیْمٌ (سورۃ الحجرات آیت ۱۴ پ ۲۶)

"یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے آپ کہ دیجئے کہ تم ایمان
نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے اور جب ایمان تمہارے
دلوں میں داخل ہو جائے اور تم (دل سے) اللہ اور اس کے رسول کی
اطاعت کرنے لگو تو اللہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا"

تنبیہ کے انداز میں کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ ابھی تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوا اس لئے یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے جب ایمان تمہارے دل میں اتر جائے گا صحیح معنی میں تب تم یہ کہنے کے قابل ہو سکو گے کہ ہم ایمان لے آئے جب مسلمان کا ایمان پختہ اور کامل و مکمل ہو جاتا ہے تو وہ مومن کے درجہ پر فائز ہوتا ہے اسی طرح جب ایمان اور اسلام دونوں درجہ کمال تک پہنچتے ہیں تب ولایت کا آغاز ہوتا ہے اور ولی اللہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے یعنی اسے اللہ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اللہ کے اسی قرب کو حاصل کرنے کا نام اصطلاح عوام میں تصوف ہے اور حدیث میں اسے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اسلام اور ایمان سے آگے کا درجہ احسان ہے جو شرعاً محمود و مطلوب ہے اس کے حصول کے لئے کوشش کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے راستے اور طریقے بھی بتائے گئے ہیں حصول احسان کے انہیں راستوں کو عرف عام میں یعنی تصوف کی اصطلاح میں "طریقت" کہا جاتا ہے یہ شریعت کی تکمیل کی اعلیٰ شان ہے صوفیاء کرام نے جس کی تفصیلات بیان کی ہیں اور تقرب الی اللہ کا ایک مخصوص طریقہ کار مقرر کیا ہے اسی مخصوص نظام اور طریقہ کار کی جزئیات و اصطلاحات و اور مدارج و مقامات عام طور پر اردو شاعری میں بطور تلمیح مستعمل ہیں اور شعراء کے لیے تصوف ایک مستقل ماخذ و مصدر ثابت ہوتا رہا ہے حتی کہ ایک مستقل مقولہ بن گیا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است.......

تلمیحات قصۂ آدم علیہ السلام

۱- آدم (تخلیق آدم)
۲- ملائکہ۔ سجدۂ ملائکہ
۳- حضرت حوا علیہا السلام
۴- گناہِ آدم
۵- بہشت
۶- دانۂ گندم
۷- خروج بہشت
۸- ھبوط علی الارض۔ نزول دنیا۔ ملاقات حوا آدم
۹- ابلس۔ غرور وتکبر۔ وساوس ابلیس۔ جن
۱۰- ہابیل
۱۱- قابیل
۱۲- ابتدائے قتل انسانی
۱۳- غراب
۱۴- موت کا آغاز
۱۵- تدفین کا طریقہ

عالمی سطح پر مختلف زبانوں کا ادب قرآن کریم کے اثرات سے معمور ہے، خصوصاً عربی فارسی، ترکی اور اردو زبان پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ اِن زبانوں کے ادب میں قرآن کریم ایک مستقل ادبی مآخذ و مصدر ہے اور اردو ادب میں قرآن کریم سے استفادہ ایک مسلمہ ادبی روایت ہے۔ اردو زبان وادب پر قرآن کریم کا دائرہ اثر مختلف ومتنوع ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔ اردو شعروادب کی تلمیحات کے باب میں بھی قرآن کریم کے اثرات بہت متنوع اور وسیع ہیں قرآن کریم سے اخذ کردہ تلمیحات اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ تلمیحات کا بڑا ذخیرہ قرآنی تلمیحات پر ہی مشتمل ہے۔

اردو شاعری میں مستعمل قرآنی تلمیحات کو عمومی اعتبار سے دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلی قسم وہ ہے جس میں شعراء نے قرآن کی کسی آیت کو یا آیت کے کسی جز کو براہ راست شعر کا جز بنالیا ہو اور وہی مخصوص معانی کی ترسیل کا ذریعہ ہو جیسے "قل العفو" "ینسلون" "مازاغ" "رفعنا لک" "ذکرک" "قاب قوسین" اور "مسّنی الضر" وغیرہ۔

قرآنی تلمیحات کی دوسری قسم وہ ہے جس میں شعراء نے قرآنی تعلیمات وعقائد، آیات کے تراجم اور قرآنی قصص وواقعات سے استفادہ کرتے ہوئے کوئی مخصوص تلمیح تراشی ہو۔

قرآن کریم کی پہلی قسم یعنی براہ راست قرآنی آیت یا آیت کے کسی جز کو تلمیح بنانا اردو کے چند مخصوص شعراء تک ہی محدود ہے۔ جن میں سرفہرست علامہ اقبالؒ ہیں، جن کے یہاں اس قسم کی تلمیحات بہت زیادہ ہیں بلکہ اقبال کی قرآنی تلمیحات پر مستقل

کتابیں موجود ہیں جن میں اس قسم کی تلمیحات کی تفہیم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مؤخر الذکر قرآنی تلمیحات اردو شاعری میں بکثرت رائج و منقول ہیں، اردو کے اکثر شعراء کے یہاں قرآنی تلمیحات کی یہی دوسری قسم دلچسپ ادبی روایت ہے اور تلمیح کے حوالہ سے ہی یہ بات منقول ہیں اردو کے اکثر شعراء کے یہاں قرآنی تلمیحات کی یہی دوسری قسم دلچسپ ادبی روایت ہے اور تلمیح کے حوالہ سے ہی یہ بات زیادہ مستند ہوتی ہے کہ قرآن کریم سے ادبی استفادہ اردو شاعری کا ایک مستقل رجحان اور مسلمہ ادبی روایت ہے بلکہ یہ ایک طاقتور و مستند ادبی ماخذ ہے دونوں ہی قسم کی قرآنی تلمیحات اسلامی تلمیحات کے ذیل میں آتی ہیں یہاں مؤخر الذکر قرآنی تلمیحات کا پس منظر اور تفصیلات فراہم کی گئی ہیں اور الگ الگ واقعات کے پس منظر میں متنوع تلمیحات کا جائزہ لیا گیا ہے کیونکہ اردو شاعری میں انہی تلمیحات کی کثرت ہے۔

قرآنی تلمیحات

تلمیحاتِ قصہ آدم علیہ السلام

حضرت آدم خدا کے برگزیدہ نبی تھے جنھیں اس کائنات کا انسانِ اوّل قرار دیا گیا ہے وہ سارے انسانوں کے مورث اعلیٰ ہیں کائنات میں انسانی آبادی کا سلسلہ براہِ راست انھیں سے شروع ہوا اس حیثیت سے انھیں ابوالبشر بھی کہا جاتا ہے حضرت آدمؑ کو سارے انسانوں میں یہ شرف وفضیلت بھی حاصل ہے کہ وہ زمین پر نہیں پیدا کئے گئے بلکہ آسمانوں پر خالقِ کائنات نے خود انھیں اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور امرکُن سے پیدا کیا اور ان کے سر پر خلافتِ الٰہی کا تاج رکھ کر انھیں نیابتِ الٰہی کا علمبردار بنادیا۔ حضرت آدمؑ کی پیدائش دراصل تخلیق کے مرحلہ سے گزر کر عمل میں نہیں آئی بلکہ تعمیر و تکوین کے مرحلے سے گزر کر یہ انسانی پیکر تیار ہوا تو سارے ملائکہ سے اعترافِ عظمت کی خاطر سجدۂ تعظیمی کرایا گیا پھر دنیا میں بھیج دیا گیا۔

حضرت آدم کی تخلیق ایک عظیم الشان واقعہ ہے جو کائناتِ انسانی کے عظیم انقلابات کا پیش خیمہ بننے والا تھا اس کائنات کے خالق نے اسے ایک عظیم مقصد کے لئے وجود بخشا تھا چنانچہ اس وقت کی موجود مخلوق یعنی ملائکہ کو اللہ تعالی نے اس کی پیشگی خبر بھی دی تھی قرآن کریم کی کئی آیات میں اس کا ذکر ہے اور یہی آیات تخلیق آدم کے

یہ بھی فرما دیا تھا کہ جب میں اس کو بنالوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ (سورۂ حجر آیت ۲۹ پ ۱۴)

"جب میں اسے بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔"

یہ ہے تخلیق آدم علیہ السلام کا پس منظر جو ملاء اعلیٰ میں باری تعالیٰ اور ملائکہ کے درمیان مکالماتی شکل میں ہے یہ مکالماتِ ربانی وحی الٰہی کے ذریعہ نبی کریم ﷺ پر بشکلِ قرآن نازل کئے گئے قرآنِ کریم ہی کے مطالعے سے ہمیں حضرتِ انسان کے تخلیقی پس منظر کا علم ہوتا ہے اور اس یقین پر مسرت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ جنت سے تشریف لائے تھے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور دنیا میں ان کی آمد کی تاریخ و تحقیق کے لئے ہمارے پاس قرآن کریم اور احادیثِ نبویؐ سے بڑھ کر کوئی معتبر و مستند ماخذ نہیں ہے اس کی ایک منطقی وجہ بھی ہے کیونکہ حضرت آدمؑ انسانِ اوّل تھے بقیہ سارے انسانوں کی پیدائش ان کے بعد ہوئی اس لئے خود ان کی تخلیق و پیدائش کے بارے میں سوائے خالق البشر کے کسی اور کی کوئی بات معتبر نہیں ہو سکتی کسی اور کی بات اس لئے بھی قابلِ اعتبار نہیں ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق یعنی جائے پیدائش یہ زمین یہ دنیا ہے ہی نہیں جو ان کے بعد کے انسانوں کی تحقیقات کا میدان ہے ان کی ساری تحقیقات اجتہادات اور تلاش و جستجو کا محور یہی زمین ہے جبکہ آدمؑ کی تخلیق کا تعلق کائناتِ ارضی سے ہے ہی نہیں اس لئے بھی ہم قرآنِ کریم کی بیان کردہ تفصیلات ہی کو اصل ماننے پر مجبور ہیں اور یہی صحیح ہے کیونکہ یہ خود خالق بشر کی بیان کردہ تفصیلات ہیں قرآن کریم کے بیان کردہ دیگر تمام قصوں کی طرح قصہ آدم و ابلیس کے بیان کا مقصد بھی انسانی رشد و ہدایت اور عبرت و موعظت

سلسلہ کی بنیاد ہیں:

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَراً مِنْ طِیْنٍ ٥

(سورۂ ص آیت ۷۱ پ ۲۳)

"اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان بنانے والا ہوں۔"

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌ م بَشَراً مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ٥ (سورۂ حجر آیت ۲۸ پ ۱۴)

"اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں گوندھی ہوئی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک انسان بنانے والا ہوں"

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ٥ (سورۂ البقرۃ آیت ۳۰ پ ۱)

"اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم سے قبل ہی جب فرشتوں کو مطلع کیا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور وہ خلیفہ نہ جنات میں سے ہوگا نہ ملائکہ میں سے بلکہ وہ ایک نئی مخلوق ہوگی جسے بشر اور انسان کہا جائے گا۔ فرشتوں نے ربِ کائنات کی اس اطلاع پر عرض کیا بارِالٰہ ہم تو تیری عبادت کرتے ہی ہیں اور ہمہ وقت تیری حمد وثنا کرتے رہتے ہیں تو جو مخلوق بنانے والا ہے کہیں وہ تیری زمین پر خونریزی نہ کرے اور فساد نہ پھیلا دے......! فرشتوں کی اس گفتگو کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ ہمارے علم میں ہے تم نہیں جانتے یعنی معاملہ عبادتِ الٰہی کا نہیں بلکہ خلافتِ الٰہی کا ہے اور خلافت کے لئے جس قسم کی صلاحیتیں درکار ہیں تم ان سے عاری ہو اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے

یہ بھی فرما دیا تھا کہ جب میں اس کو بنالوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔

فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ ○ (سورۂ حجر آیت ۲۹ پ ۱۴)

"جب میں اسے بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔"

یہ ہے تخلیق آدم علیہ السلام کا پس منظر جو ملاء اعلی میں باری تعالیٰ اور ملائکہ کے درمیان مکالماتی شکل میں ہے یہ مکالمات ربانی وحی الٰہی کے ذریعہ نبی کریم ﷺ پر بشکل قرآن نازل کئے گئے قرآن کریم ہی کے مطالعے سے ہمیں حضرت انسان کے تخلیقی پس منظر کا علم ہوتا ہے اور اس یقین پر مسرت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے مورث اعلی جنت سے تشریف لائے تھے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور دنیا میں ان کی آمد کی تاریخ و تحقیق کے لئے ہمارے پاس قرآن کریم اور احادیث نبویؐ سے بڑھ کر کوئی معتبر و مستند ماخذ نہیں ہے اس کی ایک منطقی وجہ بھی ہے کیونکہ حضرت آدمؑ انسان اوّل تھے بقیہ سارے انسانوں کی پیدائش ان کے بعد ہوئی اس لئے خود ان کی تخلیق و پیدائش کے بارے میں سوائے خالق البشر کے کسی اور کی کوئی بات معتبر نہیں ہو سکتی کسی اور کی بات اس لئے بھی قابل اعتبار نہیں ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق یعنی جائے پیدائش یہ زمین یہ دنیا ہے ہی نہیں جو ان کے بعد کے انسانوں کی تحقیقات کا میدان ہے ان کی ساری تحقیقات اجتہادات اور تلاش و جستجو کا محور یہی زمین ہے جبکہ آدمؑ کی تخلیق کا تعلق کائنات ارضی سے ہے ہی نہیں اس لئے بھی ہم قرآن کریم کی بیان کردہ تفصیلات ہی کو اصل ماننے پر مجبور ہیں اور یہی صحیح ہے کیونکہ یہ خود خالق بشر کی بیان کردہ تفصیلات ہیں۔ قرآن کریم کے بیان کردہ دیگر تمام قصوں کی طرح قصۂ آدم و ابلیس کے بیان کا مقصد بھی انسانی رشد و ہدایت اور عبرت و موعظت

ہی ہے اسی کے ساتھ ساتھ خالقِ کائنات کی عظمت و بزرگی کا اعتراف اور اس کے احکام وشریعت کی پابندی بھی ان قصص کا خاص مقصد ہے آدمؑ کا ذکر بھی اسی پس منظر میں ہے یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس سے تخلیق آدمؑ اور عظمتِ انسان کے سلسلہ کی معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

انسان کا وجود مٹی سے ہے کیونکہ آدم کا قالب اللہ تعالیٰ نے مٹی سے بنایا تھا قرآن کریم نے اس کے لئے طین ، صلصال ،حماء مسنون ، صلصال کالفخار ، اور تراب کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں یہ الفاظ مختلف ہیں لیکن اصل ایک ہی ہے یعنی مٹی۔ آدم کی تخلیقی اصل یہی ہے اور یہ تمام الفاظ تکوینِ آدم کے مختلف مراحل پر دلالت کرتے ہیں خشک مٹی تراب اور طین خاک کے معنی میں ہے جب اس کو گوندھ دیا جاتا ہے تو وہ گیلی ہو کر حماء یعنی گارا بن جاتی ہے اور جب اس گارے سے کوئی وجود تشکیل دیدیا جاتا ہے تو وہ سوکھ کر صلصال بن جاتی ہے یعنی اس میں کھنکھناہٹ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ مٹی نہیں رہتی بلکہ پختہ ہو کر پتھر کے مماثل بن جاتی ہے تخلیق آدم کے سلسلہ کے ان تمام مراحل کا ذکر ایک حدیث میں تفصیل سے آیا ہے جسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے:

> عن أبی هريرة رضی الله عنه أنّ رسول الله ﷺ قال ان الله خلق آدم من تراب ثم جعله طينا ثم تركه حتى اذا كان حماً مسنونا خلقه الله و صوره ، ثم تركه حتى اذا كان صلصالاً كالفخار قال فكان ابليس يمرّ به فيقول لقد خلقت لأمر عظيم ......! (الترمذی، حسن غریب)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو خاک سے پیدا کیا پہلے اس مٹی کو گیلا کر کے

چھوڑ دیا جب وہ گارے کی شکل میں مہک اٹھی تو ان کا پتلا بنایا اور
صورت گری کی پھر ایک عرصہ تک چھوڑ دیا حتی کہ وہ سوکھ کر کھنکھنا اٹھی
اس دوران ایک بار ابلیس کا ادھر سے گزر ہوا تو وہ اس پتلے کو دیکھ کر
کہنے لگا یقیناً تمھیں کسی عظیم مقصد کی خاطر بنایا جا رہا ہے......!

اس حدیث کے علاوہ امام بخاریؒ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی تخلیق کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کر کے ایسی تمام احادیث کو جمع کر دیا ہے جن سے تخلیق آدم کے مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے اس قسم کی تمام آیات واحادیث کی روشنی میں یہ بات بڑی وضاحت و تفصیل سے سامنے آتی ہے کہ آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے دستِ قدرت سے بنایا پہلے مٹی سے ان کا مجسمہ تشکیل دیا پھر اس میں تمام ضروری صلاحیتیں ودیعت کیں اور اس مجسمہ میں روح پھونک کر انھیں زندہ و متحرک وجود بنا دیا۔

آدم کی تخلیق میں دستِ قدرت کی کارفرمائی مٹی کا وجود، فرشتوں کا سجدۂ تعظیمی، ابلیس کا سجدہ سے انکار، رفاقت کے لئے حضرت حوا کی پیدائش، بہشت میں رہائش، شجر ممنوعہ کا استعمال، ارتکابِ خطا، بہشت سے خروج، زمین پر نزول، نسلِ انسانی کی ابتداء، معمورۂ جہاں کی آبادی، ابلیس کی عداوت، اس قصہ کی ماورائی کشش، عجب و اسرار، ملکوتی و ابلیسی عناصر اور ذاتِ باری تعالیٰ کی نیابت و خلافت جیسے عظیم و پر اسرار کرداروں نے اردو شعراء کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور سینکڑوں اشعار اس قصہ کی تلمیحات سے مزین ہیں اس قصہ کے الگ الگ کردار سے متعلق الگ الگ تلمیحات ملتی ہیں اس لئے ان تمام عناصر اور تمام کرداروں کی تفصیل جاننا ضروری ہے تا کہ ان تلمیحات کا صحیح لطف حاصل ہو اور یہ طے کیا جا سکے کہ شعراء نے ان تلمیحات کے سہارے جو معانی تراشے ہیں اور جن خیالات کو پیش کیا ہے ان کی اصل کیا ہے ان معانی کے لئے گنجائش کہاں سے اور کیسے نکلتی ہے اسی تصور کے پیشِ نظر قصۂ آدمؑ کے ہر کردار پر الگ الگ روشنی

ڈالنا ضروری ہے تخلیق آدم کی بحث اوپر مذکور ہوئی اسی سے متعلق ملائکہ کی بحث ہے۔

ملائکہ اور سجدۂ ملائکہ

ملک (لام کے زبر کے ساتھ) فرشتے کو کہتے ہیں ملائکہ اس کی جمع ہے یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ایک مخلوق ہے جو جن وانس سے قطعاً مختلف ہے یہ ایک قسم کی نورانی مخلوق ہے جس کا ادراک نہیں ہوسکتا ہمیں صرف اس پر یقین کا مکلّف قرار دیا گیا ہے یہ ایمان کا تکمیلی جز ہے اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کائنات میں مختلف ذمہ داریوں کا مکلّف قرار دیا ہے بیشتر کی ذمہ داری صرف خالق کائنات کی عبادت اور اس کی حمد وثناء ہے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

> "قصۂ آدم کے علاوہ بھی قرآن کریم کی بہت سی آیات میں فرشتوں کا ذکر ہے جن سے کئی فرشتوں کے نام اور کام کا بھی پتہ چلتا ہے اور کہیں کہیں ان کی ہیئت و طاقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے مثلاً مندرجہ ذیل آیات:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ٥ (سورۂ البقرۃ آیت ۹۸ پ ۱)

"جو دشمن ہوا اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور جبرئیل کا اور میکائل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔"

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ٥

(سورۂ النحل آیت ۲ پ ۱۴)

"وہ اتارتا ہے فرشتوں کو اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر

چاہتا ہے کہ وہ ڈرائیں اور وہ کسی کی بندگی نہ کریں میرے سوا سو مجھ سے ڈریں۔"

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلاً اُولِیٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلاثَ وَ رُبٰعَ ○

(سورۃ الفاطر آیت ۱ پ۲۲)

"تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے وہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پروالے بازو ہیں۔"

وَالْمَلَكُ عَلٰٓی اَرْجَآئِهَا وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ○ (سورۃ الحاقۃ آیت ۱۷ پ۲۹)

"اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور اس دن تمہارے رب کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔"

قرآن کریم میں ملک یا ملائکہ کا ذکر ۸۶ آیات میں ۸۸ مرتبہ آیا ہے اس کے علاوہ دیگر آسمانی کتب توراۃ زبور انجیل میں بھی ان کا ذکر موجود ہے اور بہت سی احادیث بھی فرشتوں کے مستقل مخلوق ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان کا مسکن آسمان ہے اور ساری کائنات میں وہ خدا کی حمد وثنا بیان کرتے رہتے ہیں اور اپنی اپنی ذمہ داریاں بجا لاتے ہیں ان کا وجود انسانی آنکھوں سے اوجھل ہے یہ پروردگار کی سب سے مقرب اور خاص مخلوق ہے انہی فرشتوں کے ذریعہ ہی انبیاء اور رسولوں پر وحی الٰہی نازل ہوتی ہے یہی فرشتے خالق کائنات اور انسانوں کے درمیان پیغام رسانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں وحی کی خدمت کے لئے جو فرشتہ خاص ہے اس کا نام جبرئیل ہے جو صور پھونک کر محشر بپا کرے گا اس کا نام اسرافیل اور موت کے فرشتے کا نام عزرائیل ہے قبر میں سوال

جواب کے لئے آنے والے فرشتوں کا نام منکر نکیر ہے اور انسانی اعمال نامہ تیار کرنے والے فرشتوں کا نام کراماً کاتبین ہے وغیرہ وغیرہ بعض فرشتوں کے نام اور کام کا علم قرآن اور حدیث سے ہوتا ہے اسی عظیم نورانی مخلوق سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سجدہ کروایا تھا تخلیقِ آدم کے بعد جسے خالقِ کائنات نے خود بشر اور انسان کا نام دیا تھا اسی بشر اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے سجدہ کرایا تھا یہ عظمتِ آدم اور آدم کے توسط سے عظمتِ انسانی کا اظہار تھا کیونکہ اسی انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض ہونا تھا اسی کے سر پہ اشرف المخلوقات کا تاج رکھا جانا تھا نیابت الٰہی کی عظیم خدمت کے لئے اسے خصوصی صلاحیتوں سے نوازا گیا علم وحکمت سے سرفراز کیا گیا ارادہ واختیار کی دولت عطا کی گئی فکر وخیال کی صلاحیت ملی عقل ودانش کا خزانہ عطا کیا گیا قوتِ حرکت وعمل اس کی سرشت میں داخل کی گئی جب ان سب صلاحیتوں سے نواز دیا گیا تب اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا اور یہ سجدہ سجدۂ تعظیمی تھا فرشتوں کی زبانی حضرت آدم کی عظمتِ شان کا اعتراف تھا سجدہ عبادت نہیں تھا فرشتوں کے اسی سجدۂ تعظیمی کی بنیاد پر عظمتِ آدم کا تصور پیدا ہوتا ہے اور عظمت انسانی کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ فرشتے آسمانی مخلوق ہیں اور حضرتِ آدمؑ زمینی مخلوق بننے والے تھے آسمانی مخلوق فرشتوں نے ارضی مخلوق انسان کو سجدہ کیا یہ بجائے خود ایک عظمت ہے لیکن یہ سب قیاسات ہیں کیونکہ فرشتوں نے تو محض امر رب سے سجدہ کیا تھا اللہ کا حکم مان کر سجدہ کیا تھا قرآن کریم میں براہ راست اس کی صراحت نہیں ملتی کہ انسان کی عظمت کے اعتراف کی خاطر فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا ہو ہاں امر رب سے یہ عظمت جھلکتی ضرور ہے اور شیطان کے سجدہ نہ کرنے پر اس کی گرفت اور مواخذے سے بھی عظمتِ انسانی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور بطور دلیل یہ بات ضرور پیش کی جاسکتی ہے۔

قرآن کریم کی مختلف آیات میں حضرت آدمؑ کے سامنے فرشتوں کے سجدہ کا

ذکر ہے بلکہ آیات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے وجودِ حقیقی میں آنے سے پہلے ہی اللہ رب العزت نے جب آدم کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو فرشتوں کو سجدہ کا حکم دے دیا تھا درج ذیل آیت میں اس کی صراحت موجود ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَراً مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَسْنُوْنٍ o فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ o فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَةُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ o اِلاَّ اِبْلِیْسَ اَبٰیٓ اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ o

(سورۃ الحجر آیت ۳۱/۲۸ پ ۱۴)

''اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا میں ایک انسان بنانے والا ہوں کھنکھناتی ہوئی مٹی سے جس کا گارا مہک اٹھا ہے پس جب میں اس کو بنا لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا سو تمام فرشتے سجدہ ریز ہو گئے لیکن ابلیس نے انکار کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو۔''

دوسری آیت ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلاَّ اِبْلِیْسَ لَمْ یَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ o

(سورۃ الاعراف آیت ۱۱ پ ۸)

''یقیناً ہم نے تمہیں پیدا کیا تمہاری شکل وصورت بنائی پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو چنانچہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں نہیں تھا۔''

ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات میں فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ

کرنے کا حکم ہے اور اسی حکم کے بعد اس کی صراحت بھی ہے کہ فرشتوں نے حکم مان کر سجدہ کیا بس ابلیس لعین نے سجدہ نہیں کیا جس کا استثناء ہر جگہ موجود ہے بقیہ آیات کا ذکر انکارِ ابلیس کے ذیل میں آئے گا یہاں ملائکہ، سجدۂ ملائک آدم اور عظمتِ آدم کی تلمیحات پر مشتمل اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان تلمیحات کی معنویت وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوگا شعراء نے ان تلمیحات کے سہارے کہاں تک رسائی حاصل کی ہے اور کیسے کیسے نادر خیالات تراشے ہیں:

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برھم ہے
تھا جو مسجود ملائک یہ وہی آدم ہے (اقبالؔ)

توڑ ڈالیں فطرت انسان نے زنجیریں تمام
دورئی جنت سے روتی چشم آدم کب تلک (اقبالؔ)

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے (اقبالؔ)

اسی طلسم کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اس کی ہیں ابتک بتان عہد عتیق (اقبالؔ)

آدم اس دام میں پھنسا سودا
رکھے دانے سے خوشہ چیں اخلاص (سوداؔ)

آدم کا جسم جبکہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا (سوداؔ)

سجدہ آدم کو فرشتوں نے کیا خوب کیا
قدرت اللہ کی ظاہر ہوئی ہے انساں سے (آتشؔ)

ہووے اگر حقیقت آدم سے مطلع

شیطاں ہو منفعل عمل نا صواب سے (آتش)

خلد ہے جلوۂ آدم سے ابھی تک سرشار

دل میں اک دھوم ہے نکلے ہوئے ارمانوں کی (تابش دہلوی)

نئے جہاں بسائے ہیں فکر آدم نے

اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے (ساحر لدھیانوی)

شاہِ بحر وبر بنو تخلیق آدم کی قسم

شاہِ بحر وبر بنو تخلیق آدم کی قسم (جوش ملیح آبادی)۔

اپنے دل کی قوت تسخیر عالم کی قسم

جس نے سجدہ کیا نہ آدم کو

شیخ کا پوجتا ہے بابایاں پاؤں (سودا)

اس خابے کو تو گلزار بنانا تھا اُسے

ورنہ آدم کو زمیں پر نہیں پھینکا جاتا (منوررانا)

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر

آہ وہ زندانی نزدیک ودور و دیر و زود (اقبالؔ)

حرف استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا

ہاں مگر مشیت میں نہ تھا میرا سجود (اقبالؔ)

حضرت حوا علیہا السلام: حضرت آدم کی رفاقت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور انسانی وجود تخلیق کیا جو اپنی تشکیل کے اعتبار سے قدرے مختلف تھا اس تخلیقی فرق کی وجہ سے ایک کو مرد ایک کو عورت سے تعبیر کیا گیا بحیثیت انسان دونوں کا وجود یکساں تھا حضرت آدمؑ اپنی نوعیت کی واحد مخلوق تھے جو فرشتوں اور جنات سے جدا تھی اسی انفرادیت کی وجہ سے انھیں ایک قسم کی وحشت اور خلا محسوس ہوتا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت

سے ان کے لئے ایک ہمدم و رفیق پیدا فرما دیا اور حضرت حوا کو وجود بخشا حضرت آدمؑ حضرت حواؑ کی رفاقت سے خوش ہو گئے اور ان کے ساتھ جنت میں رہنے لگے۔

حضرت حوا کی تخلیق کیسے عمل میں آئی ؟ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں صرف اتنا مذکور ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ
وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ۝ (سورۃ النساء آیت ا پ۴)

''اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (نفس)
سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا تخلیق کیا۔''

نسلِ انسانی کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے چلتا ہے حضرت آدمؑ ہی نفسِ اوّل تھے جن سے ان کا جوڑا پیدا کیا گیا اور ان کا جوڑا حضرت حوا تھیں جنھیں حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے قرآن کریم کی اس آیت ''خلق منها زوجها'' کی روشنی میں یہ نظریہ کلی طور پر رد ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو الگ الگ مخلوق پیدا کیں ایک مرد ایک عورت ایسا نہیں ہے بلکہ مرد ہی کی جنس سے ایک اور صنف انسانی کو وجود بخشا جسے عورت کہا جاتا ہے عورت بھی انسان ہی ہے کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے بائیبل اور توراۃ وغیرہ میں ہے کہ حضرت حوا کو آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے حدیث شریف سے بھی کسی حد تک اس کی تائید ہوتی ہے حدیث میں آتا ہے استوصوا بالنساء فان المرأة خلقت من ضلع عورتوں کے ساتھ نرمی برتو کیونکہ اسے پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔
حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔
حضرت حوا کی تخلیق کیسے عمل میں آئی اس سلسلہ میں کوئی قطعی و حتمی بات نہیں کہی جا سکتی مفسرین "من نفس واحدة" کی یہ حکمت بیان کرتے ہیں کہ اس کا مقصد آدم و حوا یعنی مرد اور عورت دونوں انسان ہونے میں یکساں ہیں عورت مرد سے کوئی فروتر مخلوق

نہیں ہے ہاں جسمانی لحاظ سے دونوں میں فرق ہے جسمانی فرق کے لحاظ سے دونوں کے وظائف وفرائضِ عملی بھی مختلف ہیں اس طرز بیان سے یعنی نفس واحدۃ کی تعبیر سے عورت کے سلسلہ میں دیگر مذاہب کے باطل نظریات کی تردید بھی مطلوب تھی کیونکہ مختلف مذاہب نے عورت کو نچلے درجہ کی ایک ایسی مخلوق فرض کر رکھا تھا جو انسان نہیں بلکہ انسان نما کوئی اور مخلوق تھی جسے مرد کی خدمت اور قضائے شہوت کے لئے جنم دیا گیا تھا قرآن نے پہلی بار یہ اعلان کیا کہ تمام مرد اور عورتیں ایک ہی اصل ایک ہی جنس سے ہیں بحیثیت انسان دونوں کا مقام و مرتبہ ایک ہے توریت اور بائیبل کی روایات میں عورت کے آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہونے کا جو ذکر ہے وہ دراصل عورت کی نسوانی فطرت کی ترجمانی ہے مولانا قاضی زین العابدین سجاد صاحب لکھتے ہیں:

> ”احادیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عورت مرد کی پسلی سے پیدا کی گئی بلکہ احادیث میں توریت کے بیان کی تاویل کر دی گئی ہے۔“
>
> (مکمل قصص القرآن ص ۳۹)

قرآن کریم توریت و بائیبل اور احادیث سے جو بات معلوم ہوتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم کی تسکینِ خاطر اور رفاقت کے لئے اللہ تعالیٰ نے عورت کی شکل میں ان کا جوڑا پیدا فرمایا جسے خود قرآن نے کوئی نام نہیں دیا ہاں البتہ مذہبی تاریخوں میں ان کا نام حوا ملتا ہے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے نام کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

> ”حوا اس لئے نام پڑا کہ وہ ہر انسانِ حی (زندہ انسان) کی ماں ہیں اور حی سے مبالغہ کا صیغہ بنا کر ان کا نام رکھ دیا گیا۔“
>
> (قصص القرآن ج ۱ ص ۳۶)

حضرت حوا حقیقی معنی میں ساری دنیا کی خاتون اول ہیں انھیں تمام نسلِ انسانی کی مادرِ اوّل ہونے کا شرف حاصل ہے جسے اصطلاحاً دادی کہا جائے گا عربی میں دادی

کے لئے'' جدہ'' کا لفظ مستعمل ہے شہر جدہ اسی مناسبت سے جدہ کہلاتا ہے کہ حضرت حوا کی وفات اسی جگہ ہوئی اور ان کی قبر بھی وہیں ہے اسی لئے آج تک اسے شہرِ جدہ یعنی دادی کا شہر کہا جاتا ہے اردو شعر و ادب میں بھی لفظ حوا ایک تلمیحی اشارہ ہے جسے مختلف معانی کے لئے برتا گیا ہے کبھی اسے آدم کے ساتھ جوڑ کر استعمال کیا گیا ہے کبھی علیحدہ، کبھی جنت اور شیطان کے پس منظر میں اور کبھی مطلقاً عورت کے معنی میں اور کبھی نسوانی خصلت و فطرت کی تعبیر کے لئے بطور علامت بھی ان تمام معانی تک رسائی کے لئے قرآنی آیات کی تفسیر و تفہیم درکار ہے کیونکہ حوا کی حقیقت و تفصیل حضرت آدم کے ذکرِ خیر سے وابستہ ہے اس طرح اردو شاعری میں اس تلمیح کا رشتہ بھی براہ راست قرآن کریم سے جڑ جاتا ہے اور تلمیحات کے سلسلہ میں قرآن کریم اس ادبی روایت کی معتبر سند ہے درجِ ذیل اشعار اس کے شاہد عادل ہیں:

میراث سمجھتا ہے جو فردوس بریں کو
فرزند وہ آدم کا ہے حوا کے شکم سے (آتش)

میری میراث ہے خلد بریں فرزند آدم ہوں
سرہانے جانتا ہوں اپنے میں زانوئے حوا کو (آتش)

جو منھ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس
چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک (اکبرالہ آبادی)

زلف حیات نوع بشر میں ہے آج تک
وہ خم گناہِ آدم و حوا کہیں جسے (جوش ملیح آبادی)

ابلیس، انکار سجدہ: (انکار عظمتِ آدم): پروردگار عالم نے جب آدمؑ کے جسد خاکی میں روح پھونک دی اور تمام فرشتوں کو سجدہ کا حکم دے دیا تو ابلیس کے علاوہ سارے فرشتوں نے سجدہ کر لیا تھا لیکن ابلیس نے نہ صرف یہ کہ سجدہ نہیں کیا تھا بلکہ آدم خاکی

کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا اس سلسلہ کی سب سے صاف اور صریح آیت درج ذیل ہے جس میں ابلیس کے انکار اور وجہ انکار کا ذکر بھی لفظاً موجود ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَ اسْتَکْبَرَ وَ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ○

(سورۂ البقرۃ آیت ۳۴ پ ۱)

''جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا اور کبر و غرور اختیار کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔''

ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کا سبب اس کا کبر و غرور تھا ابلیس نے نہ صرف یہ کہ عملاً سجدہ نہیں کیا بلکہ صراحتاً اس کا انکار بھی کیا چنانچہ جب باری تعالیٰ نے اس کے سجدہ نہ کرنے پر اس کا مواخذہ کرتے ہوئے فرمایا:

مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ ط

(سورۂ الاعراف آیت ۱۲ پ ۸)

''کس بات نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا حالانکہ میں نے اس کا حکم دیا تھا۔''

شیطان دل کی بات زبان پر لے آیا اور بول پڑا:

اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ○

(سورۂ الاعراف آیت ۱۲ پ ۸)

''میں اس سے (آدم) بہتر ہوں آپ نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔''

شیطان نے اس بات کا اظہار کر کے اپنی دانست میں یہ ثبوت فراہم کرنا چاہا

کہ میں اس سے افضل ہوں کیونکہ میرا مادۂ تخلیق نار ہے اور آدم کا مادۂ تخلیق خاک ہے ایک ناری مخلوق خاکی کو کیسے سجدہ کر سکتی ہے یہ شیطان کا اپنا قیاس تھا جو باطل تھا کیونکہ خالق کے سامنے مخلوق ہونے کی حیثیت سے دونوں برابر ہیں مگر شیطان اپنے اسی زعمِ باطل کی وجہ سے گھمنڈ تکبر اور غرور و تمکنت کا شکار ہو گیا اور یہ بھلا بیٹھا کہ امر کس کا ہے امر تو خالق کا ہے۔ جس سے بحیثیت مخلوق سرتابی کی گنجائش نہیں تھی غرور و تکبر کے نشے میں اتنی معمولی سی بات نہ سمجھ سکا کہ مخلوق کی بلندی و پستی خالق کے علم و اطلاع میں زیادہ ہے یوں بھی مخلوق کی بلندی و پستی، افضل و مفضول کا معیار مادۂ تخلیق نہیں بلکہ وہ صفات و خصائص ہیں جو خالق نے مخلوق کے اندر ودیعت فرمائے ہیں۔ شیطان نے دراصل یہ محسوس کر لیا تھا کہ مٹی کے پتلے کو سجدہ کرانے کا مطلب یقیناً آدم کی فضیلت ہی ہے وہ اس فضیلت کو گوارا نہیں کر سکا سجدہ سے انکار اسی جذبہ کا نتیجہ تھا قرآن نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے:

وَ اِذْقُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ. قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا ۝ قَالَ اَرَءَیْتَکَ هٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۶۱/۶۲)

''جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کر لیا سوائے ابلیس کے وہ کہنے لگا میں اس کے سامنے جھکوں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے! کیا تو نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کی ہستی کو مجھ پر فضیلت دے؟! اگر مجھے قیامت تک کی مہلت مل جائے تو میں اس کی ذریت کو راستے سے ہٹا دوں گا اور بہت کم لوگ بچ پائیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے اتمام حجت کے لئے شیطان سے باز پرس کی اور وہ کبر و غرور کی نخوت کے ساتھ اپنے فعلِ ناصواب کی توجیہات کرتا رہا اور آدمؑ سے بغض و حسد اور کینہ و دشمنی کا اظہار کرتا چلا گیا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسے غرور و تکبر کٹھ حجتی و نافرمانی کے جرم میں اپنی رحمت سے دور اور اپنی بارگاہ سے خارج کر دیا:

قَالَ فَاهۡبِطۡ مِنۡهَا فَمَا يَكُوۡنُ لَكَ اَنۡ تَتَكَبَّرَ فِيۡهَا فَاخۡرُجۡ
اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيۡنَ۝ (سورۃ الاعراف آیت ۱۳ پ ۸)

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا نکل جا یہاں سے تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے دور ہو جا تو یقیناً ذلیل و خوار لوگوں میں شامل ہو گیا ہے"

اللہ تعالیٰ نے اسے نہ صرف اپنی بارگاہ سے خارج کر دیا بلکہ قیامت تک کے لئے اس پر لعنت کر دی اور اسے مردود بنا دیا:

قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ وَاِنَّ عَلَيۡكَ اللَّعۡنَةَ اِلٰى
يَوۡمِ الدِّيۡنِ۝ (سورۃ الحجر آیت ۳۴، ۳۵)

"فرمایا تو نکل یہاں سے کیوں کہ تو مردود ہو گیا بے شک تجھ پر قیامت تک لعنت رہے گی۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں سے نکل جا تو راندۂ درگاہ ہوا اور یوم جزاء تک کے لئے تجھ پر لعنت ہوتی رہے گی سورۂ ص میں بھی اسی قسم کی ایک آیت ہے ابلیس نے جب یہ دیکھا کہ امر الٰہی نہ ماننے کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے ملاء اعلیٰ سے نکالا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ آدم کی بدولت ہو رہا ہے تو اس نے قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ سے مہلت طلب کر لی تاکہ آدم سے اور اس کی ذریت سے اس توہین و اہانت کا بدلہ لے سکے اللہ تعالیٰ انتہائی بے پرواہ اور بے نیاز ہیں اسے مہلت عطا کر دی کہ جا یوم جزاء تک کے لئے تجھے مہلت ہے۔ مہلت مل جانے کے بعد اس نے آدم سے شدید بغض و

عناد اور حسد کا اظہار کرتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے اللہ تعالیٰ سے کہہ بھی دیا کہ میں بنی آدم کو بہکا کر جنت کے راستے سے ہٹاؤں گا اور انہیں جہنم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا مختلف آیات میں اس کا تذکرہ ہے سورۂ اعراف کی جو آیت اوپر مذکور ہوئی اسی کا تسلسل ہے:

قَالَ أَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ o قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ o قَالَ فَبِمَا أَغْوَیْتَنِیْ لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ o ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِنْ مبَیْنِ أَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ أَیْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ أَکْثَرَهُمْ شٰکِرِیْنَ o (سورۂ الاعراف آیت ۱۴/۱۷)

"(شیطان) کہنے لگا مجھے مہلت دیجئے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی بولا جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا میں بھی تیرے سیدھے راستے پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا اور انہیں بہکاؤں گا سامنے سے پیچھے سے دائیں سے بائیں سے اور آپ اکثروں کو ان میں سے شکر گذار نہیں پائیں گے۔"

دوسری آیت سورۂ الحجر کی ہے جس میں یہی مکالمہ الفاظ کے فرق کے ساتھ مذکور ہے:

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ o قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ o اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ o قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَیْتَنِیْ لَأُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْأَرْضِ وَ لَأُغْوِیَنَّهُمْ أَجْمَعِیْنَ o اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ o

(سورۂ الحجر آیت ۳۶/۴۰)

"اے رب مجھے مہلت دے قیامت کے دن تک فرمایا تجھے مہلت

دے دی گئی ایک معین وقت تک کے لیے کہنے لگا اے رب جیسا کہ
آپ نے مجھے گمراہ کیا میں دنیا انہیں خوبصورت بنا کر پیش کروں گا
اوران سب کو گمراہ کردوں گا سوائے آپ کے ان بندوں کے جو مخلص
ہوں گے۔"

اسی مفہوم کی اور بھی کئی آیات ہیں جن میں شیطان نے یہ عہد کیا ہے کہ بنی آدم کو خدا۔ کے را۔ستے سے بھٹکا کراور صراط مستقیم سے ہٹا کر جہنم میں پہنچا کردم لے گا کیونکہ وہ خود جنت میں رہا کرتا تھا کبر وغروراور سجدہ سے انکار کے نتیجہ میں وہ مردود ہوااوراس کا ٹھکانا جہنم بنادیا گیا لہٰذااس نے عہد کرلیا کہ اب آدم کو بھی جنت میں نہیں جانے دے گا بلکہ اپنے ساتھ ہی جہنم میں لے جائے گا بارگاہِ ایزدی سے بھی اس کی اجازت مل گئی کیونکہ حکمت الٰہی کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ وہ انسانوں کو آزمائے کہ کون اس کا سچا بندہ بن کراس کی عبادت وشکر گذاری کرتا ہےاور کون ناشکرااور باغی ہےاس لئے پروردگار نے شیطان کو نہ صرف قیامت تک کی مہلت عطا کردی بلکہ اسے ایسی نادیدہ طاقت و قوت بھی دیدی کہ انسان کوراہ راست سے ہٹانے میں اسے کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے چنانچہ وہ انسان کے دل ودماغ میں سرایت کر جاتا ہے لہو کی گردش کے ساتھ دوڑتا ہے براہ راست انسانی ذہن وخیال میں شکوک وشبہات، وسوسے پیدا کرتا ہے غلط خیالات، سفلی جذبات، جھوٹ مکروفریب دغا ہوشیاری وفنکاری کے ساتھ انسان کوراہ راست سے ہٹا کر غیر محسوس طور پر غلط راہ پرڈال دیتا ہے غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط ثابت کرتا رہتا ہےاس کی چالیں اس کے ہتکنڈے بڑے دقیق بڑے لطیف بڑے لذیذ بڑے پرکشش بڑے حسین وخوبصورت ہوتے ہیں اس موضوع پر باری تعالیٰ اور شیطان کے درمیان جو مکالمہ ہے قرآن کریم میں کئی جگہ اس کا ذکر ہے شیطان کی کٹھ حجتی اور آدم سے دشمنی کے جذبات اور بنی آدم کو بہکا کرانجام کار جہنم تک لے جانے کا چیلنج شیطان نے ہر جگہ پیش

کیا ہے اور ہر جگہ باری تعالیٰ نے اسے کھلی آزادی دے کر فرمایا ہے کہ میرے مخلص بندے اور سچے فدا کار تیری چالوں میں نہیں آنے والے اور جو بندے تیرے چکر میں آجائیں گے تیری پیروی کریں گے ان کو بھی تیرے ہی ساتھ جہنم میں جھونک دوں گا میری کبریائی میری خدائی ہر چیز سے بے نیاز ہے انسانوں کی عبادت سے بھی اور تیری شیطنت سے بھی......!

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ٥ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ٥ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَّ كَفٰى بِرَبِّكَ وَ كِيْلًا ٥ (سورۂ الاسراء آیت ۶۳/۶۵ پ ۱۵)

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا جو بھی تیرے پیچھے چلے گا ان سب کی سزا جہنم ہوگی ان میں سے تو جس کو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے بہکا لے اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں کے ساتھ ان پر حملہ کر ان کے مال واولاد میں شریک ہو جا ان سے طرح طرح کے وعدے کر اور شیطان کے وعدے تو سراسر فریب ہیں میرے سچے بندوں پر تو قابو نہیں پا سکتا اور تمہارا رب بہتر وکیل ہے۔"

دوسری آیت میں مذکور ہے:

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ٥ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ٥ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ٥ (سورۂ حجر آیت ۴۱/۴۳ پ ۱۴)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے
میرے سچے بندوں پر تیرا زور نہیں چلے گا تو صرف انھیں پر قابو
حاصل کر سکے گا جو راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں گے اور ان سب کے
لئے جہنم کا وعدہ ہے''

شیطان نے مختلف انداز میں بار بار انسان کو صراط مستقیم سے بھٹکانے کی بات کی اور ہر بار خداوند قدوس نے یہی فرمایا کہ تیرے لئے آزادی ہے تو جس طرح چاہے اپنا کردار ادا کر تیرا اور تیرے متبعین کا انجام واضح ہے

لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِيْنَ ○

(سورۂ ص آیت ۸۵ پ ۲۳)

''میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے متبعین سے بھر دوں گا۔''

پروردگار عالم نے شیطان کے اس مکالمہ کو بار بار دہرا کر شیطان کے اس بغض وحسد اور کینہ ودشمنی کو واضح فرمادیا ہے جو اسے انسان کے ساتھ ہے تا کہ آدمی اپنے اس دشمن ازلی سے چوکنا رہے اور جان لے کہ شیطان کی پیروی کا انجام کیا ہوگا اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہیں انسان کے ساتھ خصوصی رحمت یہ فرمائی کہ اسے اپنے دشمن سے آگاہ بھی فرمادیا:

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُبِيْن ○

(سورۂ یوسف آیت ۵ پ ۱۲)

''بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

یہ انسان اور شیطان کے ازلی بیر کی داستان ہے اس دشمنی کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ شیطان انسان کو ایک مرتبہ جنت سے نکل جانے کے بعد دوبارہ جنت میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتا اسی لئے وہ انسان کو خدا کی رحمت سے محروم رکھنا چاہتا ہے جبکہ خدا نے

اپنی رحمت سے انسان کے لئے جنت کے دروازے کھلے رکھے ہیں اور راستہ بھی بتا دیا ہے شیطان اور بارگاہ خداوندی میں ہونے والے مکالمات پر مشتمل قرآن کریم کی بہت سی آیات میں سے چند ایسی آیات اوپر ذکر کی گیئں جن سے اس قصہ کا مرکزی مضمون عیاں ہو گیا ہے اردو شعراء نے ابلیس، ابلیسی کردار اور اس کی ازلی انسان دشمنی کی جو مختلف تلمیحات تراشی ہیں ان کی معنویت میں قرآن کریم کی بیان کردہ ان آیات کا بڑا دخل ہے ان آیات کی مختصر تشریح و تفہیم اور پس منظر کا ذکر ہم نے کر دیا ہے تفصیلات کے لئے تفسیری مباحث سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ جس سے اردو شعراء کی اخذ کردہ تلمیحات کی معنویت ور مزیت مزید روشن ہو کر ابھرے گی اور تلمیحات کی مختلف معنوی پرتوں کے لئے ثبوت و دلائل فراہم ہوں گے مذکورہ آیات کی تفہیم و تشریح کے پس منظر میں اس سلسلہ کی تلمیحات اشعار کے آئینہ میں ملاحظہ فرمائیں:

اولاد سے ابتک ہے خصومت وہی باقی
ابلیس سا بھی دشمن آدم نہیں دیکھا (آتش)

نا فہمی کی دلیل ہے یہ سجدہ سے اِبا
ابلیس کو حقیقت آدم عیاں نہ تھی (آتش)

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا (ذوق)

ظاہر ہوا ایک سجدے کے انکار سے حیراں
ابلیس کو آدم کا ادب یاد نہیں ہے (عبدالرب حیراں)

جنت، بہشت: حضرت آدمؑ اپنی پیدائش کے بعد سے جس جگہ مقیم تھے وہ جنت تھی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا جو حکم دیا تھا وہ بھی جنت کے اندر ہی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں شیطان کو جنت سے نکل جانے کا

حکم دیا گیا تھا اس کے بعد حضرت حوا کی پیدائش ہوئی اور حضرت آدمؑ کو حضرت حوا کے ساتھ جنت میں رہنے اور وہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا حکم دیا گیا اور ایک خاص درخت سے منع کیا گیا اس ترتیب کی وضاحت اس آیت سے ہوتی ہے جس میں فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا اور اس کے بعد حضرت آدمؑ سے فرمایا گیا:

وَقُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّۃَ وَ کُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَیْثُ شِئْتُمَا وَ لاَ تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (سورۃ البقرۃ آیت ۳۵ پ۱)

''اے آدم تم اور تمہاری زوجہ دونوں جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو مطمئن ہو کر کھاؤ پیو مگر اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔''

قصہ آدمؑ کے پس منظر میں ہمیں پہلی بار جنت کا ذکر سنائی دیتا ہے قرآن و حدیث میں جنت کا ذکر بار بار آیا ہے بطور خاص ان بندوں کے لئے جنت کی بشارت ہے جو دنیا میں خدا کی بتائی ہوئی راہ اختیار کر کے زندگی گزارتے ہیں اور خدا کی مرضیات پر چلتے ہیں انھیں آخرت میں جنت سے نوازا جائے گا اور انعام و اکرام کے طور پر انھیں جنت میں داخل کیا جائے گا جنت کیا ہے؟ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ اس کا تفصیلی علم کسی کو بھی نہیں ہے یعنی اس کی کیفیات کا ادراک کوئی نہیں کر سکتا حدیث شریف میں آتا ہے ما لا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر جنت کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کان اس کی لذت سے آشنا ہیں اور اس کے بارے میں انسانی دل و دماغ سوچ بھی نہیں سکتا اس حدیث کو جنت کی نعمتوں اور ان کی کیفیات پر محمول کیا جائے گا کیونکہ بہت سی احادیث میں اور قرآن کریم کی مختلف آیات میں جنت کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں ترغیب و تشویق کی خاطر جنت کی وسعت و بلندی طول و عرض حور و غلمان

قصور ومحلات دودھ شہد اور شرابِ طہور کی نہریں جنت کے باغات ومیوہ جات حوروں کی قسمیں اور صفات اور جنت کے ظروف وغیرہ کی تفصیلاُت خود قرآن واحادیث میں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنت کیسی عجیب وغریب پُرکشش وپُر بہار جگہ اور پرفضا مقام ہے، جو مومنین وصالحین کے اعزاز واکرام کے لئے بنائی گئی ہے:

قصہ آدم کے پس منظر میں مختلف حیثیات سے جنت کا ذکر سنائی دیتا ہے انھیں جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا پھر انھیں جنت سے نکالا گیا اور دنیا میں بھیجا گیا لیکن دوبارہ جنت میں جانے کا راستہ بتا دیا گیا پہلی مرتبہ جنت بغیر کسی آزمائش ومحنت کے محض انعام خداوندی سے ملی تھی اور دوسری مرتبہ جنت میں داخلہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے مگر اب داخلہ محنت وآزمائشوں کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔

اردو شاعری میں جنت کی تلمیح حضرت آدم کے پس منظر میں بھی ملتی ہے اور اپنے مطلق تصور کے اعتبار سے بھی یہ ایک پرکشش تلمیح ہے، جس سے سیکڑوں اشعار مزین ہیں، مختلف خیالات کی ادائیگی کے لئے جنت کے مختلف تصورات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے جنت کے مجموعی تصور وتأثر کو بھی بطور تلمیح برتا گیا ہے اور جنت کی جن داخلی تفصیلات کا علم قرآن وحدیث کے ذریعہ ہوتا ہے ان سے انفرادی طور پر بھی تلمیحات تراشی گئی ہیں جیسے شجرِ ممنوعہ، شرابِ طہور، حور، فردوس، غلمان اور رضواں وغیرہ۔ جنت ایک پرکشش و پرشوق تصور ہے صرف لفظِ جنت ہی سے آدمی ایک قسم کا کیف وسرور، مسرت وانبساط محسوس کرنے لگتا ہے اس لفظ کی صوتی کیفیت ہی کچھ اس انداز کی ہے کہ آدمی جنت کے مزے لینے لگتا ہے اسی لئے اس سے وابستہ تلمیحات بھی نہایت پُر لطف، دلکش اور خوبصورت ہیں ان تلمیحات سے اردو کی لفظیات میں خوشگوار اضافہ ہوا ہے اور معنویت بھی بڑی پُر کیف وپُر بہار ہو گئی ہے ان بہشتی تلمیحات نے اردو شاعری کو جنتِ نگاہ اور فردوس گوش بنا دیا ہے درج ذیل اشعار اس دعوی کی خوبصورت دلیل فراہم کرتے ہیں:

گندم ہے سینہ چاک فراقِ بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ (ذوقؔ)

مر مر کے ہوئے داخلِ جنت بنی آدم
پر چھوڑ نہ جائے پدر اولاد کو شاباش (بہادر شاہ ظفرؔ)

کیا طرفہ تماشا ہے فیضان محبت سے
جنت سے بشر نکلے جنت میں بشر جائے (خلیل الرحمٰن رازؔ)

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر (اقبالؔ)

لے چلی ہے جو قضا مجھ سے قدح کش کو بہشت
ظرف گنجائش مئے چشمۂ کوثر میں نہیں (آتشؔ)

عاشقوں کی ترے کوچے کو نہ کیونکر ہو رجوع
باغِ فردوس میں مردانِ خدا جاتے ہیں (آتشؔ)

کوچۂ یار کو کہتے ہیں بہشت اے قاصد
یاد رکھیو یہ نشاں آٹھ پہر حالت صبح (آتشؔ)

دیکھے رضواں جو تری چشم سیہ کو تو کہے
اس کی ہم چشم نہیں نرگس شہلائے بہشت (آتشؔ)

شجر بہشت: (شجر ممنوعہ، دانۂ گندم) حضرت آدمؑ کو جب فرشتوں نے سجدہ کر لیا اور ابلیس سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے راندہ درگاہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی رفاقت کے لئے حضرت حوا کو تخلیق کیا اور دونوں کو جنت میں رہنے اور وہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا حکم فرمایا تھا لیکن ایک مخصوص درخت کے استعمال کی ممانعت فرما دی تھی بڑی سختی کے ساتھ منع فرمایا تھا کہ اس درخت کے قریب بھی نہ جانا اللہ تعالیٰ کے اسی حکم

کی وجہ سے ابلیس کو یہ موقع فراہم ہو گیا کہ وہ آدم کو بہکا کر خدا کے اس حکم کی نافرمانی پر آمادہ کر دے. قرآن کریم میں ممانعت ان الفاظ میں مذکور ہے:

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(سورۂ البقرۃ ۳۵ آیت پ ۱)

''اور تم دونوں اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔''

یہی آیت انھیں الفاظ کے ساتھ سورۃ الاعراف میں بھی مذکور ہے وہاں قدرے تفصیل بھی ہے کہ جب حضرت آدمؑ اور ان کی اہلیہ حوا کو جنت میں رہنے کے لئے کہا گیا تو کچھ ہدایات بھی دی گئیں بنیادی ہدایت تو یہی تھی کہ شیطان تمہارا دشمن ہے اس کے مکر و فریب سے بچتے رہنا اس کی باتوں میں نہ آنا. ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ جنت میں فلاں درخت سے دور ہی رہنا اور اس سے کچھ نہ کھانا جب حضرت آدمؑ و حوا جنت میں چلے گئے تو شیطان کے مشن کا آغاز ہو گیا کیونکہ ابلیس نے سجدہ سے انکار کر کے آدم سے اپنی دشمنی اور بغض و عداوت کا اعلان کر دیا تھا اور اپنے مشن کا اظہار بھی کہ آدم اور ان کی ذریت کو اللہ کے حکم سے برگشتہ کر کے جنت کے راستہ سے ہٹا کر جہنم کی طرف لے جانا میرا مشن ہو گا چنانچہ اس نے اپنے مشن کا آغاز کر دیا۔

مذکورہ بالا دونوں آیتیں شجر بہشت کی تلمیح کے سلسلہ کی بنیاد ہیں حضرت آدم و حوا کو اس درخت کے قریب جانے سے منع کیا گیا تھا اسی لئے اس درخت کو شجرِ ممنوعہ بھی کہا جاتا ہے شجر ممنوعہ کی تلمیح کی بنیاد بھی یہی ہے اس ممانعت سے قبل جنت کی نعمتوں کے کھانے پینے کا تذکرہ ہے اور یہ استثناء اسی سے ہے اس لئے بجا طور پر یہاں بھی اس درخت کے پھل کھانے کی ممانعت مراد لی جائے گی اسلوبِ بیان کا تقاضہ بھی یہی ہے اسی لئے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ وہ درخت کونسا تھا اور اس کا پھل کیا تھا عام طور پر تو یہی

مشہور ہے کہ وہ گیہوں کا پودا تھا اور اس کا پھل دانۂ گندم تھا جسے حضرت آدمؑ وحوا نے کھا لیا تھا لیکن اس بات کی تصدیق و تعیین بہت مشکل ہے کہ وہ درخت گندم کا پودا تھا اور حضرت آدمؑ نے گندم ہی استعمال فرمایا تھا قرآن کریم نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے اور احادیث سے بھی یہ ثابت نہیں ہے خدا جانے گندم کے سر یہ الزام کیوں ہے کہ اس کے کھانے یا چکھنے سے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکلنا پڑا اور وہی بے چارا رب کائنات کی نافرمانی کا سبب بنا حالانکہ گندم کوئی ایسا دانہ یا پھل بھی نہیں ہے جسے براہ راست کھایا جاتا ہو بلکہ اسے تو پودے سے براہ راست توڑنا بھی ممکن نہیں ہے تاوقتیکہ باقاعدہ عملِ جراحی نہ ہو خدا جانے کیوں گندم کو شیطان کا آلۂ کار بنا دیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں اس قصہ کا مقصد دراصل عبرت و موعظت ہے اس لئے قرآن کریم اس بحث میں نہیں پڑتا کہ وہ درخت کیا تھا اور پھل کونسا تھا جسے حضرت آدمؑ وحوا نے کھایا تھا یہ بحث بھی قرآن کے موضوع سے خارج ہے کہ حضرت آدمؑ نے وہ پھل خود کھایا تھا یا حوا کی باتوں میں آ کر کھالیا تھا قرآن کریم تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے حکمِ رب کی نافرمانی سرزد ہوئی اور اس پر حق تعالیٰ نے ان کی گرفت فرمائی حالانکہ حضرت آدمؑ کو حق تعالیٰ نے خود اپنے دستِ قدرت سے بنایا تھا اور ان کو فرشتوں سے سجدہ بھی کروایا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب و مقرب بھی تھے اس قربت و عظمت کے باوجود جب ان سے نافرمانی سرزد ہوگئی تو ان کا مواخذہ بھی کیا اور گرفت بھی فرمائی خدا کی نافرمانی کر کے کوئی بچ نہیں سکتا خواہ وہ کتنا ہی مقرب و معزز ہو اس مقصد کے لئے دانۂ گندم کی بحث فضول ہے اس لئے اس کی تعیین و تحقیق کو نظر انداز کر کے اصل مقصد کو پیش کیا گیا ہے اور یہ قرآن کریم کا ایک عام اسلوب ہے اس بحث کی روشنی میں یہ بات بہت وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ شجرِ بہشت کی تعیین بشکل گندم صحیح نہیں ہے ہاں البتہ مطلق شجرِ بہشت کی تلمیح بالکل درست اور حقیقی ہے اس کی بنیاد کے لئے اور بھی

کئی آیات پیش کی جاسکتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدمؑ وحوا نے اس درخت کا استعمال کیا پھل کھایایا پتہ چبایا جو بھی شکل ہولیکن حضرت آدمؑ وحوا کا کھانا ثابت ہے لہٰذا مطلق پھل کھانے کی تلمیح بھی صحیح ہے قرآن کریم کی دیگر آیات اور تفسیری مباحث سے استفادہ کرتے ہوئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ اتنی بحث اس تلمیح کی وضاحت کے لئے کافی ہے اس جائزے کے لئے اشعار کا مطالعہ ضروری ہے کہ شعراء نے اس تلمیح کو کیسے اور کس کس تناظر میں برتا ہے اور کیا کیا معانی تراشے ہیں اور جو معانی تراشے ہیں اس کی گنجائش کہاں تک ہے......!

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو (اقبالؔ)

گندم ہے سینہ چاک فراق بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ (ذوقؔ)

چھٹے کیا ہم سے شوق حسن گندم گوں کہ گندم پر
ہمارے جدا مجد چھوڑ کر خلد بریں نکلے (ذوقؔ)

ابن آدم نہ کہواس کو فرشتہ سمجھو
خود کو جو دانۂ گندم سے بچالے جائے (اصغر مہدی ہوشؔ)

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی (غالبؔ)

گناہِ آدم: قرآن کریم سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدمؑ وحوا کو جنت میں ایک مخصوص درخت کا پھل کھانے سے روک دیا گیا تھا مگر حضرت آدمؑ وحوا دونوں شیطان کے دام فریب کا شکار ہو کر اس ممانعت پر قائم نہیں رہ سکے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا امتحان تھا آزمائش تھی حضرت آدم جس میں پورے نہیں اتر سکے اور ان

سے غلطی سرزد ہوگئی اسی غلطی کو اردو شاعری میں ''گناہ'' قرار دے دیا گیا ہے گناہ کا تصور اس لئے پیدا ہوا کہ ایک اعتبار سے خدا کے حکم کی خلاف ورزی تھی۔ جس مخصوص درخت سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تھا اس درخت کا پھل کھا کر حضرت آدمؑ وحوا نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا یہی گناہ تھا بادی النظر میں یہ گناہ ہے اور یہ گناہ حضرت آدمؑ سے سرزد ہو گیا جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی اور جنت سے نکال دیا۔ قرآن کریم کی مختلف آیات میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت آدمؑ سے یہ گناہ کیسے سرزد ہوا۔

حضرت آدمؑ وحوا جب جنت میں رہنے لگے اور بطور آزمائش اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ایک مخصوص درخت سے دور رہنے کا حکم دے دیا تو شیطان کو اس کا موقع مل گیا کہ کسی طرح دونوں کو بہلا پھسلا کر باتوں میں لگا کر اس حکم خداوندی سے غافل کر دے چنانچہ اس نے اپنا کام شروع کر دیا سورۃ الاعراف میں اس کی تفصیل موجود ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (سورۃ الاعراف آیت ۲۰ پ ۸)

''شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا''

اور حضرت آدمؑ وحوا کو بہکانا شروع کر دیا مگر جب دونوں اس کی گرفت میں نہیں آئے اور وسوسے سے کام نہیں چلا تو ناصح اور خیر خواہ بن بیٹھا اور کہنے لگا کہ میں بتاتا ہوں کہ تمہارے رب نے اس درخت کا پھل کھانے سے کیوں روکا ہے دراصل اس درخت کی خصوصیت یہ ہے کہ جو اس کا پھل کھالیتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہنے کا مستحق ہو جاتا ہے اگر تم چاہتے ہو کہ جنت کی یہ نعمتیں تمہیں ہمیشہ میسر رہیں اور تم ان سے محروم نہ ہو تو اس درخت کا پھل کھانا ضروری ہے تاکہ تمہیں یہ حق حاصل ہو جائے اور قسمیں کھا کھا کر انھیں یہ یقین دلایا کہ میں تو تمہاری بھلائی چاہتا ہوں قرآن کریم نے شیطان کے اس فریب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا

مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ○ وَ قَاسَمَهُمَا اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ○ (سورۃ الاعراف آیت ۲۰، ۲۱ پ ۸)

''اور شیطان نے کہا کہ تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے صرف اس لئے منع کیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور اس نے قسمیں کھا کر انھیں یقین دلایا کہ میں تم دونوں کے حق میں خیر خواہی کرنے والا ہوں۔''

دوسری جگہ شیطانی چال کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے:

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○ (سورۃ طٰہٰ آیت ۱۲۰/پ ۱۶)

''شیطان نے آدم کو وسوسہ میں مبتلا کرنا چاہا اور کہا اے آدم کیا میں تمہیں ہیشگی کے درخت کا پتہ بتا دوں اور کبھی نہ زائل ہونے والی بادشاہی کا راز بتا دوں......!!''

شیطان کے حضرت آدم کو بہکانے کا ذکر قرآن کریم نے کئی جگہ کیا ہے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ آسانی سے شیطان کے وساوس کا شکار نہیں ہوئے اسے بڑے حیلے بہانے کرنے پڑے جھوٹی قسمیں کھانی پڑیں اور بڑی محنت کرنی پڑی مگر بالآخر وہ کامیاب ہو گیا قرآن کی تعبیر ہے ﴿فدلھما بغرور﴾ اس نے دھوکے سے انھیں اپنے فریب میں پھانس لیا اس طرح حضرت آدم و حوا دونوں نے اسی درخت کا پھل کھا لیا جس سے اللہ تعالیٰ نے انھیں منع فرمایا تھا سورۂ اعراف کے الفاظ ہیں ﴿فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ﴾ پھر جب آدم و حوا نے اس درخت کا پھل چکھا اور سورۂ طٰہٰ میں صراحت ہے کہ ﴿فَاَكَلَا مِنْهَا﴾ حضرت آدم و حوا نے شیطان کے فریب میں آ کر اس درخت سے پھل کھا لیا۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیات میں شیطان کے مکر و فریب کا

اور حضرت آدم وحوا کا اس کے فریب میں مبتلا ہو کر پھل کھا لینے کا ذکر موجود ہے یہی وہ غلطی ہے جو شیطان کے فریب میں آکر حضرت آدم سے سرزد ہوئی اسی لئے اس کو باقاعدہ گناہ اور معصیت نہیں کہا جائے گا کیونکہ بالقصد وارادہ کسی بات کو ٹھکرا دینا اور نہ ماننا گناہ معصیت اور نافرمانی ہے خطا اور معصیت میں یہی فرق ہے نادانستگی و ناواقفیت یا کسی دھوکہ اور فریب کے نتیجہ میں اگر کوئی فعل سرزد ہو جائے تو اسے گناہ اور معصیت نہیں کہا جائے گا حضرت آدمؑ بھی شیطانی وساوس اور دھوکے کا شکار ہو کر ایک غلطی کر بیٹھے اور شجر ممنوعہ کا استعمال کر لیا اسی دھوکے اور فریب کی بنا پر اسے گناہ قرار دینا اور آدم کو گنہگار ٹھہرانا صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت آدمؑ کی طرف سے قصد وارادہ شامل نہیں تھا اسی لئے یہ ارتکاب جرم نہیں ارتکاب خطا تھا اور خطا پر اصرار بھی گناہ میں شامل ہے لیکن یہاں خطا پر اصرار بھی نہیں پایا گیا بلکہ خطا کا علم ہوتے ہی حضرت آدمؑ نے بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہو کر معافی طلب کر لی اور انھیں معافی مل بھی گئی تھی اس کے بعد تو کسی بھی حال میں اس غلطی کو گناہ قرار دینا صحیح نہیں ہے لہذا گناہ آدم کی تلمیح اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے اسے خطا پر محمول کیا جائے گا۔ حقیقتاً بد معصیت و نافرمانی نہیں تھی۔

عصمتِ آدم: قرآن کریم میں بھی اس کی وضاحت ہے کہ حضرت آدمؑ سے جو نافرمانی سرزد ہوئی اس میں ان کے عزم وارادے کا دخل نہیں تھا بلکہ یہ انسانی بھول چوک کا نتیجہ تھی قرآن کے الفاظ ہیں:

وَ لَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰیٓ اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝

(سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۵ پ ۱۶)

''اور ہم نے آدم سے پہلے ہی عہد لے لیا تھا مگر وہ بھول گئے انھوں نے قصد وارادے کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔''

(نافرمانی نہیں کی) حالانکہ خود قرآن کریم نے حضرت آدم کے اس فعل پر یہ

تبصرہ کیا ہے۔

﴿فَعَصٰى آدَمُ رَبَّه‘ فَغَوىٰ﴾ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور گمراہ ہو گئے۔

یہاں عصی کا لفظ ہے جس کے معنی نافرمانی کے آتے ہیں لیکن دوسری آیت جو اوپر مذکور ہوئی ﴿وَلَمْ نَجِدْ لَه‘ عَزْمًا﴾ ہمیں ان کا ارادہ شامل نہیں ملا کہہ کر عـصـی کی تعیین فرمادی اور نسیان کا بھی ذکر کر دیا کہ آدم سے نسیانِ عہد کی وجہ سے یہ غلطی سرزد ہو گئی ان دونوں آیات سے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضرت آدم نے قصد وارادے کے ساتھ اپنے رب کی نافرمانی نہیں کی وہ شیطان کے بہکاوے میں آکر اپنے رب کا عہد بھول گئے اس بھول کی وجہ سے ان سے غلطی سرزد ہو گئی مگر احساس ہوتے ہی انھوں نے اعترافِ قصور کر لیا اور سربسجود ہو کر اپنے رب سے معافی طلب کر لی قرآن کریم نے حضرت آدم کے اعترافِ قصور اور معافی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَاوَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (سورۂ الاعراف آیت ۲۳ پ ۸)

''اے ہمارے رب ہم نے اپنی جان پر ظلم کر لیا ہے اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔''

جس طرح قرآن کریم نے حضرت آدم کی توبہ و معافی کا ذکر کیا ہے اسی صراحت کے ساتھ یہ بھی ذکر کر دیا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور ان کی خطا معاف فرمادی:

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّه‘ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدىٰ ○ (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۲ پ ۱۶)

''پھر ان کے رب نے انھیں منتخب کر لیا ان کی توبہ قبول فرمالی اور انھیں ہدایت کی راہ بتائی۔''

اردو شاعری میں عام طور پر گناہ کی تلمیح کو بہت زیادہ برتا گیا ہے اور عصمتِ آدم کی تلمیح کو بھی سلبی انداز میں برتا گیا ہے اور منفی طور پر پیش کیا گیا ہے بلکہ حضرت آدم کی غلطی کے حوالے سے شعراء نے سارے انسانوں کو گنہگار قرار دیدیا ہے پروردگارِ عالم نے تو حضرت آدم کو معاف فرما کر انھیں نبوت سے سرفراز فرمادیا لیکن شعراء انھیں معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہیں ہاں البتہ مستثنیات ضرور ہیں لیکن اردو شاعری میں برتی جانے والی گناہ آدم اور عصمتِ آدم کی تلمیحات کو مذکورہ بالا تفصیل وتشریح کی روشنی میں ازسرِ نو دیکھا جانا چاہیے تاکہ قرآن کریم کی پیش کردہ تفسیر وتشریح کی روشنی میں صحیح اور مثبت معانی کے مزید امکانات روشن ہوں مندرج ذیل اشعار اس تلمیح کے افراط وتفریط کا آئینہ ہیں۔

زلف حیات نوعِ بشر میں ہے آج تک
وہ خم گناہِ آدم و حوا کہیں جسے (جوشؔ)

مت عبادت پہ پھولیو زاہد
سب طفیل گناہِ آدم ہے (میر دردؔ)

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہ گار ہیں ہم (نامعلوم)

خروجِ بہشت نزولِ دنیا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی توبہ تو قبول فرمالی لیکن اس ارتکاب خطا کے نتیجہ میں انھیں جنت سے نکلنا پڑا کیونکہ اس درخت کا پھل کھالینے کے بعد ان دونوں کے جسم سے بشری حاجتوں کا ظہور ناگزیر تھا اسی لئے پھل کھاتے ہی ان کے جسم سے جنتی لباس خود بخود اتر گیا تھا اور اعضاء جسمانی بے ستر ہو گئے تھے مولانا قاضی زین العابدین سجاد نے مولانا عبدالحق کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''حاجتِ استنجا اور حاجت شہوت جنت میں نہ تھی ان کے بدن پر کپڑے تھے جو کبھی اترتے نہ تھے کیونکہ حاجت اتارنے کی نہ ہوتی

تھی آدم وحوا اپنے اعضاء سے واقف نہ تھے جب یہ گناہ ہوا تو لوازم
بشری یعنی پیشاب پاخانہ کی ضرورت پیدا ہوئی اپنی حاجت سے
خبردار ہوئے اور اپنے اعضاء دیکھے گویا اس درخت کے پھل کو کھانے
سے جو پردہ انسانی کمزوریوں پر پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔''

(قصص القرآن ص ۲۶ رزین العابدین سجاد)

اللہ تعالیٰ نے اس درخت کا پھل کھانے سے کیوں منع فرمایا تھا یہ تو اللہ ہی کے علم میں تھا مگر اس درخت کا پھل کھاتے ہی ان لوازماتِ بشری کا ظہور ناگزیر تھا جن کے ساتھ جنت میں نہیں رہا جا سکتا چنانچہ حضرت آدم وحوا اب جنت میں نہیں رہ سکتے تھے مشیتِ ایزدی بھی یہی تھی اس لئے خطا کا ارتکاب ہوتے ہی دونوں کو جنت سے نکال کر زمین پر اتار دیا گیا جنت میں رہنے کی جو صلاحیت تھی وہ زائل ہو گئی تھی بطور سزا حضرت آدم کو دنیا میں نہیں بھیجا گیا اگرچہ آدم وحوا کی توبہ قبول کر لی گئی تھی لیکن اس درخت کا پھل کھا لینے کے بعد جو طبعی نتیجہ ظاہر ہونا چاہیے تھا وہ ہوا اور وہ یہ تھا کہ اب آدم وحوا دونوں کو بشری تقاضے اور ضرورتیں پیش آنے لگیں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں کہ:

''حضرتِ حق نے ان کے (آدم) اس عذر کو قبول فرما لیا اور
معاف کر دیا مگر وقت آ گیا تھا کہ حضرت آدم خدا کی زمین پر حقِ خلافت
ادا کریں اس لئے بتقاضائے حکمت ساتھ ہی یہ فیصلہ سنایا کہ تم کو اور
تمہاری اولاد کو ایک معین وقت تک زمین پر قیام کرنا ہو گا اور تمہارا
دشمن ابلیس بھی اپنے تمام سامانِ عداوت کے ساتھ وہاں موجود ہو گا
اور تم کو اس طرح ملکوتی اور طاغوتی طاقتوں کے درمیان زندگی بسر
کرنی ہو گی اس کے باوجود اگر تم اور تمہاری اولاد مخلص بندے اور

سچے نائب ثابت ہوئے تو تمہارا اصلی وطن ''جنت'' ہمیشہ کے لئے
تمہاری ملکیت میں دیدیا جائے گا۔''

(قصص القرآن ج ا ص ۳۱ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم وحوا کو ایک مخصوص درخت سے منع فرمایا تھا اور اس ممانعت کی وجہ اور اسباب اللہ تعالیٰ کے ہی علم میں تھے جب حضرت آدم وحوا نے وہ پھل کھالیا تو وہ اسباب ظاہر ہو گئے جو مخفی تھے یعنی اس درخت کا پھل بشری خصوصیات اور حوائج وضروریات کے اظہار کا ذریعہ بن گیا ایسی انسانی ضروریات جو انسان کو دنیا میں لاحق ہونے والی تھیں حضرت آدم کی یہ بھول یہ درخت اور اس کا پھل آدم وحوا کے دنیا میں نازل ہونے کا ظاہری سبب ہو گیا ورنہ مشیتِ خداوندی اور مصلحتِ ایزدی کے تحت حضرت آدم کو دنیا میں تو آنا ہی تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی تخلیق سے پہلے ہی فرشتوں کو یہ بتادیا تھا کہ ﴿انی جاعل فی الارض خلیفة﴾ میں ''زمین'' پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں قرآن کریم کی کئی آیات میں حضرت آدم کو زمین پر اتارے جانے کا ذکر اور اس کا پس منظر پوری صراحت کے ساتھ ملتا ہے:

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ . وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ (سورۂ البقرۃ آیت ۳۶ پ ۱)

''شیطان نے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دئے اور جہاں وہ تھے انھیں وہاں سے نکلوادیا۔ اور ہم نے ان سے کہا اترو جاؤ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور اب زمین تمہارا ٹھکانہ ہے اور تمھیں ایک عرصہ تک وہیں رہنا ہوگا۔

سورۂ اعراف میں یہ مضمون ذرا وضاحت کے ساتھ آیا ہے:

قَالَ اھْبِطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ○ قَالَ فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَ فِیْھَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْھَا تُخْرَجُوْنَ ○ (سورۃ الاعراف آیت ۲۴،۲۵ / پ ۸)

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اتر جاؤ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اب زمین تمہارا ٹھکانا ہے اور تم ایک عرصہ تک وہیں رہو گے اللہ تعالیٰ نے (مزید) فرمایا تم وہیں جیو گے وہیں مرو گے اور اسی میں سے نکالے جاؤ گے۔"

اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو دنیا میں تو بھیج دیا مگر اپنی رحمت سے دوبارہ جنت میں جانے کا دروازہ کھلا رکھا، راستہ بھی بتلا دیا اور اپنی طرف سے رہنما بھیجنے کی بھی وضاحت فرما دی سورۂ بقرہ اور سورۂ طٰہٰ میں اس کی صراحت ہے:

قُلْنَا اھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعاً فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○

(سورۃ البقرہ آیت ۳۸ پ ۱)

"ہم نے ان سے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت آئے جو اس ہدایت کی پیروی کرے گا اسے کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

قَالَ اھْبِطَا مِنْھَا جَمِیْعاً بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ ھُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰی ○ (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۳ پ ۱۶)

"فرمایا کہ دونوں یہاں سے اتر جاؤ اکھٹے تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو اس ہدایت پر

عمل پیرا ہوگا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ شقی ہوگا۔"

مذکورہ آیات سے حضرت آدمؑ کا دنیا میں نازل کیا جانا بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے واقعۂ آدمؑ کے اسی پہلو کو اردو شعراء نے تلمیحاً استعمال کیا ہے مگر زیبِ داستاں کے اضافہ کے ساتھ اس میں گناہ، سزا، توہینِ آدمؑ، نسلِ انسانی کا آغاز، کرۂ ارضی کی آبادی دنیاوی زندگی کا آغاز، انسانی تہذیب وتمدن کی شروعات اور نسیان وغیرہ اسی ایک تلمیح سے نہ جانے کتنے قسم کے خیالات پیدا کئے ہیں اور مثبت ومنفی دونوں انداز کے معانی تراشے ہیں متعلقہ اشعار اس کی وضاحت کے لئے کافی ہیں:

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک (اقبالؔ)

شجر ہے فرقہ آرائی ہے تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو (اقبالؔ)

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے (غالبؔ)

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی (غالبؔ)

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب سیرا انتظار کر (اقبالؔ)

خلافتِ آدم: حضرت آدمؑ کے قصہ میں یکے بعد دیگرے جتنے پہلو پیدا ہوئے سب حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی کے مظاہر ہیں حضرت آدمؑ کی تکوین و تخلیق، فرشتوں کا سجدہ، ابلیس کا انکار، حوا کی پیدائش، آدم وحوا کی جنت میں رہائش، پھل کھانے کی ممانعت، شیطانی وساوس، ابلیس کی عداوت، اور آدم وحوا کا پھل کھالینا

اور فوراً ہی جنتی لباس کا اتر جانا اور جنت کی نعمتوں سے محروم ہو کر دنیا میں حضرت آدم و حوا کا نزول یہ تمام امور تدریجی طور پر خلافتِ آدم کی تیاری و تمہید تھی سب کچھ خدا تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور ارادۂ الٰہی کے تحت ہو رہا تھا اور حضرت آدمؑ کو خلافتِ الٰہی کے لئے تیار کرنے کے مترادف تھا ان تمام مراحل سے گزار کر بالآخر حضرت آدمؑ کو کرۂ ارضی پر اتارا گیا تا کہ مرضیٔ حق کا اتمام ہو سکے کیونکہ حق تعالیٰ نے تو پہلے ہی فرشتوں سے ارشاد فرما دیا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اس میں ''زمین'' کی صراحت ہے لہٰذا اب اس خلافتِ ارضی اور نیابتِ الٰہی کی خاطر حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا اور ان کے زمین پر اترنے کا جو پس منظر ہے وہ حکمتِ خداوندی کا عین تقاضہ تھا اس طرح حضرت آدم کو شیطان لعین کے مکر و فریب اور اس کے فتنہ و فساد سے بچنے کی تلقین ہو گئی اور عملی تجربہ بھی کہ کس کس طرح سے شیطان آدمؑ اور ان کی ذریت کو بہکا سکتا ہے بہر حال حضرت آدمؑ و حوا کو اس کرۂ ارضی پر اتارا گیا کہ مشیتِ ایزدی کے مطابق یہ دنیا آباد ہو سکے اور آدم زمین پر خلافت الٰہی کی ذمہ داری پوری کر سکیں. خلافتِ الٰہی کے معنی و مفہوم کی تعیین اور خلاصہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے الفاظ میں اس طرح ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں جو اختیار و ارادہ کا مالک ہوگا اور میری زمین پر جس قسم کا تصرف کرنا چاہے گا کر سکے گا اور اپنی ضروریات کے لئے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے گا گویا وہ میری قدرت اور میرے تصرف و اختیار کا ''مظہر'' ہوگا۔'' (قصص القرآن ج ا ص ۲۶ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

گویا انسان کا خود اپنے ارادے اور تصرف و اختیار کا مالک و مختار ہونا بھی اصلاً خلافتِ الٰہی کا مظہر ہے کیونکہ یہ صفات یعنی ارادہ، تصرف، اختیار اور علم دراصل خدا تعالیٰ

• کی صفات ہیں اور انسان کو ان کا مظہر صرف اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ زمین پر اللہ کی خلافت کا فریضہ انجام دے سکے اسی خلافت کی ذمہ داری کو صحیح طریقہ پر انجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو صفت علم سے بھی نوازا آیت کریمہ میں اس کی بھی وضاحت موجود ہے:

وَ عَلَّمَ آدَمَ الاَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ٥ قَالَ يٰۤا آدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ٥

(سورۃ البقرۃ آیت ۳۱/۳۳ پ۱)

"اور سکھا دئے اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے کر کے فرمایا بتاؤ مجھے ان اشیاء کے نام اگر تم سچے ہو فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا آپ نے عطا کیا ہے آپ ہی جاننے والے اور حکمت والے ہیں (پھر اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اے آدم فرشتوں کو ان اشیاء کے نام بتلا دو جب آدم نے فرشتوں کو ان اشیاء کے نام بتا دئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا میں خوب جانتا ہوں آسمانوں اور زمینوں کی مخفی چیزوں کو اور جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کو کائنات کی تمام اشیاء کے

نام سکھا دینے کا ذکر فرمایا ہے یہ فرشتوں پر آدمؑ کی برتری کا اظہار بھی ہے اور خلافت کے استحقاق کا اثبات بھی یہ فرشتوں پر حضرت آدمؑ کی برتری کے اظہار کا دوسرا موقع تھا پہلا موقع فرشتوں کا سجدہ تھا فرشتوں کے سجدے سے بھی حضرت آدمؑ کی خلافت الٰہی کا اظہار واثبات ہی مقصود تھا۔ حضرت آدمؑ کو زمین پر خلافت الٰہی کا فریضہ انجام دینا تھا اور کائناتِ ارضی کی تمام اشیاء سے ان کا واسطہ پڑنا تھا اس لئے انھیں ان تمام اشیاء کے نام اور خواص سے مطلع کر دیا گیا اور زیور علم سے آراستہ کر کے انھیں زمین پر اتارا گیا زمین کو آباد کرنے کے طور وطریقے اصول وضوابط انھیں بتلائے گئے نسلِ انسانی کے تسلسل کی سمجھ عطا کی گئی جس کی شکل یہ تھی کہ ایک روز پیدا ہونے والے لڑکی اور لڑکے کی شادی دوسرے روز پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کے ساتھ ہونے لگی اس طرح دنیا میں انسانی آبادی کا سلسلہ قائم ہوا اور انسانی تہذیب وتمدن وجود میں آیا حضرت آدم پر جو وحی نازل ہوتی تھی اس میں دنیاوی امور کی ہدایات بھی ہوتی تھیں اور انسان کی اخروی سعادت وکامیابی کی رہنمائی وہدایت کے اصول بھی ہوتے تھے اسی لئے حضرت آدمؑ کو بیک وقت نبی اور رسول تسلیم کیا جاتا ہے دنیاوی امور کے لئے آنے والی وحی ان کی شریعت تھی اور اخروی امور کے لئے آنے والی وحی ان کی رسالت کی دلیل تھی حضرت آدمؑ کا براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا بھی ان کی نبوت کی دلیل ہے اس طرح حضرت آدمؑ پہلے انسان پہلے نبی اور پہلے رسول تھے ان کی شخصیت کے یہی تین پہلو ہیں جس سے انھوں نے خلافتِ الٰہی کا حق ادا کیا زمین پر اللہ کے احکامات کی تنفیذ خلافتِ الٰہی کی اصل ذمہ داری ہے اسی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسی مخلوق (انسان) پیدا فرمائی تھی جو کائنات کے خیر وشر میں تمیز کر سکتی ہو اور اپنے ارادے اور تصرف سے خیر وشر دونوں کی تنفیذ کر سکتی ہو لیکن نیابتِ الٰہی کا حق ادا کرتے ہوئے شر کے مقابلے میں خیر کے نفاذ کی علمبردار ہو اگر انسان شر کا علمبردار ہے تو نیابت الٰہی کا حقدار نہیں

کیونکہ شر و فساد تو شیطان کا مشن ہے جس کا اعلان اس نے بارگاہِ خداوندی میں کر دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی منادی کر دی تھی کہ سچے اور مخلص انسان (بندے) شیطانی وساوس کا شکار ہو کر شر کے علمبردار نہیں ہوں گے اپنے رب کی مرضی کے پابند ہوں گے وہی سچے اور مخلص بندے نیابتِ الٰہی کے علمبردار و حقدار ہیں اس خلافتِ الٰہی کا تقاضہ ہے کہ کائناتِ ارضی کو شر و فساد اور تباہی و بربادی سے بچا کر اللہ کی پیدا کردہ ساری مخلوق کے لئے امن و سکون کا گہوارا بنایا جائے اور رب کائنات کی مرضیات کو نافذ کیا جائے ۔

خلافتِ الٰہی کی عظیم ذمہ داری کے علمبردار اور شیطانی وساوس کے شکار انسان کی ہستی کو موضوع بنا کر اردو شعراء نے مختلف تلمیحات تراشی ہیں اور عظمتِ انسان و انسانیت کے معانی و مفاہیم کے لئے اس تلمیح کا سہارا لیا ہے لیکن انسان کے لئے خلافتِ الٰہی کی تلمیح بہت نادر و کمیاب ہے ہاں البتہ اس تلمیح کا منفی استعمال نسبۃً زیادہ ہے یہ انسان کے منفی کردار کا ردِ عمل ہے جس نے شیطان کی خلافت سنبھال لی ہے اور کردار ہی کو موضوع بنا کر تلمیحات تراشی گئی ہیں اس لئے ان میں منفی رنگ ناگزیر ہے شعراء نے بجا طور پر حیرت کا اظہار کیا ہے مثبت انداز میں خلافت الٰہی اور سابت الٰہی کی تلمیح کے اشعار بہت ہی نایاب ہیں بہر حال یہ تلمیح شعراء کی توجہ کی طالب ہے۔

تھا جو مسجود ملائک یہ وہی آدم ہے............!!

ہابیل، قابیل: خالق کائنات نے حضرت آدمؑ و حوا کے ذریعہ اس کرۂ ارضی کو آباد و معمور کرنے کا فیصلہ فرما لیا تھا چنانچہ انھیں زمین پر اتارا اور ان سے نسلِ انسانی کا سلسلہ قائم فرمایا یہ بحث کہ حضرت آدمؑ و حوا کو زمین کے کس حصہ پر اتارا گیا؟ اور دونوں ایک ساتھ ایک جگہ اترے یا الگ الگ حصۂ زمین پر؟ الگ الگ اترے تو پھر یکجا کیسے ہوئے؟ کب ہوئے؟ کہاں ہوئے؟ اس سلسلہ میں بہت سی بے سر و پا لغو باتیں اور بے سند روایات ذکر کی جاتی ہیں قرآن کریم نے ان سے اعراض برتا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنی خاص حکمت کے تحت اس کرۂ ارضی کو آباد و معمور کرنے کے لئے آدمؑ وحوا کو اس دنیا میں اتار دیا تھا مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے ان بے سروپا بحثوں کو رد کرتے ہوئے بڑی اچھی توجیہ پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''قرآن عزیز نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ اس کا اظہار رشد و ہدایت سے غیر متعلق تھا البتہ قلبی رجحان اور نفسیاتی برہان اس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ آدمؑ وحوا ایک ہی جگہ اتارے گئے ہوں تاکہ حق تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے زیر اثر جلد ہی نسل انسانی کی افزائش اپنا کام کر سکے اور اس عالمِ خاکی کے وارث ومکین خدا کی زمین کو آباد کر کے انسانیت کے سب سے بڑے شرف ''خلافت ارضی'' کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔'' (قصص القرآن ج ا ص ۴۱ رمولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

نسل انسانی کی افزائش حضرت آدمؑ وحوا کے دنیا میں اتارے جانے کا ایک مقصد تھا چنانچہ نسل انسانی کا تسلسل قائم ہوا جس کی ابتدائی شکل یہ تھی کہ حضرت آدم کے یہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی توام ولادت ہونے لگی اور حضرت آدم نے یہ دستور بنالیا تھا کہ ایک روز کے پیدا شدہ لڑکے اور لڑکی کی شادی دوسرے روز کے پیدا شدہ لڑکے اور لڑکی کے ساتھ کر دیا کرتے تھے تاکہ افزائش نسل کا سلسلہ تیزی سے آگے بڑھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ہدایت بھی تھی کیونکہ دنیاوی امور کے لئے بھی وحی نازل ہوتی تھی قرآن کریم نے افزائش نسلِ انسانی کی تفصیلات اور اولاد آدم کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ ایک خاص مقصد کے تحت اجمالاً آدم کے ''دو بیٹوں'' کا ذکر کر کے ایک واقعہ کی نشاندہی کی ہے ﴿وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ﴾ اور انھیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ سناؤ قرآن کریم سے ان کے نام کی تعیین نہیں ہوتی البتہ توراۃ میں یہ دونوں نام ہابیل و قابیل مذکور ہیں اور قصہ کی کچھ تفصیلات بھی ہیں قرآن کریم کی مذکورہ آیت

سے ایک حد تک توریت کے بیان کی تائید ہوتی ہے آدمؑ کے دونوں بیٹے یہی ہابیل و قابیل تھے احادیث میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ ہابیل و قابیل کا یہ قصہ افزائشِ نسل انسانی کے پس منظر میں ابھرتا ہے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"دنیائے انسانی میں اضافہ کے لئے حضرت آدمؑ کا یہ دستور تھا کہ حواسے توام پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ درپیش تھا قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیر ہابیل کی ہمشیر سے زیادہ حسین و خوبرو تھی اس لئے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیر سے اس کی (قابیل) شادی ہو اور ہابیل کی اس کی ہمشیر سے (یعنی قابیل کی)۔ (قصص القرآن ج ا ص ۵۸ / مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

ہابیل اور قابیل کے درمیان اصل وجہ اختلاف یہی تھی قابیل اس پر آمادہ نہیں تھا کہ اس کی بہن کی شادی ہابیل سے ہو جائے حضرت آدمؑ کے سمجھانے کے باوجود جب وہ نہ مانا تو حضرت آدمؑ نے دونوں کے درمیان فیصلے کے لئے ایک تجویز رکھی اور یہ فرمایا کہ دونوں خدا کے حضور اپنی اپنی نذر اور قربانی پیش کریں جس کی نذر اور قربانی خدا کی بارگاہ میں قبول کر لی جائے گی اس کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا اس زمانے میں خدا کے حضور نذر و قربانی کا یہ طریقہ تھا کہ قربانی و نذر کی چیز کسی بلند مقام پر رکھ دی جاتی تھی اور آسمان سے ایک آگ اتر کر اس چیز کو جلا دیتی تھی اور یہی بارگاہ خداوندی میں نذر و قربانی کے قبول ہونے کی علامت تھی توریت میں اس کا ذکر ہے یہ طریقہ الہامی تھا۔

حضرت آدمؑ کے کہنے سے دونوں نے قربانی پیش کی اور اپنی اپنی نذر پہاڑ پر رکھ دی اور من جانب اللہ فیصلہ کا انتظار کرنے لگے کچھ وقفہ بعد آسمان سے آگ نازل

ہوئی اور ہابیل کی قربانی کو جلا کر ختم کر دیا اس طرح ہابیل کی قربانی قبول ہو گئی اور ہابیل کے ساتھ قابیل کی بہن کی شادی کا فیصلہ ہو گیا مگر قابیل اس فیصلہ پر اب بھی آمادہ نہ ہوا حالانکہ اس کی نذر کا قبول نہ کیا جانا اس کی کھلی علامت تھی کہ وہ غلطی پر تھا اس نے اپنی توہین محسوس کی اور ہابیل سے کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا اور واقعتاً قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تا کہ اپنی بہن سے خود شادی کر سکے قرآن کریم نے اس قصہ کو شادی کے پس منظر میں نہیں بلکہ خیر و شر کے پس منظر میں بیان کیا ہے اللہ کے لئے نذر و قربانی، اقدام قتل کے گناہ، قتل کی شناعت اور قاتل کی مذمت کے طور پر بیان کیا ہے قرآن نے ہابیل و قابیل کو خیر و شر کی علامت بنا کر پیش کیا ہے دونوں کے کردار کو پیش کر کے خیر کو اختیار کرنے اور شر و فساد سے بچنے کی تلقین کی ہے قرآن نے ہابیل کے کردار کو اجاگر کیا ہے اور قابیل کے کردار کی مذمت کی ہے کیونکہ جب خدائی فیصلہ سامنے آ گیا تو اسے مان لینا چاہیے تھا مگر اس نے خدائی فیصلہ کے خلاف بغاوت کی اور ہابیل کے قتل پر آمادہ ہو گیا اور ہابیل سے اس کا اظہار بھی کر دیا کہ میں تجھے ضرور قتل کر دوں گا اس پر ہابیل نے جواب دیا کہ اگر تو شر پر آمادہ ہو کر میرے قتل کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے تب بھی میں اپنے ہاتھ تیرے قتل سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں میرا خیال ہے کہ خدا کی نافرمانی کا بوجھ اور میرے قتل کا بار اٹھا کر تو خود ہی جہنم رسید ہو جائے گا ظلم کرنے والوں کا آخری ٹھکانہ وہی ہے قرآن کریم نے قابیل و ہابیل کا ذکر کئے بغیر اس قصہ کے اس جز کو بیان کر دیا ہے جو مقصدِ رشد و ہدایت اور عبرت و موعظت سے ہم آہنگ تھا لیکن اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس کا پس منظر جو توریت وغیرہ میں مذکور تھا اس کی بھی تائید ہو جاتی ہے اور وہاں جو جز ناقص تھا اس کی بھی تکمیل ہو جاتی ہے قرآن کریم کے الفاظ و تعبیرات درج ذیل ہیں:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَا ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ . اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ

مِنْ اَحَدِھِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّکَ قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ٥ لَئِنْ مبَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَا اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیکَ لأَقْتُلَکَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمُکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ٥ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ٥ (سورۃ المائدۃ یت ۲۷/۲۹)

''اور اے محمد آپ ان کو آدم کے دو بیٹوں کا صحیح قصہ سنا دیجئے جب کہ دونوں نے ایک ایک نذر پیش کی اور ان میں سے ایک کی نذر قبول ہو گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی دوسرا بولا میں تجھے قتل کر ڈالوں گا پہلے نے کہا کہ اللہ تعالیٰ متقین کا عمل قبول کرتے ہیں اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے دست درازی کرے گا تو بھی میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے میں چاہتا ہوں کہ میرے گناہ اور تیرے گناہ کا بار تیرے ہی سر ہو اور تو دوزخیوں میں سے ہو جائے اور ظالموں کی یہی سزا ہے پھر اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کیا آخر اس کو قتل ہی کر ڈالا اور نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔

ابتداء قتل انسانی: مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تھا اردو شعراء نے صرف قتل کے حوالے سے اس تلمیح کو برتا ہے مطلق قتل کے حوالے سے بھی اور بھائی کے بھائی کو قتل کر دینے کے حوالے سے بھی اس تلمیح کا استعمال کیا ہے یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا قتل

بھائی کے ہاتھوں بھائی کا قتل تھا قابیل نے اپنے ہی بھائی ہابیل کو قتل کر دیا اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں پہلا قتل ایک عورت کی خاطر ہوا اور دنیا انسانی خون سے لالہ زار ہوئی قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ قابیل نے ہابیل کو صرف دھمکی ہی نہیں دی بلکہ اسے قتل کر دیا تھا ﴿فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ.﴾ اس کے نفس نے اسے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کیا چنانچہ اسے قتل کر دیا قرآن نے ﴿قتل أخيه﴾ ''بھائی کا قتل'' کہہ کر شناعت کے اس پہلو کو ابھارا ہے قابیل کا یہ اقدام قتل آج تک قتل انسانی کے سلسلہ کی بنیاد بنا ہوا ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت تک جتنے قتل ہوں گے سب کے گناہ میں قابیل بھی برابر شریک رہے گا کیونکہ اسی نے قتل انسانی کی بنیاد رکھی تھی امام احمد حضرت عبداللہ بن مسعود سے نقل کرتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ لا تقتل نفس ظلماً الا كان على ابن آدم الاوّل كفل من دمها لأنه كان اوّل من سنّ القتل. (مسند احمد)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی دنیا میں ناحق کسی کا قتل ہوتا ہے تو آدم کے بیٹے کی گردن پر اس کا گناہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل ایجاد کیا۔''

قرآن کریم نے اس قصہ کو محض اس خاطر ذکر کیا ہے کہ ظلم و جبر اور شر و فساد کی بنیاد نہ ڈالی جائے کیونکہ اس کا سلسلۂ اثر دور تک پہنچتا ہے اس سے بچنا چاہیے اس کے مقابلے میں خیر و فلاح امن و آشتی ایسی چیزیں ہیں جن کے اچھے اثرات دور تک پھیلتے ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے ان دونوں باتوں کی ابتداء کرنے والے کو اپنے عمل کی بھی سزا یا جزا ضرور ملتی ہے اور جو ان پر عمل پیرا ہوتا ہے اس کے ثواب و عقاب میں بھی ابتداء

کرنے والے شریک رہتے ہیں خیر کا آغاز کیا ہے تو اجر وثواب اور شر وفساد کا آغاز کیا ہے تو عتاب وعقاب کا باعث ہوگا بنی اسرائیل کو یہی بات سمجھانے کی خاطر قرآن کریم نے ''ابنی آدم'' آدم کے دو بیٹوں کا یہ واقعہ نقل کیا ہے جس سے اردو شاعری کو ہابیل وقابیل کی تلمیح میسر آئی ہے مطلق قتلِ انسانی اور قتلِ اخی کی تلمیح کا مصدر ومنبع اور ماخذ بھی یہی ہے قرآن نے بھی قابیل کو شر وفساد کی علامت، قتل انسانی کا مؤسس وبانی قرار دیا ہے جبکہ ہابیل کو شرافت اور خیر کا معیار قرار دیا ہے اردو شعراء نے بھی انھیں معنی میں ہابیل وقابیل کی تلمیح کو برتا ہے بھائی کو قتل کرنا بھائی کے اعتماد کو مجروح قرار دینا، رشتۂ اخوت کو پارہ پارہ کرنا اور بھائی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا جیسے معانی کی بنیاد یہی تلمیح ہے بھائی بن کر بھائی کو لوٹنا دراصل قابیلی فطرت ہے اسی تلمیح کے سہارے اس کی بھرپور ترجمانی اردو شعر وادب میں ملتی ہے خونِ ناحق بہانے والا ہر شخص قابیل ہے۔

اپنے ہی گھر کے کر دیئے آنگن لہولہو
ہر شخص میرے شہر کا قابیل ہو گیا

(ہیرانند سوز)

فسادات کے پس منظر میں ہیرانند سوز نے مذکورہ بالا شعر میں اس تلمیح کا نہایت خوبصورت استعمال کیا ہے اور بڑا بھرپور وار کیا ہے اپنے گھر اور قابیل کی جو مناسبت ہے بڑی لطیف ودقیق اور بڑی معنی خیز ہے اور اس تلمیح کا بڑا بھرپور استعمال ہے قرآن کریم نے جس پہلو کو ابھارا تھا وہی تلمیحی معنی کا اصل محور ومرکز بن گیا ہے اور ہابیل وقابیل کی شادی کا سارا قصہ اپنے کہانی پن کی جاذبیت وکشش اور افسانویت کے باوجود پس منظر میں چلا گیا ہے شعراء نے اس تلمیح کو استعمال تو کیا ہے اور بہت خوب استعمال کیا ہے لیکن یہ تلمیح بہت کم ملتی ہے اور نادر الاستعمال ہے جدید شعراء عالمی سطح کی استعماریت پسندی عالمی سیاسی نظام کے پردے میں ہوسِ ملک گیری اور بالادستی کے

پس منظر میں بڑے خوبصورت انداز میں اس تلمیح کو برت سکتے ہیں اس میں بڑی معنویت بڑی وسعت ہے اور شعری امکانات کے نئے آفاق روشن کئے جا سکتے ہیں اور نئے ابواب کا اضافہ کیا جا سکتا ہے تلاشِ بسیار کے باوجود اس تلمیح کے صرف چند ہی اشعار دستیاب ہو سکے ہیں۔

انسانی موت کا آغاز: قابیل و ہابیل کے قصہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ دنیا میں اس سے پہلے تک کوئی انسان مرا نہیں تھا قتل ہونے والا سب سے پہلا انسان ہابیل تھا نتیجۂ سب سے پہلے مرنے والا انسان بھی وہی تھا اس وقت تک بنی آدم موت سے نا آشنا تھے موت کیا ہوتی ہے انھیں یہ پتہ ہی نہیں تھا ظاہر ہے انھیں اس کا تجربہ ہی نہیں ہوا تھا ہابیل کے قتل سے پہلی بار اس کا اندازہ ہوا کہ فناء حیات کا نام موت ہے اس وقت چونکہ دنیا آباد کی جارہی تھی اس لئے صرف حیات ہی حیات تھی موت کا ذکر نہیں تھا ہابیل کے قتل سے پہلی بار زندہ انسانوں کے لیے مردہ انسان کا مسئلہ نمودار ہوا حضرت آدم کو بھی ابھی تک مردہ انسان کے بارے میں بارگاہِ الٰہی سے کوئی حکم نہیں ملا تھا غصہ اور جوش میں آ کر قابیل نے ہابیل کو مار تو دیا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مردہ ہابیل کا کیا کرے؟؟!! حیران و پریشان ہابیل کا مردہ لئے پھر رہا تھا کہ اللہ تعالٰی نے کوے کا ایک جوڑا بھیجا جو آپس میں لڑے ان میں سے ایک کوا مر گیا تو دوسرے نے اپنی چونچ اور پنجوں کی مدد سے زمین پر ایک گڑھا بنایا اور مردہ کوے کو گھسیٹ کر اس میں ڈال دیا اور اوپر سے زمین برابر کر دی قابیل نے یہ دیکھ کر لاش کو چھپانے کا طریقہ سیکھ لیا اور اسی کے مطابق ہابیل کی لاش دفن کر دی اور خود اپنے آپ پر ملامت کرنے لگا کہ افسوس خود میرے ذہن میں یہ ترکیب کیوں نہ آئی اور مجھے ایک بے حیثیت کوے سے سیکھنا پڑا کیا میں ایک حقیر کوے سے بھی گیا گزرا ہوں......!! قرآن کریم میں یہ مثال موجود ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ۝

(سورۂ المائدہ آیت ۳۱ پ ۶)

''پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کرید رہا تھا تا کہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپائے قابیل بولا افسوس کہ میں اس کوے کے برابر بھی نہیں جو اپنے بھائی کی لاش کو چھپاتا اور شرمندہ ہوا (اپنی حالت پر)''

اس طرح حضرت انسان کو دفن کا طریقہ سکھلانے والا ایک کوا تھا اس میں بھی باری تعالیٰ کی ایک خاص مصلحت شامل تھی ورنہ بصورتِ وحی حضرت آدم کو یا بشکلِ الہام و عقل خود قابیل کو بھی یہ طریقہ بجھایا جا سکتا تھا مگر ہابیل نے جو حرکت کی تھی اس کی وجہ سے اللہ کی مصلحت اس کی متقاضی ہوئی کہ ایک حقیر کوے کو بھیج کر قابیل کو خود اپنی نظروں میں ذلیل و رسوا کر دے مولانا حفظ الرحمٰن کوے کو بھیجنے کی مصلحت پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہابیل خدا تعالیٰ کا مقبول بندہ تھا اور قابیل بارگاہِ الٰہی کا راندہ ہوا اس لئے ضرورت تھی کہ ہابیل کے پاک جسم کی توہین نہ ہو اور نسلِ آدم کی کرامت و بزرگی قائم رکھنے کے لئے بعدِ مردن ''تدفین'' کی سنت قائم ہو جائے اور تقاضائے انصاف تھا کہ قابیل کی اس کمینہ حرکت پر اس کو دنیا میں بھی ذلیل کیا جائے اور اس قابل بنا دیا جائے کہ خود اس کو اپنی بے مائیگیِ عقل و دانش اور کمینگی کا احساس ہو جائے اس لئے نہ اس کو الہام بخشا گیا اور نہ اس کمینہ حرکت کو چھپانے کے

لئے عقل کی روشنی عطا کی گئی بلکہ ایک ایسے حیوان کو اس کا رہنما بنایا گیا جو عیاری و مکاری میں طاق اور دنائتِ طبع میں ضرب المثل ہے۔"

(قصص القرآن ج ۱ ص ۶۱، ۶۲ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

یہی وجہ ہے کہ لاش دفن کر دینے کے بعد قابیل نے یہ بات کہی کہ افسوس مجھے ایک کوے نے دفن کا طریقہ سکھایا کیا میں ایک حقیر کوّے سے بھی گیا گزرا ہوں۔

ہابیل و قابیل کے قصہ کا یہ رخ یعنی انسان کی پہلی بار موت سے آشنائی، کوّے کی آمد اور دفن کی تعلیم اور قابیل کی ندامت و افسوس ایسے عناصر ہیں جو تلمیحات کے پیرائے میں ڈھالے جا سکتے ہیں اپنے ناقص مطالعے اور حقیر جستجو کے باوجود یہ تینوں عناصر بطور تلمیح دستیاب نہیں ہو سکے اس لئے بطور نشاندہی ان کی مختصر تفصیل ذکر کر دی گئی ہے اور صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے ....!

نہیں یہ جوشِ گل و لالہ نکل آیا ہے
داد خواہی کے لئے خاک سے خونِ ہابیل (ذوقؔ)

مت پھول دلا ربطِ مواخاتِ جہاں پر
قابیل نے توڑی ہے نہ ہابیل کی گردن (انشاء)

اپنے گھروں کے کر دیئے آنگن لہو لہو
ہر شخص میرے شہر کا قابیل ہو گیا (ہیرانند سوز)

آئینے میں بھی روپ بدلتا ہے میرا عکس
ہابیل کی طرح کبھی قابیل کی طرح (مظفر حنفی)

شک جس نے بھی کیا کسی معصوم ذات پر
اس کا سلوک خنجرِ قابیل ہو گیا (قمر حیدر قمرؔ)

تلمیحات قصۂ حضرت نوح علیہ السلام

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام

۲۔ دعائے نوح علیہ السلام

۳۔ طوفان نوح علیہ السلام

۴۔ سفینہ نوح علیہ السلام

۵۔ عمر نوح علیہ السلام

۶۔ ابن نوح علیہ السلام

تلمیحات قصۂ نوح علیہ السلام

عمر نوح: آٹھ واسطوں سے حضرت نوح علیہ السلام کا نسب نامہ ابوالانبیاء حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچتا ہے قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کا تذکرہ ۴۳ جگہ آیا ہے حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے توریت اور انجیل وغیرہ کی روایت کی روشنی میں یہ مدت ۱۰۲۶ سال ہے اس طویل عرصہ میں حضرت آدمؑ کی نسل شرک و کفر کی تاریکی و ضلالت میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو چکی تھی چنانچہ اللہ تعالی نے حضرت نوحؑ کو نبوت کے ساتھ رسالت سے بھی سرفراز فرمایا تھا اور انھیں مستقل شریعت بھی عطا کی تھی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ عالم انسانیت میں حضرت نوحؑ پہلے رسول ہیں حضرت نوحؑ کو دعوت و تبلیغ کے لئے جو عمر عطا کی گئی تھی وہ بھی خاصی طویل تھی قرآن کریم میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ٥

''اور ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے درمیان ساڑھے نو سو سال رہے۔''

اس آیت کی روشنی میں حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال مقرر ہوتی ہے جو موجودہ انسانی عمر کے اعتبار سے ایک غیر طبعی بات معلوم ہوتی ہے لیکن تاریخ کی روشنی

میں انسان قدیم کی عمر اور اس کے قد و قامت کی جو بشارتیں ملی ہیں اس سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قدیم انسان کی عمر کا تناسب موجودہ تناسب سے کہیں زیادہ تھا صاحب قصص القرآن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

> ''قرآن عظیم نے کسی نبی اور پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کی مدت کا صراحت کے ساتھ اس طرح ذکر نہیں فرمایا جیسا کہ حضرت نوحؑ کے واقعہ میں مذکور ہے۔'' (قصص القرآن)

قرآن کریم میں خصوصیت کے ساتھ ان کی عمر کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کے اپنے دور کے اعتبار سے بھی ساڑھے نوسو برس کا عرصہ غیر معمولی ہی رہا ہوگا اور قرآن کریم میں ذکر صرف مدت تبلیغ کا ہے ورنہ اصل عمر تو اس سے زیادہ ہی تھی۔ بہر حال طویل عمر اور طویل ترین عمر کے لئے اردو شاعری میں عمر نوح کی تلمیح معروف ہے اس تلمیح میں عمر نوح کی معنویت کا پس منظر مذکورہ آیت سے روشن ہوتا ہے۔

جاں بخش لب سے فیض جو مل جائے آپ کو
طوفاں میں عمر نوح ملے ہر حباب کو
(میرؔ)

وہ بحر ہے دریائے سرشک اپنا کہ جس کا
ملاح تو کیا نوح کو ساحل نہیں معلوم
(مصحفی)

دعاء نوح: حضرت نوحؑ خدا کے برگزیدہ پیغمبر و نبی تھے انہوں نے اپنی قوم کو راہ راست پر لانے کے لئے شدید جد و جہد کی مگر قوم کی طرف سے سرکشی، بغاوت، ہٹ دھرمی اور کج حجتی میں اضافہ کے علاوہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، قرآن کریم نے حضرت نوحؑ کے الفاظ میں اس طویل صبر آزما جد و جہد کو یوں بیان کیا ہے:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّ نَهَارًا ٥ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا ٥ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ٥ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ٥ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ٥ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ٥ (سورۂ نوح آیت ۵تا۱۰پ۲۹)

"پھر نوح نے دعا کی اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات اور دن دعوت دی سو میرے بلانے نے ان کا گریز اور بھی بڑھا دیا میں نے جب کبھی ان کو بلایا تا کہ تو انہیں بخش دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں اور اپنے اوپر اپنے کپڑے لپیٹ لئے اور اڑے رہے اور نہایت درجہ کا تکبر کرتے رہے پھر میں نے ان کو بآواز بلند بھی بلایا پھر میں نے انہیں اعلانیہ بھی سمجھایا اور بالکل خفیہ بھی سمجھایا چنانچہ میں نے ان سے کہا اپنے پروردگار سے مغفرت چاہو وہ بے شک بڑا بخشنے والا ہے۔"

نو سو پچاس سال کی پیغمبرانہ دعوتی جدو جہد کے بعد بھی سوائے چند افراد کے جب ان کی قوم راہ خداوندی پر نہیں آئی اور کسی صورت سے حضرت نوح کی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوئی تو انہیں سخت تکلیف پہنچی اور ان کی مایوسی بڑھ گئی چنانچہ اللہ تعالٰی نے ان کی مایوسی کے ازالہ کے لئے اور ان کے اطمینان خاطر کے لئے یہ وحی نازل فرمائی:

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ٥ (سورۂ ہود آیت ۳۶ پ۱۲)

"اور نوح کے پاس وحی بھیجی گئی کہ تمہاری قوم میں سے اب کوئی

ایمان نہیں لائے گا بجز ان کے جو ایمان لا چکے سو جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں اس پر کچھ غم نہ کرو۔"

اس وحی الٰہی سے حضرت نوحؑ کو یہ اطمینان ہو گیا کہ خود ان کی طرف سے تبلیغ و رسالت کے فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کمی نہیں رہی بلکہ قوم کی گمراہی و ضلالت پر ہی مہر لگا دی گئی ہے چنانچہ حضرت نوحؑ نے قوم کی بدتمیزیوں اور بدسلوکیوں کے نتیجہ میں جنھیں وہ اب تک محض دعوت الی اللہ کی خاطر برداشت کرتے چلے آ رہے تھے قوم کے حق میں پہلی بار یہ دعا کی کہ الٰہی جب انہیں ایمان لانا ہی نہیں ہے تو زمین کو ان کے وجود سے پاک فرما دے۔

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا ○ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ○ (سورۂ نوح آیت ۲۶ تا ۲۸ پ ۲۹)

"اور نوح نے یہ بھی عرض کی کہ اے میرے پروردگار زمین پر کافروں میں سے ایک بھی باشندہ جیتا مت چھوڑ اگر تو انہیں رہنے دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے رہیں گے اور ان سے کافر و فاجر ہی اولاد پیدا ہوتی رہے گی اے میرے پروردگار مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور جو بھی میرے گھر میں داخل ہو بحیثیت مومن کے اور کل ایمان والوں اور ایمان والیوں کو اور ظالموں کی ہلاکت کو تو بڑھاتا ہی جا۔"

پیغمبر وقت حضرت نوحؑ کے دکھی دل سے بددعا نکلی تھی بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت سے نوازا گیا جس کے نتیجہ میں طوفان نوح برپا ہوا اور ان کی قوم کا ایک ایک فرد

ایمان نہیں لائے گا بجز ان کے جو ایمان لا چکے سو جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں اس پر کچھ غم نہ کرو۔"

اس وحی الٰہی سے حضرت نوحؑ کو یہ اطمینان ہو گیا کہ خود ان کی طرف سے تبلیغ و رسالت کے فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کمی نہیں رہی بلکہ قوم کی گمراہی و ضلالت پر ہی مہر لگا دی گئی ہے چنانچہ حضرت نوحؑ نے قوم کی بدتمیزیوں اور بدسلوکیوں کے نتیجہ میں جنھیں وہ اب تک محض دعوت الی اللہ کی خاطر برداشت کرتے چلے آ رہے تھے قوم کے حق میں پہلی بار یہ دعا کی کہ الٰہی جب انہیں ایمان لانا ہی نہیں ہے تو زمین کو ان کے وجود سے پاک فرما دے۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ رَبِّ اغْفِرْ لِىْ وَ لِوَالِدَىَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِىَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝ (سورۂ نوح آیت ۲۶ تا ۲۸ پ ۲۹)

"اور نوح نے یہ بھی عرض کی کہ اے میرے پروردگار زمین پر کافروں میں سے ایک بھی باشندہ جیتا مت چھوڑ اگر تو انہیں رہنے دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے رہیں گے اور ان سے کافر و فاجر ہی اولاد پیدا ہوتی رہے گی اے میرے پروردگار مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور جو بھی میرے گھر میں داخل ہو بحیثیت مومن کے اور کل ایمان والوں اور ایمان والیوں کو اور ظالموں کی ہلاکت کو تو بڑھاتا ہی جا۔"

پیغمبر وقت حضرت نوحؑ کے دکھی دل سے بددعا نکلی تھی بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت سے نوازا گیا جس کے نتیجہ میں طوفان نوح برپا ہوا اور ان کی قوم کا ایک ایک فرد

تباہ کردیا گیا انہیں آیات کی روشنی میں دعائے نوح کی تلمیح تراشی گئی ہے۔جس سے شعراء نے اپنے کلام کو مزین کیا ہے۔

آہ میری کب دعائے نوح ہے
چشم تر طوفاں اٹھانا چھوڑ دے

اشک گریہ کو طوفان سے تعبیر کر کے شاعر یہ فریاد کر رہا ہے کہ اے چشم تر اتنا زبردست طوفان نوح برپا کرنے کی کیا ضرورت تھی میری ذرا سی آہ دعائے نوح تو تھی نہیں جس کے نتیجہ میں طوفان نوح کی طرح سیلاب اشک امڈ آئے شاعر نے دونوں مصرعوں میں واقعہ نوحؑ کی تلمیح سے فائدہ اٹھایا ہے دعائے نوح سے ہی طوفان نوح کی طرف اشارہ مقصود ہے۔جس کے نتیجہ میں طوفان نوح برپا ہوا تھا اس تلمیح کے استعمال سے شعر کی معنویت میں غیر محسوس طور پر مبالغہ پیدا ہو گیا ہے۔جو شاعر کا مقصود ہے لیکن تلمیح کے استعمال کی وجہ سے شعر کی معنویات ولفظیات نہ صرف مبالغہ کے عیب سے محفوظ ہے بلکہ ایک حسن پیدا ہو گیا ہے۔

طوفان نوح: حضرت نوحؑ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کی ہدایت کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور انہیں اللہ کی طرف بلاتے رہے اس طویل عرصہ میں انہیں اپنی قوم کے بغض وعناد، سرکشی، بغاوت اور طعن وتشنیع کے ساتھ ساتھ شدید ذہنی وجذباتی کوفت سے دوچار ہونا پڑا مگر وہ پیغمبرانہ صبر واستقلال کے ساتھ تبلیغ ودعوت اور رشد وہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے لیکن جب وحی الٰہی (وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ ... الخ کے نتیجہ میں انہیں اطمینان ہو گیا کہ قوم کی قسمت پر مہر لگا دی گئی ہے تو انھوں نے قوم کے حق میں ہلاکت وبربادی کی دعا مانگی جس کے نتیجہ میں اللہ تعالی نے طوفان نوح نازل فرمایا اور ان کی قوم ہلاک وبرباد ہو گئی حضرت نوح کی اس دعا سے پہلے خود قوم نوح نے اپنی ہلاکت وبربادی کا سامان فراہم کر لیا تھا اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ اے نوح بہت

ہو چکا ہم ماننے والے نہیں ہیں اور تم خدا کے جس عذاب وعقاب سے ڈراتے رہتے ہو وہ لے آؤ قرآن کریم نے قوم نوح کے اس باغیانہ مطالبہ اور احمقانہ جرأت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ٥ (سورۂ ہود آیت ۳۲ پ ۱۲)

''وہ بولے اے نوح تم ہم سے بحث کر چکے اور بحث بھی خوب کر چکے
اب ہمارے سامنے وہ چیز لے آؤ جس سے تم ہم کو دھمکایا کرتے ہو
اگر تم سچے ہو۔''

حضرت نوح نے ان کی اس جرأت فاسقانہ کے بعد بھی پیغمبرانہ صبر وسکون کے ساتھ صرف اتنا کہا کہ عذاب الٰہی میرے قبضہ میں نہیں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے اگر وہ چاہے گا تو عذاب نازل کر دے گا جس کو قرآن نے اس طرح نقل کیا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ٥

(سورۂ ہود آیت ۳۳ پ ۱۲)

''نوحؑ نے کہا اسے تو بس اللہ ہی تمہارے سامنے لائے گا اگر اس کی
مشیت ہوئی اور تم اسے ہرا نہیں سکتے۔''

عذاب الٰہی کے سلسلہ میں یہ سنت اللہ نظر آتی ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کے نبی اور اس کی دعوت کے خلاف بغض وعناد اور تمرد وسرکشی میں اس حد تک جری ہو جاتی ہے کہ عذاب الٰہی سے ڈرنے کے بجائے اس کا مطالبہ کرنے لگتی ہے تب ہی عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے ورنہ اللہ جل شانہ یوں ہی کسی قوم پر عذاب نازل نہیں فرماتے قوم نوح نے بھی یہی حماقت کی حضرت نوح اور ان کی قوم کا یہ مناقشہ ومباحثہ اور حضرت نوح کی دعا عذاب الٰہی کی تمہید تھی چنانچہ عذاب الٰہی آیا اور طوفان بادوباراں کی ہولناک شکل

میں آیا زمین سے پانی اُبلنا شروع ہوا آسمان سے موسلا دھار طوفانی بارش شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑوں کی مانند موجیں بلند ہونے لگیں شمال سے جنوب تک، مشرق سے مغرب تک اور زمین سے آسمان تک پانی ہی پانی نظر آنے لگا قرآن کریم نے اس ہولناک طوفان کا تذکرۃ ان الفاظ میں کیا ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ۝ تَجْرِىْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ (سورۃ القمر آیت ۱۱ تا ۱۴ پ ۲۷)

"سو ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے بکثرت برسنے والے پانی کے لئے اور زمین میں چشمے پھوڑ دیئے سو پورا پانی مل گیا اس کام کے لئے جو تجویز ہو چکا تھا اور ہم نے نوح کو سوار کر دیا تختوں اور میخوں والی کشتی پر جو ہماری نگرانی میں رواں تھی یہ سب انتقام میں اس شخص کے تھا جس کا انکار کیا گیا تھا۔"

عذاب الٰہی کی شدت اور اس کی تباہی و بربادی کا اندازہ اس آیت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ بھی کئی مقامات پر عذاب قوم نوحؑ کا تذکرہ ملتا ہے طوفان نوحؑ کے سلسلہ میں یہ بحث بھی ہے کہ آیا طوفان نوح ساری دنیا پر طاری کیا گیا تھا یا صرف وہی علاقہ اس کی زد میں آیا تھا جہاں قوم نوح آباد تھی اس بحث میں دونوں قسم کی آراء پائی جاتی ہیں لیکن تطبیق کی شکل یہی نکالی گئی ہے کہ انسانی آبادی کی دنیا اس وقت اتنی ہی تھی جو ہلاک و برباد کر دی گئی اور طوفان نوح کے بعد از سر نو دنیا آباد کی گئی اور موجودہ انسانی آبادی کا تسلسل قوم نوحؑ کے جو اہل ایمان باقی رہ گئے تھے ان سے قائم ہے اسی لئے حضرت نوح کو تلمیحاً آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے، بہر حال طوفان، سیلاب، اس کا

پس منظر اس کی شدت و تباہی اور انسانوں کی دوبارہ آبادی ایسے مضامین ہیں جن سے طوفان نوح کی تلمیح تشکیل پاتی ہے اور یہ سارے مضامین اس کی معنوی پرتوں کو تہہ دار بناتے ہیں اور شعراء نے اس کا فراخدلانہ استعمال کیا ہے اور خوب خوب معانی تراشے ہیں اور طوفان نوح کی تلمیح کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔

طوفان نوح نے تو ڈبوئی زمیں فقط
میں ننگ خلق ساری خدائی ڈبو گیا

(خواجہ میر درد)

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

(نوح ناروی)

طوفان چونکہ بارش اور سیلاب کی شکل میں تھا اس لئے شعراء نے اشک گریہ کے ساتھ اس کی مناسبت پیدا کی ہے اور بڑے عجیب عجیب معانی تراشے ہیں حالانکہ قرآن کریم نے طوفان نوح کا ذکر اللہ اور اس کے خلاف بغاوت و سرکشی کی پاداش بیان کرنے کے لئے کیا ہے تاکہ دیگر اقوام عبرت و موعظت حاصل کریں لیکن طوفان کی یہ غرض و غایت جو آیات قرآنی کی اصل روح اور تلمیح کی بنیاد ہے شعراء کے یہاں مفقود ہے اصالتہً وضمناً کسی بھی طرح اس کا ذکر نہیں ملتا ہاں البتہ دیگر معانی پیدا کرنے میں شعراء نے کمال کر دکھایا ہے اور کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے شعراء نے شعریت کا خوبصورت لباس پہنا کر اس طوفانی تلمیح کو جاذب و پرکشش بنا دیا ہے اس میں شعراء کی فنکاری سے زیادہ اردو بیانیہ کا کمال ہے جس نے اس تلمیح کے پس منظر کی ساری معنوی پرتوں اور تہوں کو پوری طرح سمیٹ لیا ہے اشعار سے اس تلمیح کے تنوع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے عیسیٰ سے جو پوچھا چشمِ گریاں کا علاج
یوں لگا کہنے کرے گا نوح طوفان کا علاج (مصحفی)

جہاں میں گرچہ نہ پہونچا بہم مجھے دل خواہ
یہ نوح کیسے تو طوفاں ہزار لایا ہے (میرؔ)

طوفان نوح آنکھ نہ ہم سے ملا سکے
آتی نظر ہیں چشم سے ہر پل عیاں عیوں (انشاءؔ)

طوفان رشک نوح علیہ السلام ہے
بولا کہ آپ کے بھی سفینے پہ حرف ہے (انشاءؔ)

ایک دن فرصت جو میں برگشتہ قسمت مانگتا
دیدۂ تر نوح کے طوفان کی رخصت مانگتا (آتشؔ)

پار اُتریں خاک بحر محبت کی کشتیاں
طوفان نوح رہتا ہے بادِ مراد سے (آتشؔ)

طوفان نوح ہے مرے اشکوں کے جوش سے
مرغِ ہوا سے ماہیٔ دریا بلند ہے (آتشؔ)

سنا ہے نوح کے طوفان کو یاروں نے کانوں سے
مگر آنکھوں سے اپنے ہم نے وہ دیکھا ہے رونے میں (بہادر شاہ)

پھر آئے ابھی نوح کا طوفاں تو عجب کیا
دریائے سرشک اپنا اگر جوش میں آوے (بہادر شاہ)

اے چشم یہ توقع نہ تھی تجھ سے مجھ کو تو
برپا کرے ہے نوح کا طوفان کیا سبب؟ (بہادر شاہ)

نہ کرتا نوح کے طوفان کا کوئی ذکر بھی ہرگز
اگر مردم ہمارا ماجرائے چشم نم سنتے (بہادر شاہ)

میری آنکھیں نوح کے طوفان کی دکھلائی تھیں سیر
ان کی چتون نے تو دکھلایا تماشا حشر کا (مومن)

اب کے جو نوح کا طوفان اُٹھے تو لوگو
ناؤ پر آنا پہاڑوں کی طرف مت جانا (نامعلوم)

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان ہوگیا (حیا)

کہتا ہے جسے نوح کا طوفان زمانہ
قطرہ کوئی ٹپکا تھا مرے دامن تر کا (نامعلوم)

سفینۂ نوح: اللہ تعالیٰ نے طوفان بادو باراں قوم نوح پر عذاب کی شکل میں نازل فرمایا تھا اس لئے ضروری تھا کہ وہ لوگ جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے وہ بچا لئے جائیں اور یہ سنت اللہ ہے کہ جب کسی نبی کی دعا یا بد عا کے نتیجہ میں عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے تو نبی کے متبعین کو بچا لیا جاتا ہے چنانچہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین کو عذاب الٰہی کی تباہی سے بچانے کی خاطر نوحؑ کو عذاب کی آمد سے قبل ہی کشتی بنانے کا حکم فرما دیا تھا اور وحی کے ذریعہ اپنی نگرانی میں کشتی تیار کروائی تھی۔

فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ اَنْ اَصْنَعَ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا

(سورۂ المومنون آیت ۲۷ پ ۱۸)

''پس ہم نے ان کے پاس حکم بھیجا کہ کشتی ہماری نگرانی میں ہمارے حکم سے تیار کرو۔''

وَاصْنَعِ الْفُلْکَ بِأَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا (سورۂ ہود آیت ۳۷ پ ۱۲)

''اور تم کشتی ہماری نگرانی میں ہمارے حکم سے تیار کرو''

چنانچہ جب حضرت نوحؑ نے وحی الہی کے مطابق کشتی بنانا شروع کی تو ان کی قوم نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اس سلسلہ میں حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا جو مکالمہ ہوا قرآن کریم نے اس کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوْا مِنْهُ . قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ (سورۂ ہود آیت ۳۸، ۳۹ پ ۱۲)

''اور نوح کشتی بنانے لگے اور جب جب ان کی قوم کے سردار ان کے پاس سے گزرتے تو ان سے تمسخر کرتے (نوحؑ جواب دیتے) اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو ہم بھی تم پر ہنسیں گے جیسا کہ تم ہنس رہے ہو، سو ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون ہے جس پر ایسا عذاب آنے کو ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور اس پر دائمی عذاب نازل ہونا ہے۔''

قرآن کریم نے کشتی کی جزئیات اور تفصیلات نہیں بیان کی ہیں لیکن توریت وانجیل کی روایات کی روشنی میں یہ کشتی ساگ کی لکڑی کی بنائی گئی تھی اس کی اونچائی ۳۰ گز بیان کی گئی ہے جو سہ منزلہ تھی نچلا حصہ جانوروں کے لئے درمیانی حصہ انسانوں کے لئے اور اوپری حصہ پرندوں کے لئے مخصوص تھا اور ہر منزل کا درمیانی فاصلہ دس دس گز تھا کشتی کی لمبائی ۸۰ گز سے لے کر ۲۰۰ گز اور چوڑائی ۵۰ گز سے لے کر ۶۰۰ گز تک علی اختلاف الروایات بیان کی گئی ہے مذکورہ معلومات اور روایات کی تحقیق وصحت کا کوئی

قطعی ثبوت یا ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے اور خود قرآن کریم نے اس کی وضاحت سے اعراض کیا ہے لیکن توریت وانجیل کی ان روایات سے اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کشتی کوئی معمولی نوعیت کی نہیں تھی بڑی دیوہیکل اور بڑی زبردست کشتی تھی کیونکہ قرآن کریم میں اس بات کی صراحت ضرور ملتی ہے کہ اس کے اندر ہر قسم کے جانداروں کا ایک ایک جوڑا سوار کیا گیا تھا اور بقیہ تعداد ایمان لانے والے انسانوں کی تھی جو ۸۰ یا ۸۵ سے زائد نہیں تھی۔

حَتّٰی اِذَا جَاءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَکَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ وَ مَا آمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِیْلٌ۝ (سورۂ ہود آیت ۴۰ پ۱۲)

''اس طرح کے مکالمات جاری رہے یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور زمین سے پانی ابلنا شروع ہوا ہم نے کہا اس کشتی میں ہر قسم کے جوڑوں میں سے دو دو کو چڑھا لو اور اپنے گھر والوں کو بھی بجز ان کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے اور ایمان والوں کو بھی اور ان کے ساتھ بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔''

اسی سلسلہ کی دوسری آیت یہ ہے :

فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ فَاسْلُکْ فِیْهَا مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَکَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ وَ لَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُغْرَقُوْنَ۝

(سورۂ المؤمنون آیت ۲۷ پ۱۲)

''پس ہم نے ان کے پاس حکم بھیجا کہ کشتی ہماری نگرانی میں اور

ہمارے حکم سے تیار کرو پھر جب ہمارا حکم آ پہنچے اور زمین سے پانی ابلنا شروع ہو جائے تو ہر قسم (کے جانوروں) میں سے دو دو عدد اس میں رکھ لو اور اپنے گھر والوں کو بھی اس میں سوار کر لو بجز ان کے جن پر ان میں سے غرق کا حکم نازل ہو چکا ہے اور مجھ سے ظالموں کے بارے میں کچھ نہ کہنا بے شک وہ سب غرق ہو کر رہیں گے۔"

جب طوفان کی آمد کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں تو نوحؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سب کو کشتی میں سوار کر لیا۔

قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ الرَّحِيْمٌ○ وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ

(سورۂ ہود آیت ۴۱/۴۲ پ ۱۲)

"اور فرمایا آؤ اس میں سوار ہو جاؤ اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا بھی، بے شک میرا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا رحمت والا ہے اور وہ کشتی انہیں لے کر پہاڑ جیسی موجوں کے درمیان چلنے لگی۔"

دوسری جگہ یہی مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ○

(سورۂ المؤمنون آیت ۲۸ پ ۱۸)

"پھر جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی پر بیٹھ چکیں تو کہنا ساری حمد اللہ کے لئے ہے جس نے ہم کو ظالم لوگوں سے نجات دی۔"

لوفان کا زور بڑھتا گیا اور کشتی بلند ہوتی چلی گئی:

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِيَةِ o لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌo (سورۂ الحاقۃ آیت ۱۱/۱۲)

''ہم ہی نے جبکہ پانی میں طغیانی ہوئی تمہیں کشتی میں سوار کیا تا کہ اس واقعہ کو ہم تمہارے لئے یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کو یاد رکھیں۔''

مذکورہ آیات سے کشتی کی ہیئت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کشتی نوح واقعی دیو پیکر کشتی تھی اور ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ طوفان بھی بلا کا تھا اسی لئے کشتی بھی اسی اعتبار سے تیار کرائی گئی تھی کشتی میں دنیا میں پائے جانے والے تمام جانوروں کا ایک ایک جوڑا تھا چرند پرند درند اور حشرات الارض کے علاوہ انسانوں کا بھی ایک گروہ موجود تھا جن کے ذریعہ طوفان کے بعد دوبارہ دنیا بسانے کا کام لیا جانا تھا چنانچہ جب طوفان تھما اور پانی کم ہونا شروع ہوا تو یہ کشتی جودی پہاڑ پر پہنچ کر ٹھہر گئی اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیلاب بلاخیز کی آبی سطح پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی کتنی بلند تھی قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے:

قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَo (سورۂ سورہ ہود آیت ۴۴ پ ۱۲)

''ارشاد ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا، اور پانی گھٹ گیا اور کام پورا ہو گیا اور کشتی آ ٹھہری جودی پر اور کہہ دیا گیا کہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے لوگ رحمت سے دور ہو گئے۔''

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ (سورۂ ہود آیت ۴۸ پ ۱۲)

''ارشاد ہوا کہ اے نوح اترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں لے کر
اپنے اوپر بھی اور ان جماعتوں کے اوپر بھی جو تمہارے ساتھ ہیں''

اللہ تعالیٰ نے نوحؑ اور ان کی امت کے صاحب ایمان افراد کو طوفان سے بچا کر بسلامت وعافیت دوبارہ زمین پر اترنے کی بشارت دی۔''

فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَ اَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَةِ وَ جَعَلۡنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۝

(سورۂ عنکبوت آیت ۱۵ پ ۲۰)

''پھر ہم نے ان کو اور کشتی والوں کو بچالیا اور ہم نے اس واقعہ کو دنیا جہان والوں کے لئے نشان بنادیا۔''

فَكَذَّبُوۡهُ فَنَجَّیۡنٰهُ وَ مَنۡ مَّعَهٗ فِی الۡفُلۡكِ وَ جَعَلۡنٰهُمۡ خَلٰٓئِفَ وَ اَغۡرَقۡنَا الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا فَانۡظُرۡ كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ۝ (سورۂ یونس آیت ۷۳ پ ۱۱)

''تو انہوں نے نوح کو جھٹلایا، پھر ہم نے نوحؑ کو اور جو لوگ کشتی میں ان کے ساتھ تھے ان کو نجات دی اور ہم نے انہیں آباد کیا اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا انہیں ہم نے غرق کردیا''

ان آیات میں عذاب الٰہی کی شدت، کشتیٔ نوح، اور اس میں سوار ہونے والوں کے بچ جانے اور ان کو دوبارہ زمین پر آباد کردینے کا اور ان پر انعام واکرام کا ذکر بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ آیا ہے اردو شاعری میں کشتیٔ نوح کی تلمیح بڑی مشہور ومعروف ہے اردو شاعری میں نوح کی کشتی نجات کا استعارہ ہے شعراء اس سفینۂ نجات کو ہر قسم کے طوفان سے گزار دیتے ہیں یہ تلمیح کیسے تخلیق ہوئی کیا اس کا پس منظر تھا راس کی معنوی پرتیں کیا ہیں اور کیسے روشن ہوتی ہیں شعراء نے کیسے کیسے ان معنوی توں کو برتا ہے یعنی شعراء کے مطلوبہ معانی کی گنجائش کیسے اور کہاں سے پیدا ہوئی اور

کشتی نجات کا استعارہ کیسے بنی وغیرہ وغیرہ یہ پوری بحث مذکورہ آیات کو جانے اور سمجھے بغیر ممکن نہیں یہی اس تلمیح کی تخلیق کا اصل پس منظر ہے جس کی روشنی میں اس کے استعمال پر غور کیا جانا چاہیے شعر کہنے کے علاوہ شعر سمجھنے کے لئے اور شعر سے لطف اندوز ہونے کے لئے بھی اس کا جاننا ضروری ہے عام طور پر یہ تلمیح سفینۂ نجات کے مفہوم میں ہی مستعمل ہے۔

ایک جدید شاعر نے طوفان نوح کے اس پس منظر میں کشتیٔ نجات کا بہت خوب اور خوبصورت استعمال کیا ہے۔

اب کے جو نوح کا طوفان اٹھے تو لوگو

ناؤ پر آنا پہاڑوں کی طرف مت جانا

جب طوفان اٹھنے لگا تو ابن نوح نے یہی کہا تھا کہ میں سیلاب سے بچنے کے لئے پہاڑوں پر پناہ حاصل کرلوں گا قرآن نے اس کا قول نقل کیا ہے:

سَاٰوِیۡۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ مِنَ الۡمَآءِ

(سورۂ ہود آیت ۴۳ پ ۱۲)

''میں ابھی کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔''

لیکن پہاڑ ابن نوح کو پانی سے نہیں بچا سکے بچنے کی کوئی شکل تھی تو صرف کشتیٔ نوح تھی شاعر کشتی پر آنے کی دعوت اس لئے دے رہا ہے کہ یہ کشتی کشتیٔ نجات ہے کیونکہ اس کا کھیون ہار اللہ کا برگزیدہ نبی و پیغمبر ہے شاعر نے طوفان نوح اور ناؤ کی تلمیح استعمال کر کے شعر کی معنویت میں زبردست اضافہ اور بے پناہ وسعت پیدا کی ہے اور بڑا لطف پیدا کیا ہے پیغمبر کی دعوت پر ایمان لانا سفینۂ نجات پر سوار ہو جانا ہے طوفان نوح اور ناو حق و باطل کے لطیف استعارے ہیں جن کا فنکارانہ استعمال تلمیحی معنویت کا رہین منت ہے جب بھی حق و باطل کا معرکہ درپیش ہوا اور طوفان باطل حق کو نیست و نابود

کرنے کے در پے ہو پیغمبرانہ دعوت پر لبیک کہنا کشتی نجات پر سوار ہو جانا ہے کیونکہ طوفان عذاب الٰہی کی شکل میں تھا اور عذاب الٰہی سے بچنے کا واحد ذریعہ ایمان ہے جس کی دعوت پیغمبر وقت ہمیشہ سے دیتے آئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے یہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ تلمیح اپنے حقیقی اور اصلی معنی میں بھی ملتی ہے اور دیگر معانی میں بھی مستعمل ہے مندرجہ ذیل اشعار سے اس کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ ؎

طوفان میں ناخدائی کی کشتی نوح کی
حقا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا (آتش)

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا ٹھہرا آ کر جہاں سفینا (اقبالؔ)

گردش دوراں سے مردان خدا بے باک ہیں
نوح کی کشتی کو اندیشہ نہیں گرداب میں (آتش

کشتی مئے کو اے خدائے صبوح
بخش دے قسمت سفینۂ نوح (جوشؔ)

ہاں نوح کی کشتی کی تقدیر ملے تجھ کو
اس بحر سیاست کے بپھرے ہوئے طوفاں میں (جوشؔ)

طوفان رشکِ نوح علیہ السلام ہے
بولا کہ آپ کے بھی سفینے پہ حرف ہے (انشاء)

کشتی نوح سے ہی کود پڑوں طوفان میں
دیں سہارا جو مجھے پار اُترنے والے (نامعلوم)

ابن نوح: حضرت نوحؑ کے قصے میں ایک تلمیح ابن نوح کی بھی ہے حضرت نوح اللہ کے نبی ورسول تھے ساری قوم کو اللہ کی طرف بلاتے رہے جو لوگ ان کی دعوت پر ایمان

کشتی نجات کا استعارہ کیسے بنی وغیرہ وغیرہ یہ پوری بحث مذکورہ آیات کو جانے اور سمجھے بغیر ممکن نہیں یہی اس تلمیح کی تخلیق کا اصل پس منظر ہے جس کی روشنی میں اس کے استعمال پر غور کیا جانا چاہیے شعر کہنے کے علاوہ شعر سمجھنے کے لئے اور شعر سے لطف اندوز ہونے کے لئے بھی اس کا جاننا ضروری ہے عام طور پر یہ تلمیح سفینۂ نجات کے مفہوم میں ہی مستعمل ہے۔

ایک جدید شاعر نے طوفان نوح کے اس پس منظر میں کشتیٔ نجات کا بہت خوب اور خوبصورت استعمال کیا ہے۔

اب کے جو نوح کا طوفان اٹھے تو لوگو

ناؤ پر آنا پہاڑوں کی طرف مت جانا

جب طوفان اٹھنے لگا تو ابن نوح نے یہی کہا تھا کہ میں سیلاب سے بچنے کے لئے پہاڑوں پر پناہ حاصل کرلوں گا قرآن نے اس کا قول نقل کیا ہے:

سَاوِیۤ اِلٰی جَبَلٍ یَعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ

(سورۂ ہود آیت ۴۳ پ ۱۲)

"میں ابھی کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔"

لیکن پہاڑ ابن نوح کو پانی سے نہیں بچا سکے بچنے کی کوئی شکل تھی تو صرف کشتیٔ نوح تھی شاعر کشتی پر آنے کی دعوت اس لئے دے رہا ہے کہ یہ کشتی کشتیٔ نجات ہے کیونکہ اس کا کھیون ہار اللہ کا برگزیدہ نبی و پیغمبر ہے شاعر نے طوفان نوح اور ناؤ کی تلمیح استعمال کر کے شعر کی معنویت میں زبردست اضافہ اور بے پناہ وسعت پیدا کی ہے اور بڑا لطف پیدا کیا ہے پیغمبر کی دعوت پر ایمان لانا سفینۂ نجات پر سوار ہو جانا ہے طوفان نوح اور ناؤ حق و باطل کے لطیف استعارے ہیں جن کا فنکارانہ استعمال تلمیحی معنویت کا رہین منت ہے جب بھی حق و باطل کا معرکہ درپیش ہو اور طوفان باطل حق کو نیست و نابود

کرنے کے در پے ہو پیغمبرانہ دعوت پر لبیک کہنا کشتی نجات پر سوار ہو جانا ہے کیونکہ طوفان عذاب الٰہی کی شکل میں تھا اور عذاب الٰہی سے بچنے کا واحد ذریعہ ایمان ہے جس کی دعوت پیغمبر وقت ہمیشہ سے دیتے آئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے یہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ تلمیح اپنے حقیقی اور اصلی معنی میں بھی ملتی ہے اور دیگر معانی میں بھی مستعمل ہے مندرجہ ذیل اشعار سے اس کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ ؎

طوفان میں ناخدائی کی کشتی نوح کی
حقا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا (آتش)

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا ٹھہرا آ کر جہاں سفینا (اقبال)

گردش دوراں سے مردان خدا بے باک ہیں
نوح کی کشتی کو اندیشہ نہیں گرداب میں (آتش

کشتی مئے کو اے خدائے صبوح
بخش دے قسمت سفینۂ نوح (جوش)

ہاں نوح کی کشتی کی تقدیر ملے تجھ کو
اس بحر سیاست کے بپھرے ہوئے طوفاں میں (جوش)

طوفان رشکِ نوح علیہ السلام ہے
بولا کہ آپ کے بھی سفینے پہ حرف ہے (انشاء)

کشتی نوح سے ہی کود پڑوں طوفان میں
دیں سہارا جو مجھے پار اُترنے والے (نامعلوم)

ابن نوح: حضرت نوحؑ کے قصے میں ایک تلمیح ابن نوح کی بھی ہے حضرت نوح اللہ کے نبی و رسول تھے ساری قوم کو اللہ کی طرف بلاتے رہے جو لوگ ان کی دعوت پر ایمان

نہیں لائے ان میں ان کا ایک بیٹا بھی شامل تھا جو ان کی دعوت پر ایمان نہیں لایا تھا چنانچہ جب سیلاب شروع ہوا تو نوحؑ نے اس سے کہا کہ کافروں کے ساتھ مت رہو ایمان لے آؤ اور ہمارے ساتھ کشتی پر سوار ہو جاؤ لیکن اس وقت بھی اس نے حضرت نوحؑ کی بات نہیں مانی قرآن کریم کا بیان ہے:

وَ نَادٰی نُوْحُ نِ ابْنَہٗ وَ کَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَعَنَا وَ لَا تَکُنْ مَعَ الْکَافِرِیْنَ ○ (سورۂ ہود آیت ۴۲ پ ۱۲)

"اور نوح نے اپنے لڑکے کو پکارا اور وہ کنارے پر تھا کہ اے میرے پیارے بیٹے سوار ہو جا ہمارے ساتھ اور کافروں کے ساتھ مت رہ۔"

حضرت نوحؑ کے بیٹے نے جواب دیا:

سَاٰوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ (سورۂ ہود آیت ۴۳ پ ۱۲)

میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لیتا ہوں وہ مجھے پانی سے بچا لے گا

حضرت نوحؑ نے ارشاد فرمایا:

لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَ حَالَ بَیْنَہُمَا الْمَوْجُ فَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ○ (سورۂ ہود آیت ۴۳ پ ۱۲)

"آج کے دن کوئی بچانے والا نہیں اللہ کے حکم (عذاب) سے ہاں البتہ وہی جس پر رحم کردے اور دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی سو وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔"

شعراء نے ابن نوح کی تلمیح میں اس بات کو باعث تعجب گردانا ہے کہ پیغمبر کا بیٹا کافر کیسے ہو سکتا ہے؟! پیغمبر کا بیٹا عذاب الٰہی کا شکار کیسے ہو سکتا ہے؟! شعراء نے اسی تصور کو مرکزی خیال بنا کر تلمیحی معانی تراشے ہیں حالانکہ یہ کوئی مستبعد بات نہیں ہے

کیونکہ حضرت نوحؑ کی اہلیہ بھی کافر تھیں حضرت لوطؑ کی اہلیہ بھی کافر تھیں حضرت ابراہیمؑ کے والد آزر بت تراش و بت پرست تھے، یہ متضاد باتیں عوامی ذہن کے لئے قابل قبول نہیں ہیں اور حیرت واستعجاب کا باعث ہیں اسی تصور کا فائدہ اٹھا کر شعراء نے یہ تلمیح تراشی ہے اور یہ تلمیح مثبت و منفی دونوں سطح پر مستعمل ہے یعنی پیغمبر کا بیٹا کافر ہو سکتا ہے اور کافر کیسے ہو سکتا ہے دونوں معانی کے لئے ابن نوح کی تلمیح استعمال ہوتی ہے قصۂ نوح کی دیگر تلمیحات کے مقابلے میں نسبتاً یہ تلمیح کم ملتی ہے بلکہ نادر ہے۔

رُخ انوار دکھا کر خاک کا پیوند کرتے ہیں
حسیں ہونے سے طوفاں نوح کے فرزند کرتے ہیں
(آتش)

باپ اُن کے یہ بولے کشتی مری واللہ ڈبو دی ہائے غضب
اس لڑکے نے صحبت بد پا کر یہ کارِ ابن نوح کیا
(اکبر)

تلمیحات قصۂ ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام

۱۔ ابراہیمؑ۔ خلیل اللہ۔ شانِ خلیل۔ میراثِ خلیل۔ دعائے خلیل۔

۲۔ آذر۔ آذری۔ بت گری۔ خراتراشی۔ بت فروشی۔

۳۔ بت شکنی۔ خاراشگافی

۴۔ نمرود

۵۔ آتشِ نمرود۔ نارِ نمرود

۶۔ گلزارِ خلیل

۷۔ اسماعیل علیہ السلام۔ آدابِ فرزندی۔ خوابِ ابراہیم علیہ السلام

۸۔ چاہِ زمزم۔ آبِ زمزم۔

۹۔ ذبحِ اسمٰعیلؑ۔ قربانی

۱۰۔ تعمیرِ حرم

۱۱۔ مقامِ ابراہیم

تلمیحات قصۂ ابراہیمؑ

ابراہیم آزر: حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کے برگزیدہ نبی تھے انہیں ابوالأنبیاء بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی نسل میں مسلسل کئی پشت تک انبیاء مبعوث ہوتے رہے آخری نبی حضرت محمد ﷺ بھی حضرت ابراہیمؑ کی ہی نسل سے ہیں اور خود حضرت ابراہیمؑ کا سلسلۂ نسب حضرت نوحؑ سے مل جاتا ہے قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے والد کا تذکرہ بت پرست و بت تراش کی حیثیت سے کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم شروع ہی سے بت پرست تھی توریت کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق عراق کے علاقے فدان سے تھا انجیل برناباس میں یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ ان کے والد نجاری کے پیشے سے وابستہ تھے اور لکڑی کے بت تراش کر فروخت کیا کرتے تھے لیکن حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے رشد و ہدایت سے نوازا تھا اور حق کی معرفت و بصیرت عطا فرمائی تھی وہ بچپن ہی سے اپنے والد کو دیکھتے آ رہے تھے کہ مختلف انداز کی مورتیاں بنا کر لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں مگر ان کا ذہن اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا کہ والد کے ہاتھ کی تراشی ہوئی مورتیاں نفع و نقصان کی بھی مالک ہو سکتی ہیں قرآن کریم نے ان کی اس بصیرت اور حقیقت شناسی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ اِذْ

قَالَ لِأَبِيْهِ وَ قَوْمِه مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ أَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ٥

(سورۂ الانبیاء آیت ۵۲/۵۱ پ ۱۷)

''اور ہم ابراہیم کواس سے بھی پہلے بہترین فہم عطا کر چکے تھے اور ہم ان کو خوب جانتے تھے جب انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا واہیات مورتیں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو۔''

شرک و بت پرستی سے حضرت ابراہیمؑ کی نفرت فطری و طبعی تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے ان کی تربیت فرمائی تھی اور ان کو شرک و بت پرستی کے خلاف کمر بستہ ہونے کے لئے تیار فرما دیا تھا چنانچہ انھوں نے ایک خدائے واحد کو ماننے کی دعوت دینا شروع کر دیا تھا اور قوم کو طرح طرح سے سمجھانے اور آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ بت پرستی کو ترک کر کے ایک خدائے واحد کی عبادت اختیار کریں، اس کام کا آغاز انھوں نے اپنے والد سے کیا اور سب سے پہلے انھیں توحید کی دعوت دی:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِأَبِيْهِ اٰذَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ أَرٰكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ .

(سورۂ الانعام آیت ۷۴ پ ۷)

''جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو بے شک میں تو تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھتا ہوں''

اِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ وَ قَوْمِه مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ أَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ٥ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا لَهَا عَابِدِيْنَ ٥ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ٥ قَالُوْٓا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ٥ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَھُنَّ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکُمْ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ ○ (سورۃ الانبیاء آیت ۵۲ تا ۵۶ پ ۱۷)

''جب انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیا واہیات وخرافات مورتیں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو وہ بولے ہم نے اپنے باپ داداؤں کو انہیں کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے، ابراہیمؑ نے کہا یقیناً صریح گمراہی میں مبتلا رہے تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی وہ بولے کیا تم سنجیدگی سے حق پیش کر رہے ہو یا محض دل لگی ہی کر رہے ہو ابراہیمؑ نے کہا دل لگی کیسی تمہارا پروردگار تو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اس پر گواہوں میں سے ہوں۔''

اس سلسلہ کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد کو اور اپنی قوم کو بت پرستی سے باز رہنے اور توحید الٰہی کو مان لینے کی دعوت دی ہے لیکن قوم نے مان کر نہیں دیا قوم کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کے طرز تفہیم، اسلوب دعوت، نصیحت و موعظت اور قوم کی ہٹ دھرمی اور مناظرہ بازی کو قرآن کریم نے بڑے جامع و مؤثر انداز میں پیش کیا ہے:

وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ اِبْرٰھِیْمَ ○ اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ وَ قَوْمِہٖ مَاتَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَھَا عٰکِفِیْنَ ○ قَالَ ھَلْ یَسْمَعُوْنَکُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ○ اَوْ یَنْفَعُوْنَکُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ○ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا کَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ ○ قَالَ اَفَرَاَیْتُمْ مَّا کُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ○ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ○ فَاِنَّھُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ ○

وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ٥ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ٥ وَ الَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ٥ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ٥

(سورۂ الشعراء آیت ۶۹ تا ۸۲ پ ۱۹)

"اور انھیں ابراہیم کا قصہ سنایئے جب انھوں نے اپنے والد سے اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کس کی عبادت کرتے ہو انھوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں ان کے سامنے بیٹھتے ہیں ابراہیم نے کہا کیا جب تم پکارتے ہو تو یہ سنتے ہیں یا تمھیں نفع پہنچاتے ہیں یا نقصان تو انھوں نے کہا ہم نے اپنے اجداد کو اسی طرح کرتے دیکھا تھا ابراہیم نے کہا کیا تم نے دیکھا کہ تم اور تمہارے باپ دادا کس چیز کی عبادت کرتے تھے بے شک وہ رب العالمین کے مقابلے میں میرے دشمن ہیں جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی ہدایت دینے والا ہے اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور جو مجھے پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے وہی مجھے مارتا ہے اور پھر جلاتا ہے اور قیامت کے دن میری مغفرت کرنے والا ہے ۔

حضرت ابراہیمؑ نے ان کے خود ساختہ زمینی معبودان باطل کی بھی مخالفت کی اور یہ کہہ دیا کہ میں ان کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں اگر ان میں نفع ونقصان کی کوئی طاقت ہے تو مجھے نقصان پہنچادیں اور آسمانی معبودان باطل کی بھی مخالفت فرمائی خالص عقلی وفکری سطح پر چاند سورج اور ستاروں کی ربوبیت کا بھی انکار فرمایا اور صاف صاف اعلان فرمادیا:

قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ٥ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے۔اُس کی قوم جب اپنا شعار آذری (اقبالؔ)

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دربار میں ہوں گے گہر پیدا (اقبالؔ)

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں (اقبالؔ)

عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل (اقبالؔ)

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا اِلٰہ میں ہے (اقبالؔ)

آزر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلاں خارا گدازی (اقبالؔ)

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا اِلٰہ الا اللہ (اقبالؔ)

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سِرّ کلیم وخلیل (اقبالؔ)

بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہو (اقبالؔ)

توڑ دیتا ہے بُت ہستی کو ابراہیم عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم وعشق (اقبالؔ)

بت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں (اقبالؔ)

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا (اقبالؔ)

ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمان خلیل
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیراہن (اقبالؔ)

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بین خلیل (اقبالؔ)

حنا بندِ عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے (اقبالؔ)

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق (اقبالؔ)

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل ونظر کا ندیم (اقبالؔ)

دیں مسلک زندگی کی تقویم
دیں سرِ محمدؐ و براہیم (اقبالؔ)

دل نے بھی عاشق ہو میرے سینۂ پُر داغ میں
جوں خلیل اللہ دیکھی سیرِ باغِ آتش (بہادر شاہ ظفرؔ)

برہ کی آگ میں دھسنے کی نیش ہے کچھ فکر دل کوں
کہ جیوں غم نئیں ہے ابراہیم کوں آتش میں جانے کا (ولی دکنی)

باغ وبہار آتش نمرود کو کیا
مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا (آتش)

نہ جب تک ہم پیالہ ہو کوئی میں مئے نہیں پیتا
نہیں مہماں تو فاقہ ہے خلیل اللہ کے گھر میں (آتش)

آذر، آذری، بت گری، خاراتراشی، بت فروشی

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری تو قتیل شیوۂ آذری (اقبال)

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا (اقبال)

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتان آذری (اقبال)

وہی بُت فروشی وہی بُت گری ہے
سنیما ہے یا صنعت آذری ہے (اقبال)

میرے احساس کی تصویر بنانے کے لئے
ہوش ہر دور میں پیدا ہوئے آذر کتنے (اصغر مہدی ہوش)

یہ بُتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ (اقبال)

میری جانب اگر آئے ہیں تو پتھر ہوں گے
کب صنم خود کسی آذر کی طرف جاتے ہیں (نامعلوم)

کعبہ میں بار پاگئے اصنامِ آذری
کاشانۂ خلیل کے درباں کو کیا ہوا (نامعلوم)

مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا (اقبال)

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بُتانِ آذری (جوش)

جب بھی ترشے ہیں دستِ آذر سے
آدمی بن گئے ہیں پتھر سے (اعجاز رحمانی)

اپنے نقشِ پا میں تھی شانِ کلاہِ قیصری
خانہ زادوں میں تھی اپنے صولتِ اسکندری
اپنی آنکھوں سے برستا تھا جلالِ حیدری
ٹھوکروں کی زد پہ رہتا تھا مذاقِ آذری
دنگ تھا ہر زمزمہ بانگِ اذاں کے سامنے
کوہ جھک جاتے تھے اپنے کارواں کے سامنے (جوش)

بت شکن: ابراہیمؑ نے جب عقلی علمی فکری اور عملی اسلوب دعوت کے ذریعہ قوم کو قائل و مائل کرنے کی مسلسل کوشش کی اور ہر طرح حجت قائم کر لی پھر بھی لوگ نہ مانے تو ابراہیمؑ ایک دن موقع پا کر ہیکل میں داخل ہو گئے اور سارے بتوں کو پاش پاش کر ڈالا۔ یہ ابراہیمؑ کی دعوت کا نقطۂ عروج تھا اور قوم کو قائل کرنے کی آخری عملی کوشش اور اتمام حجت بھی، اس واقعہ کے بعد حضرت ابراہیمِ کی شخصیت حق کی علمبردار اور توحید کی علامت بن کر ابھرتی ہے اور معرکہ حق و باطل کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم کو مثبت و ایجابی انداز میں خالق کائنات کی ربوبیت و

وحدانیت کی دعوت دیتے رہے اور خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلاتے رہے مگر قوم مثبت اسلوبِ دعوت اور ایجابی انداز تفہیم کے باوجود جب حق کو ماننے پر آمادہ نہیں ہوئی تو ابراہیمؑ نے دعوت کا وہ انداز اختیار کیا جس سے قوم کو راہ فرار نہ مل سکے اور بہانہ سازی کے سارے راستے مسدود ہو جائیں اور ساری قوم بیک وقت حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو جائے چنانچہ انہوں نے ایک دن بت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ ڈالا تا کہ قوم یہ محسوس کر لے کہ وہ بت جنھیں قوم خدا سمجھ کر پوجتی ہے کسی قسم کا نفع ونقصان پہنچانے کے مالک نہیں ہیں حتیٰ کہ خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکے اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے قوم نے ساری حقیقت کو عریاں دیکھ لینے، سمجھ لینے اور محسوس کر لینے کے بعد بھی تسلیم نہیں کیا اور ردّعمل کا شکار ہو کر بپھر اٹھی اور ابراہیمؑ کے خلاف محاذ آرا ہوگئی حالانکہ حضرت ابراہیمؑ نے صرف اتمام حجت کے لئے بطور دلیل وثبوت یہ اقدام کیا تھا اور وہ اس سے پہلے علی الاعلان کہہ بھی چکے تھے کہ تمہارے معبودان باطل میرے دشمن ہیں ﴿فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ﴾ مزید دلیل وثبوت بلکہ اتمام حجت کے لئے سب سے بڑے بت کو چھوڑ دیا تھا تا کہ قوم یہ بھی اندازہ کر لے کہ جو سب سے بڑا ''خدا'' تھا اس کے سامنے ساری کارروائی انجام دی گئی اور وہ کچھ نہ کر سکا اس کے علاوہ اگر قوم معلوم کرنا چاہے کہ یہ سارا کارنامہ کس نے انجام دیا ہے تو اس بڑے بت سے پوچھ بھی لے بشرطیکہ وہ بولنے اور بتانے پر قادر بھی ہو... لیکن قوم نے جب بڑے دیوتا اور دیگر سارے دیوتاؤں کی بے بسی ولاچاری کا مشاہدہ کر لیا تو سرنگوں ہو کر باہم چہ میگوئیاں کرنے لگے قرآن کریم نے اس پوری صورتحال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِیْمُ ۝ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ ۝ (سورۃ الانبیاء آیت ۵۹،۶۱ پ ۱۷)

''انھوں نے کہا کس نے یہ حرکت کی ہے ہمارے معبودوں کے ساتھ
بے شک اس نے تو بڑا غضب ہی کر دیا، بعض ان میں سے بولے کہ
ہم نے ایک نوجوان کو جسے ابراہیم کہتے ہیں اِن معبودوں کا ذکر برائی
کے ساتھ کرتے سنا ہے بعض نے کہا اسے سب آدمیوں کے سامنے
حاضر کرو تا کہ وہ لوگ (اس اقرار کے) گواہ ہو جائیں۔''

یہی پس منظر ہے بت شکنی یا بت شکن کی تلمیح کا جسے حضرت ابراہیمؑ نے عملی طور انجام دیا تھا۔

یہاں سے حضرت ابراہیمؑ کے واقعے میں اہم موڑ ہے اور معرکۂ حق و باطل کا عروج شروع ہوتا ہے اور ان آزمائشوں کا سنگین سلسلہ ہے جو حق کے علمبرداروں کو باطل سے لوہا لیتے وقت ہمیشہ پیش آتی ہیں انہیں آزمائشوں سے تشکیل پاتی ہیں حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کی دیگر اہم اور معنی خیز تلمیحات نمرود، آتش نمرود، خلیل اللہ، باغ خلیل، گلزار خلیل، ایمان خلیل وغیرہ۔

ابراہیمؑ نے قوم کو خاموش اور لاجواب کرنے کے لئے اور اپنے دعوے اور دعوت کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے جو آخری طریقہء کار اپنایا تھا وہ خاصہ جرأت مندانہ اور غیر متوقع تھا رفتہ رفتہ قوم کے سرداروں، کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں تک یہ بات پہنچی کہ ابراہیمؑ نے ہمارے معبودوں کی توہین کی ہے اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے تو فوراً انہوں نے احکام صادر کر دیئے کہ اسے پکڑ لاؤ چنانچہ ابراہیمؑ کو لایا گیا ساری قوم دم بخود کھڑی تھی ان کے دیوی دیوتاؤں کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا قوم پر سکتہ طاری تھا سرداران قوم اور تمام مذہبی پیشوا سخت برہم تھے ان کے آبائی دین کا جنازہ نکل گیا تھا قوم کے سامنے ان عقائد کا شیرازہ بکھر گیا تھا جن پر ان کے باپ داداؤں کے مذہب کی عمارت کھڑی تھی ابراہیمؑ علی رؤس الاشہاد لائے گئے سرداروں اور مذہبی

پیشواؤں نے سخت غیض وغضب کے عالم میں پوچھا کہ:

أَأَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِآلِهَتِنَا يَآ إِبْرٰهِيمُ ۝ (سورۂ الانبیاء آیت ۶۲ پ ۱۷)

''کیا تم نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے''

حضرت ابراہیمؑ اسی موقع کے منتظر تھے انہوں نے خود اپنی حکمت عملی سے باطل کے تار و پود بکھیرنے کا یہ شاندار موقع فراہم کیا تھا چنانچہ انتہائی صبر واطمینان کے ساتھ جواب دیا:

بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ ۝
فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنْفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنْتُمُ الظَّالِمُونَ ۝ ثُمَّ
نُكِسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰؤُلَاءِ يَنْطِقُونَ ۝

(سورۂ الانبیاء آیت ۶۳ تا ۶۵ پ ۱۷)

''بلکہ یہ ساری کارروائی ان کے اسی بڑے کی ہو سکتی ہے اگر یہ بول سکتے ہوں تو انہیں سے پوچھ لو اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچنے لگے پھر آپس میں کہنے لگے کہ حقیقت میں تم ہی لوگ ناحق پر ہو پھر (شرمندگی کے مارے) اپنے سروں کو جھکا لیا اور بولے کہ اے ابراہیم یہ تو معلوم ہی ہے کہ یہ بت کچھ بولتے نہیں۔''

ساری قوم کے سامنے دلیل و حجت قائم ہو چکی تھی سرداران قوم اور مذہبی پیشوا ذلت و رسوائی کے ساتھ سر جھکائے مناسب جواب کی تلاش میں تھے۔ جمہور عوام بھی سب کچھ سمجھ چکے تھے کہ دیوی دیوتا کہاں بول سکتے ہیں؟ اور ان کے اختیار میں کسی قسم کے نفع ونقصان کی طاقت وقوت ہوتی تو ان کا یہ حشر ہی کیوں ہوتا؟! پھر بھلا یہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟؟!!! انھیں ابراہیمؑ کی بات سچی معلوم ہو رہی تھی اور ابراہیمؑ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قوم کو نصیحت بھی کی اور انہیں غیرت بھی دلائی کہ جب یہ پتھر کے بے جان بت

جنھیں تم خدا سمجھتے ہو خود اپنے وجود کو بھی نقصان سے نہیں بچا سکے تو پھر یہ گونگے بہرے بے جان و بے حس پتھر اور لکڑی کے ٹکڑے کسی اور کو کیا فائدہ پہنچا سکیں گے۔

أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ○ أُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَ فَلَا تَعْقِلُونَ ○

(سورۃ الانبیاء آیت ٦٦ تا ٦٧ پ ١٧)

"تو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پوجتے ہو جو تمہیں نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں تف ہے تم پر بھی اور ان پر بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ؟!"

نمرود: حضرت ابراہیمؑ کی اس مدلل عملی دعوت کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ قوم اپنے باطل عقیدے سے تائب ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے دین حنیف اور توحید کی دعوت کو قبول کر لے لیکن قوم اپنے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے بہکاوے میں آکر عداوت و دشمنی پر اتر آئی ابراہیمؑ کی مختصر تقریر کے بعد سرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے جذباتی نعرہ بلند کیا۔

حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ○

(سورۃ الانبیاء آیت ٦٨ پ ١٧)

"وہ بولے اگر کچھ کرنا ہی ہے تو انہیں جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کا بدلہ لے لو"

باطل جب بھی عقل و دلیل اور علم و فکر کے میدان میں شکست کھاتا ہے تو پھر خباثت و دنائت پر اتر آتا ہے اور یہی اس کا مزاج ہے چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا عقل و دلیل کے میدان میں کھلی ہوئی شکست کے بعد قوم اور سرداران قوم نے ابراہیمؑ کے خلاف عداوت و دشمنی کا محاذ کھول دیا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ ابراہیم کو بتوں کی اہانت کی سزا ملنی چاہیے سزا کی تنفیذ و تجویز کے لئے معاملہ بادشاہ وقت کے روبرو لے جایا گیا۔

ابراہیمؑ جس زمانہ میں اپنے والد اور اپنی قوم کو خدائے واحد کی عبادت کی

دعوت دے رہے تھے عراق کا بادشاہ نمرود تھا جو خود اپنے آپ کو رب کہلوانے کے خبط میں مبتلا تھا اور رعایا بھی بادشاہ کو خدا تسلیم کرتی تھی اور اس کی پرستش بھی کرتی تھی اور ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید براہ راست بادشاہ کی ربوبیت کا انکار تھا لہذا اس پورے واقعے کی اطلاع جب بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے ابراہیمؑ کو بلا بھیجا چنانچہ ابراہیمؑ جب دربار میں پہنچے تو انھیں اپنی دعوت کے لئے ایک بڑا وسیع میدان ہاتھ آ گیا اور انھوں نے محسوس کیا کہ بادشاہ اگر قائل ہو جائے تو قوم کا قائل ہونا آسان ہو جائے گا لیکن بادشاہ نے ابراہیمؑ سے باز پرس شروع کر دی کہ تم باپ دادا کے دین کے مخالف کیوں ہو؟ اور مجھے رب ماننے کے بجائے کسی اور کو رب ماننے کا تماشا کیوں کرتے ہو؟ جواباً ابراہیمؑ نے خدا کی ربوبیت و وحدانیت پر ایک زبردست تقریر کر ڈالی اور اس کے بعد بادشاہ کے ساتھ بڑا طویل بحث و مباحثہ ہوا بادشاہ نے خدا کی وحدانیت اور وجود پر دلائل طلب کئے اور ابراہیمؑ نے بہت سی دلیلیں دیں لیکن نمرود ہر دلیل میں دیدہ و دانستہ تاویل و توجیہ کے پہلو پیدا کرتا رہا آخر ابراہیمؑ نے قوم کے دل میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنے کی غرض سے برسرِ دربار بادشاہ کو لا جواب کرنا ضروری سمجھا اور ایسی دلیل پیش کی کہ قوم بھی آسانی سے سمجھ لے اور بادشاہ کی لغوتاً ویلات کا بھی سدِ باب ہو جائے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے آخری دلیل کے طور پر کہا کہ میرا رب روزانہ سورج کو مشرق سے نکال کر مغرب کی طرف لے جاتا ہے اور سورج وہیں غروب ہو جاتا ہے اگر تم رب ہو تو سورج کو بجائے مشرق کے مغرب سے نکال کر دکھلا دو یہ سن کر سارے درباری اور ساری قوم مبہوت ہو گئی اور خود بادشاہ ساکت و صامت رہ گیا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرَاهِیْمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْکَ اِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ

اِتی آتش پرستاں کی ہے بستی
سکھے نمرود واں آتش پرستی (ولی دکنی)

جب تک کہ ابراہیمؑ کی فطرت نہ پیدا
وجدان بھی آذر ہے تخیل بھی ہے نمرود (ماہر القادری)

اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصل گل آئے گی نمرود کے انگار لئے (فیض)

آتش نمرود گلزار خلیل: حضرت ابراہیمؑ نے جب سارے بتوں کو توڑ دیا اور دربار نمرود میں توحید الٰہی کی برملا دعوت دی اور نمرود کو مختلف عقلی دلائل اور تکوینی حقائق سے استشہاد کرتے ہوئے لاجواب کر دیا تو اس نے بطور سزا کے حضرت ابراہیم کو زندہ جلا دینے کا حکم صادر کر دیا اور ساری قوم نے مل کر ایک نشیبی علاقہ میں لکڑیاں جمع کرنا شروع کیں کئی دونوں تک لکڑیاں جمع ہوتی رہیں بڑی بڑی لکڑیوں کا انبار جمع کر دیا گیا پھر اس انبار میں آگ لگا کر اس کو دہکایا گیا جب یہ لکڑیوں کا انبار آسمان تک بلند ہوتے شعلوں میں تبدیل ہو کر آتش کدہ بن گیا تو حضرت ابراہیمؑ کو اس میں ڈالنے کا مسئلہ درپیش ہوا کہ آخر اس میں کیسے ڈالا جائے اس موقع پر شیطان لعین نے ان کی مدد کی اور رسیوں کا ایک بہت بڑا جھولا سا بنا کر اس کے ذریعہ حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکنے کی ترکیب بتلائی یہ سب باتیں اور تیاریاں حضرت ابراہیمؑ کے علم میں بھی آتی رہیں مگر وہ پورے عزم وحوصلہ اور خدا پر پختہ یقین کے ساتھ توحید رب اور عبادت الٰہی کی دعوت دیتے رہے اور اس راہ سے پیچھے نہیں ہٹے جب قوم کی ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو شیطان کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق حضرت ابراہیم کو اس رسی کے جھولے میں بٹھا کر آگ میں ڈال دیا گیا حضرت ابراہیمؑ نے ایک لمحہ کے لئے بھی تردنہیں کیا اور اس پر بھرپور بھروسہ اور اعتماد کیا چنانچہ حکم خداوندی سے یہ دہکتا ہوا الاؤ جس کی سوزش وتپش اتنی تھی کہ اس

کے اوپر سے اڑنے والے پرندے جل بھن کر اسی میں گر پڑتے تھے حضرت ابراہیمؑ کے لئے مٹی ہو گیا اور انگارے گلزار بن گئے آگ کے پیدا کرنے والے نے آگ سے جلانے کی تاثیر ختم کر دی اور وہ الاؤ حضرت ابراہیمؑ کے لئے لہلہاتا ہوا خوبصورت باغ بن گیا آگ کے لئے جو حکم خداوندی نازل ہوا تھا اس کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ میں موجود ہے:

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ○

(سورۃ انبیاء آیت ۶۹ پ ۱۷)

''ہم نے حکم دیا کہ اے آگ ابراہیم کے لئے امن وسلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا''

حکم الٰہی سے آگ کی تاثیر ختم ہوگئی اور نہ صرف تاثیر ختم ہوگئی بلکہ حضرت ابراہیم کے حق میں امن وسلامتی کا باعث بن گئی آگ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پھل پھول اور پیڑ پودے پیدا فرمادئے چالیس روز تک یہ الاؤ دہکتا رہا اس کی سوزش اور تپش کی وجہ سے کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ قریب جا سکے مگر حضرت ابراہیم اسی دہکتے آلاؤ میں آرام واطمینان کے ساتھ رہے آخر جب یہ جہنم ٹھنڈا ہوا اور حضرت ابراہیم لوگوں کے سامنے جوں کے توں صحیح وسالم نکل آئے تو لوگوں کو ان کی صداقت وحقانیت کا یقین آ گیا بہت سے لوگ ایمان لے آئے مگر نمرود اور اس کے اعوان سلطنت کے دلوں کی آتشِ کفر مزید بھڑک اٹھی اور انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو وطن چھوڑ کر ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا حضرت ابراہیمؑ بھی ان کی ہدایت سے مایوس ہو چکے تھے لہذا انھوں نے شام کی جانب ہجرت اختیار فرمائی۔

یہ آگ حضرت ابراہیمؑ کے حق میں اللہ کے حکم سے گل وگلزار بن گئی تھی اور اردو شاعری میں بھی اس نے بہترین اور لطیف تلمیحات کے خوش رنگ پھول کھلا کر اسے

لالہ زار کر دیا ہے اردو شاعری اور آتش نمرود کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے یہ فاصلہ قرآن کریم کے حوالے سے طے کیا گیا ہے قرآنی آیات کے حوالے سے یہ تلمیح صبر ایمان یقین اور خدا اعتمادی کی زبردست علامت بن کر ابھری ہے اس تلمیح میں بیک وقت آگ اور باغ کا تصور پایا جاتا ہے اس لئے اس میں ایک عجیب قسم کی کشش پیدا ہوگئی ہے اور یہ تلمیح آب و آتش کی ترجمان بن گئی ہے اور شعراء نے کہیں اس سے آتش کا کام لیا ہے اور کہیں آب کا اور کہیں دونوں کی مشترک کیفیات کا، اس کے اندازے کے لئے اس تلمیح سے مزین اشعار کا مطالعہ ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس تلمیح کے تنوع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نور تجھ رُخسار کا سینے میں ہے نت جلوہ گر
مجمر دل آتشِ نمرود رکھتا ہے ہنوز (ولی دکنی)

باغ وبہار آتش نمرود کو کیا
مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا (آتش)

مہرباں ہو دوست کچھ دشمن کا چل سکتا نہیں
آتش نمرود ہے گلزار ابراہیم کو (آتش)

آتش نمرود اب تک ہے جہاں میں شعلہ ریز
ہوگیا آنکھوں سے کیوں پنہاں ترا سوز کہن (اقبال)

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند (اقبال)

شعلۂ نمرود ہے روشن زمانے میں تو کیا
شمع خود را می گدازد درمیانِ انجمن (اقبال)

پیشِ دشمن نہ گذر حق سے نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتش نمرود گلستانِ خلیل (ذوق)

بے خطرہ کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی (اقبالؔ)

میں ہوں گل چین گلستان خلیلؑ
آگ میں ہوں باغ باغ ہوں میں (میر دردؔ)

نہیں ہے ہم کو حفظ اس کے سے انکار
ہوئی گلزار ابراہیم پر نار (سوداؔ)

آتش آہِ بے اثر سے مری
آسماں گلشن خلیل ہوا (مومنؔ)

گر گلشن خلیل جلاوے تو کیا عجب
شعلہ ہمارے سوز سمندر گداز کا (مومنؔ)

شاخ پہ جتنے پھول کھلے ہیں اکثر پیغمبر سے لگتے ہیں
لیکن میں اُس کی مانوں جو ہنس دے انگاروں میں (بشیر بدرؔ)

آگ پہونچے گی کب خلیل تلک
پھول بن جائیں گے شرارے سب (طارق قمرؔ)

اسماعیل: حضرت ابراہیمؑ کی دو بیویاں تھیں حضرت سارہ اور ہاجرہ لیکن طویل عرصہ تک ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی ابراہیم اولاد کے لئے دعا کرتے تھے ان کی عمر ۸۰ سے تجاوز کر چکی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کے یہاں حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل کی پیدائش ہوئی حضرت ہاجرہ ان کی چھوٹی بیوی تھیں بڑی بیوی

حضرت سارہ کو یہ نا گوار گذار کہ ان کی گود خالی رہے اور ہاجرہ کی گود ہری ہو جائے چنانچہ دونوں میں ایک قسم کی رنجش سی پیدا ہو گئی اور حضرت ہاجرہ کو ایام حمل کے دوران بھی ان سے دور رہنے پر مجبور ہونا پڑا چنانچہ توریت کی روایت کے مطابق جب حضرت ہاجرہ سارہ سے دوری اختیار کر کے ایک میدان میں پناہ گزین ہو گئیں اسی دوران انھیں فرشتہ سے بشارت ملی کہ ان کے یہاں لڑکا ہوگا اور اس کا نام اسماعیل ہوگا چنانچہ جب ولادت ہوئی تو بچہ کا نام فرشتہ کی بشارت کے بموجب اسماعیل ہی رکھا گیا حضرت سارہ کے لئے یہ بات انتہائی شاق گزری اور انھوں نے اصرار کر کے حضرت ابراہیم سے کہا کہ ان دونوں کو کہیں دور لے جا کر رکھیں یہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے بہت شاق تھا لیکن وحی الٰہی نے حضرت ابراہیمؑ کے دل کو مطمئن کر دیا کیونکہ وحی الٰہی بھی یہی نازل ہوئی کہ ہاجرہ اور اسماعیل کو لے جا کر صحرا میں چھوڑ آئیں اور جگہ کا تعین بھی کر دیا گیا چنانچہ حضرت ابراہیمؑ ہاجرہ اور ان کے شیر خوار بچہ کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور اس مقام پر پہونچ گئے جس کی نشاندہی کی گئی تھی آج اسی مقام پر کعبۃ اللہ ہے وہاں حضرت ابراہیمؑ ایک مشکیزہ پانی اور کھجوروں کی ایک تھیلی ان کے پاس چھوڑ کر ان سے رخصت ہوئے اس موقع پر حضرت ہاجرہ نے ان سے دریافت کیا یہاں صحرا میں جہاں آبادی کا نام ونشان نہیں اور ذرائع زندگی کے کوئی آثار بھی نہیں ہمیں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو کیا یہ تمہارے رب کا حکم ہے ابراہیمؑ نے فرمایا ہاں یہ میرے رب کا حکم ہے ہاجرہ نے خاموشی اختیار کر لی اور کہنے لگیں اگر یہ رب کا حکم ہے تو وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا پھر ابراہیمؑ نے دعا کی اور رخصت ہوئے دعا کے الفاظ ہیں۔

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھۡوِیۡٓ اِلَیۡھِمۡ وَارۡزُقۡھُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمۡ

يَشْكُرُوْنَ ٥ (سورۂ ابراہیم آیت ۳۷ پ ۱۳)

''اے پروردگا میں نے اپنی اولاد کو اس چٹیل میدان میں جہاں کھیتی کا
نام ونشان نہیں ہے تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے تا کہ نماز قائم
کریں تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرما اور ان کے لئے
زمین کی پیداوار سے رزق عطاء فرما تا کہ وہ تیرے شکر گزار رہیں۔''

یہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش اور وادیٔ غیر ذی زرع میں ان کی پرورش وپرداخت کا پس منظر تھا۔

آبِ زم زم: حضرت ابراہیمؑ شیر خوار اسماعیل کو اس وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ کر واپس ہو گئے کچھ دن تک تو مشکیزہ کے پانی اور کھجوروں پر گزر ہوئی لیکن رفتہ رفتہ یہ سہارا بھی ختم ہو گیا تو حضرت ہاجرہ کو تشویش ہوئی اور انھوں نے پانی تلاش کرنا شروع کیا شیر خوار بچہ کو چھوڑ کر جانا بھی مشکل تھا چنانچہ دوڑ کر قریب کی پہاڑی پر گئیں کہ زندگی کے آثار تلاش کریں پھر نشیب میں لوٹ آتیں اور قریب کی دوسری پہاڑی پر چڑھ جاتیں کہ شاید کوئی چشمہ نظر آجائے یا کوئی شخص دکھائی پڑے مگر دور دور تک کوئی آدم زاد نظر نہ آتا اور نہ آثار حیات ہی نظر آتے اسی اضطراب میں حضرت ہاجرہ نے دونوں پہاڑیوں کے درمیان کئی چکر لگائے کہ معصوم اسماعیل کے لئے پانی کا کوئی نظم ہو جائے حضرت ہاجرہ یہی اضطرابی عمل رہتی دنیا تک کے لئے قائم ودائم بنا دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حج کے ارکان میں شامل فرما دیا یہ دونوں پہاڑیاں صفا ومروہ تھیں اور ان کے درمیان حضرت ہاجرہ کا اضطراری واضطرابی عمل ''سعی'' قرار پایا اپنی اسی اضطراری کیفیت میں وہ حضرت اسماعیل پر بھی ایک نظر ڈالنے کے لئے آجایا کرتی تھیں کہ حضرت اسماعیل تو نشیبی میدان میں تھے شیر خوار بچہ فطری اور طبعی انداز میں ہاتھ پیر چلا رہا تھا ایک بار حضرت ہاجرہ اضطراری کیفیت کے ساتھ وہاں پہنچیں تو دیکھا اسماعیل کی ایڑیوں کی حرکت سے زمین پر

جو خلاء پیدا ہو گیا تھا اس میں سے صاف وشفاف پانی کا چشمہ اُبل پڑا ہے اور پانی تیزی کے ساتھ بہہ رہا ہے چنانچہ انھوں نے ریت کی باڑھ بنا کر پانی کو روکنا چاہا اور کہا "زم زم" رُک رُک اس طرح اللہ کے حکم سے اس بے آب وگیاہ وادیٔ میں شیریں وصاف وشفاف پانی کا چشمہ اُبل پڑا اور آثار حیات نمودار ہوئے یہ چشمہ زم زم حضرت اسماعیل کی ایڑیاں رگڑنے سے نمودار ہوا یا فرشتے نے اپنا پر مار کر چشمہ جاری کیا یہ ایک بحث ہے جو مفسرین ومحدثین کے درمیان معروف ہے لیکن چشمہ زم زم کے ابلنے کی جگہ وہی ہے جہاں اسماعیل ایڑیاں رگڑ رہے تھے اس لئے عام طور پر یہی بات معروف ہے کہ اسماعیل کے ایڑیاں رگڑنے سے چشمہ زم زم ابل پڑا چشمہ زم زم اس وقت سے آج تک برابر جاری ہے اور چشمہ فیض بنا ہوا ہے اس پانی کے ساتھ عوامی سطح پر ایک تقدس وابستہ ہو گیا ہے جس کی بنیاد بہت سی روایات ہیں ان روایات میں قدر مشترک یہ حدیث ہے کہ زم زم جس بیماری کے لئے شفا کی نیت سے پیا جاتا ہے اس سے شفا حاصل ہو جاتی ہے جس مقصد سے پیا جاتا ہے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے اس سلسلہ میں بہت سے لوگوں کے ذاتی تجربات ہیں جنھیں حکایات وروایات کی شکل حاصل ہو گئی ہے اس کے علاوہ سائنسی تجزیہ کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ زم زم میں بھرپور غذائیت پائی جاتی ہے یہ بیک وقت کھانا اور پانی دونوں ضرورتیں پوری کرتا ہے شعراء کرام نے اس چشمہ کے پس منظر اور پانی کی خصوصیات کے پیش نظر اسے بطور تلمیح برتا ہے اور خوب برتا ہے۔ مذکورہ اشعار سے اسماعیل اور ان سے متعلق دیگر تلمیحات کے ترجمان ہیں۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی (اقبالؔ)

غریب وسادہ رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتداء ہے اسماعیل (اقبالؔ)

نہ تھا یہ مطلب سارہ کہ اسماعیل کافر ہو
حریفانہ نہ ہو انداز مطلب تھا یہی سارا (اکبرالہ آبادی)

بغیر معجزہ پھوٹتے نہیں چشمے
کوئی رگڑتا رہے لاکھ ایڑیاں لوگو (حفیظ میرٹھی)

یوبَل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود حجر دِستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دِستا (ولی دکنی)

صورت کعبہ دکھاتے ہو جو طاقِ ابرو
چاہِ زمزم وہ زنخداں کا کنواں ہوتا ہے (آتش)

تشنہ کاموں کو تمہارے چاہئے آبِ وصال
نے انہیں آبِ بقائے چاہِ زمزم چاہئے (ظفر)

ہلال اترا ہے شاید چاہِ زمزم میں یہ سمجھے ہم
تمہارا دیکھ کر خال سیہ چاہِ زنخداں میں (ظفر)

ترے عاشق کو یوں ہے خوشگوار آبِ دم خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آب زمزم کا (ذوق)

شیخ جی پر یہ قول ثابت ہے
چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں (اکبرالہ آبادی)

کوئی چشمہ کبھی تو پھوٹے گا
اپنی ایڑی رگڑ رہا ہوں میں (افتخار راغب)

قربانی: حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ و اسماعیلؑ کو دیکھنے کے لئے کبھی کبھی آتے رہتے تھے جب اسماعیلؑ ذرا ہوشیار ہوئے اور دوڑنے بھاگنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کا ایک اور امتحان لیا۔ مولانا قاضی زین العابدین سجاد صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ کا امتحان اسی پر ختم نہیں ہوگیا کہ وہ اپنے
اکلوتے اور چہیتے بیٹے اسماعیل کو ان کی ماں کے ساتھ وادئ غیر ذی
زرع میں تنہا چھوڑ آئیں بلکہ جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو
حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اسماعیل کو ذبح کررہے ہیں یہ
خواب وہ مسلسل تین روز تک دیکھتے رہے انبیاء کرام کے خواب بھی
وحی کی ایک قسم ہوتے ہیں انھوں نے سمجھا کہ خداوند تعالیٰ کی طرف
سے انھیں اسماعیل کو راہِ خداوندی میں ذبح کرنے کا حکم ہوا ہے
.........چنانچہ شام سے چل کر مکہ معظمہ آئے اور بچہ کو بنا سنوار کر
اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے۔"

(مکمل قصص القرآن ص۱۲۴۔۱۲۵ زین العابدین سجاد)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنا خواب اپنے بیٹے اسماعیلؑ سے بیان کیا اور ان کی مرضی معلوم کی وہ بھی خدا کے حکم پر راضی برضا نکلے اور حضرت ابراہیمؑ نے انھیں ہاتھ پاؤں باندھ کر لٹا دیا اور چھری ان کے گلے پر رکھدی مگر مشیت الٰہی کو حضرت اسماعیل کو ذبح کرانا مقصود نہیں تھا صرف حضرت ابراہیم کا امتحان مقصود تھا کے وہ کم سن بیٹے کی محبت کو خدا کی محبت اور خدا کے حکم پر قربان کر سکتے ہیں یا نہیں یہ امتحان پورا ہو چکا تھا جبریلؑ ایک دنبہ لے کر حاضر ہوئے جسے حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے نام پر قربان کیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس خواب کو امتِ مسلمہ کے حق میں سالانہ قربانی کی شکل میں واجب قرار دے کر یادگار بنا دیا مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

"یہی وہ قربانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی
کہ بطور یادگار ہمیشہ کے لئے ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج
بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیائے اسلام میں یہ شعار اسی

طرح منایا جاتا ہے۔'' (قصص القرآن ج ا ص ۲۳۶)

قرآن کریم کی سورۂ الصافات میں اس پورے واقعہ کو سیاق وسباق کے ساتھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ ○ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِينَ ○ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِينِ ○ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِينُ ○ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِينَ ○ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيمَ ○ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ○ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (سورۂ الصافات آیت ۱۰۰، ۱۱۱ پ ۲۳)

''اے پروردگار مجھے ایک نکوکار لڑکا عطا فرما پس بشارت دی ہم نے ان کو بردبار لڑکے کی جب وہ اس سن کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے، ابراہیمؑ نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تو دیکھ کیا سمجھتا ہے کہا اے میرے باپ جس بات کا تجھے حکم دیا گیا ہے وہ کر گذر اگر اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا پس جب ان دونوں نے رضاء تسلیم کو اختیار کرلیا اور پیشانی کے بل اس کو پچھاڑ دیا ہم نے اس کو پکارا اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کر دکھایا بے شک ہم اسی طرح نکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے اور بدلہ دیا ہم نے اس کو

بڑے ذبح کے ساتھ اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اس کے متعلق یہ
باقی چھوڑا کہ ابراہیمؑ پر سلام ہو اس طرح ہم نکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے
ہیں بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے۔"

یہی وہ عظیم عمل تھا جس سے دنیا میں عظیم مقصد کی خاطر اپنی عزیز ترین شے عظیم ہستی کے حضور بغیر کسی صلہ وستائش کی تمنا کے پیش کردینے کو قربانی کے نام سے منسوب کیا جانے لگا چونکہ یہاں قربانی اللہ کے حضور پیش کرنی تھی اس لئے اس عمل کے ساتھ عظمت وتقدس کا تصور بھی وابستہ ہوگیا اور اسلامی عقیدے کے مطابق ہر سال صاحبِ نصاب (مالدار) آدمی پر قربانی کرنا واجب قرار دیدیا گیا اس لئے یہ ایک مذہبی شعار بن گیا تقدس کے تصور میں اس کا بھی دخل ہے اسی اسلامی شعار کی وجہ سے مطلق جانور ذبح کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا اور شرعی اعتبار سے قربانی کے جانور کے لئے کچھ مخصوص قیود وشروط عائد کردی گئیں جن کے نہ پائے جانے کی وجہ سے قربانی غیر صحیح قرار پاتی ہے یہ تمام تصورات قربانی کے ایک لفظ میں سموئے ہوئے ہیں اور سیاق وسباق سے اس لفظ کا مفہوم متعین ہوتا ہے شعرا نے اس لفظ کی معنیاتی پرتوں کے اعتبار سے اس وخوب خوب استعمال کیا ہے اور مختلف مضامین ومعانی کے لئے اس تلمیح کو استعمال کیا ہے اور قربانی کے تصور سے فائدہ اُٹھایا ہے حضرت اسماعیلؑ سے متعلق تلمیحات میں یہ تلمیح سب سے زیادہ مستعمل ہے اور سب سے زیادہ تنوع کے ساتھ مستعمل ہے آئندہ آنے والے اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا۔

دل کو رکھدوں اِس دم شمشیر پر گرڈھب بنے
تا یہ قربانی صراط عشق پر مرکب بنے (ذوقؔ)

آتی ہے عید قرباں خنجر کو لال کرتے
دنبہ کے بدلے فربہ عاشق حلال کرئے (آتشؔ)

جائے قرباں ہے یہی قرباں کس کس ناز سے
یار نے قرباں کیا مانند قربانی مجھے (ظفر)

عید قرباں ہے ہزاروں کے گلے کٹتے ہیں
تو بھی آزاد کراب اپنے گرفتاروں کو (آتش)

صدقے میں تیرے کب تئیں تڑپا کروں عبث
ہے روز عید آج تو قربان کر مجھے (میر درد)

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروز عید قربان
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا مصحفی

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا (انشاء)

کیا خوشی ہم کو کہ اپنی ہے یہ حیرانی کی طرح
دیکھتے ہیں عید عالم چشمِ قربانی کی طرح (سودا)

عید قرباں جو قریب آئی تو کچھ دل میں سمجھ
پاؤں پر آکے مرے حاجب زنداں لوٹا (آتش)

ذبح ہی کرتے گلے لگنے جو دیتی تھی نہ شرم
عید قرباں تھی سمجھتے آپ قربانی مجھے (آتش)

تادم مرگ رہا منتظر قاتل میں
شاہد حال مرا دیدۂ قربانی ہے (آتش)

تجھ نین کی خنجراں پر کر نظر
دیدہ بازاں چشم قربانی ہوتے (ولی دکنی)

تیرے سر باز کو وہ دن نہ ہو کم عید قرباں سے
کرے جس روز تو قرباں اُسے مانند قربانی (ظفر)

دشنۂ قصاب سے ہے تیز ہر موئے مژہ
روز مرہ تم کو شغل عید قرباں چاہیے (آتش)

زبس تیغ نگاہِ شوخ سرکش کی ہے خوں ریزی
نگاہ چشم قربانی نمط حیراں ہوئے عاشق (ولی دکنی)